مدیر

سید حسن عباس

(قند مکر

حمید عظیم آبادی شاگرد شاد عظیم آبادی

غزل

تصدق ان بے نیازیوں کے کسی سے مجھ کو گلا نہیں ہے
مجھے ستا کر ہے خوش زمانہ کہ جیسے میرا خدا نہیں ہے

ہماری ہمت رہے سلامت، لہو کے قطرے بھی گل بنیں گے
یہ مانا ہم نے کہ اب موافق چمن کی اپنے ہوا نہیں ہے

نہ ہوتی تیغ ستم تو کیوں کر، لہو کے قطرے عروج پاتے
رہیں سلامت مری وفائیں، جفا کا مجھ کو گلا نہیں ہے

سکونِ خاطر کی کیوں تمنا، بہار عشرت کی آرزو کیوں؟
چمن کی دنیا بدل گئی ہے، صبا بھی اب وہ صبا نہیں ہے

خدا ہی جانے کرم نوازی یہ کس کی چشم عتاب کی تھی
ازل سے اب تک جو ناوک غم ہمارے دل سے جدا نہیں ہے

جھکے ہیں سجدے کو مہر و اختر، رہے گا تا حشر نام روشن
تری محبت میں مٹ گیا جو اُسے کبھی بھی فنا نہیں ہے

ہمارے دل کی حمید دنیا کچھ ایسی اجڑی نہ بس سکی پھر
گھٹائیں چھائی ہیں غم کی ایسی، خوشی میں بھی اب مزا نہیں ہے

مشورت ادراک و ہشیاری دہد   عقلہا را عقلہا یاری دہد (مولانا روم)

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے   عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے (اقبال)

اِدراک گوپال پور

۳

مجلس مشاورت

ڈاکٹر مختار الدین احمد — ڈاکٹر عارف نوشاہی

پروفیسر نادم بلخی — ڈاکٹر ظفر کمالی

ڈاکٹر ارشاد حسن معصومی — ڈاکٹر ولی احمد ولی

معاونین

محمود الحسن — فہیم جوگاپوری

امانت حسین — ارشاد احمد

فاروق سیوانی — چمن شرما شرر سیوانی

مدیر

سید حسن عباس

ترسیل زر کا پتا

ڈاکٹر نذر عباس

گوپال پور، باقر گنج، سیوان

بہار - ۸۴۱۲۸۶ (ہند)

زر سالانہ	۱۰۰ روپے
لائبریریوں سے	۲۰۰ روپے
اس شمارے کی قیمت	۵۰ روپے
بیرون ممالک فی شمارہ	۵ ڈالر
سالانہ	۱۲ ڈالر

مقالہ نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی سیوان کی عدالت میں ممکن ہے۔

زیر اہتمام: مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور۔ باقر گنج، سیوان۔ بہار (ہند)

کمپوزنگ: کمپیوز تکنیکی، کیتان مارکیٹ کے سامنے، بر لا مندر روڈ، پٹنہ۔۶

پرنٹر، پبلشر، اڈیٹر سید حسن عباس نے نیشنل پرنٹنگ ورکس، شاہ گنج، پٹنہ۔۶ سے چھپوا کر دفتر ادراک گوپال پور۔ باقر گنج، سیوان سے شائع کیا۔

فہرست

پیش نامہ

ادراک کا تیسرا شمارہ توقع کے برخلاف بہت تاخیر سے پیش کیا جا رہا ہے لیکن اس مختصر سے وقت میں ادراک نے اہلِ علم کے درمیان اپنی جو منفرد شناخت قائم کی ہے اس سے ہماری کاوشوں کی صحیح سمت کے تعین میں ضرور مدد ملتی ہے اور یہی بات ہمارے لیے اطمینان کا باعث ہے۔ ادراک کی علمی اور تحقیقی حیثیت برقرار رکھنے میں بزرگانِ علم وادب نے جس طرح ہماری دستگیری فرمائی ہے اس سے یہ حقیقت اور بھی پختہ ہوتی ہے کہ بڑے لوگوں میں خلوص اور ہمدردی کی کمی نہیں ہے بلکہ ان سے تعاون لینے والا ہونا چاہئے۔ جن بزرگانِ علم وادب کی تحریریں ہم ادراک میں پیش کر رہے ہیں ان کے علمی ادبی کارناموں کے آگے ہمارا سر جذبۂ احترام سے جھکتا ہے۔ ادراک میں ان حضرات کے رشحاتِ قلم کی اشاعت ہی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ادراک اپنے اعلا مقاصد کے حصول کی راہ میں آگے بڑھ رہا ہے۔ ادراک کے محتویات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ صحت مند ادب کی پیش کش میں ہمہ تن مصروف ہے لیکن ہمیں اس وقت کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگتا ہے جب ہم سے جدید سے جدید تر موضوعات ''اٹھانے'' کی فرمائش کی جاتی ہے حالانکہ اردو کے بے شمار رسائل و جرائد ایسے موضوعات کی پیش کش میں سبقت لے جانے میں مصروف ہیں جبکہ کلاسیکی ادب سے خاص کر عربی اور فارسی ادبیات، تاریخ، خطاطی، علمی مراکز وغیرہ موضوعات کو جدید ادب کے علمبردار رسالوں میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے یہ خیال ہمارا نہیں بلکہ ان موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے والوں کا ہے۔ ہماری مشکل تو یہ ہے کہ ایسے رسالوں کے قارئین کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں جن میں کچھ علمی اور تحقیقی مواد پیش کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں نہ تو سنجیدہ موضوعات پر مواد کی کمی ہے اور نہ لکھنے والوں کی-- کمی ہے تو پڑھنے والوں کی۔ مفت میں پڑھنے والے تو کچھ بھی پڑھ لیتے ہیں-- یعنی مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔ مزا تو جب ہے کہ خالص علمی اور تحقیقی مواد پیش کرنے والے جرائد کی دل کھولنے کے ساتھ جیب بھی کھول کر پذیرائی کی جائے۔ یہ معاملہ صرف ادراک کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اور بھی رسائل مالی وسائل کی کمی سے روبرو ہیں۔ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے بلکہ عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک مسئلہ عربی فارسی کے مراکز کا بھی ہے۔ مدارس نے ہمارے ملک کے تعلیمی اور علمی ماحول کے قیام میں بہت اچھا کردار ادا کیا ہے۔ ان کا ماضی جتنا شاندار اور تابناک رہا ہے، حال اور مستقبل اتنا ہی غیر مطمئن نظر آتا ہے۔ مدارس پر سب کی نظریں بھی جمی ہوئی ہیں۔ ماضی میں ان مدارس سے اہلِ علم اور اہلِ قلم نکلتے تھے۔ اب زیادہ تر شعلہ بیان

خطیبوں کا طرز اپنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ماضی کے علما نے تصنیف و تالیف کے میدان میں جتنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں آج اس کا عشر عشیر بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ ان خدمات کا بڑا حصہ عربی اور فارسی زبانوں میں ہے۔ جن سے ہمارے کتاب خانے بھرے ہوئے ہیں۔ اس کا جواب شاید یہ ملے کہ اب ان زبانوں نے اپنی رونقیں کھودی ہیں۔ کسی حد تک یہ صحیح بھی ہے۔ زبانوں نے اپنی رونقیں نہیں کھوئی ہیں بلکہ ہم نے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ ان زبانوں میں کون سا علم ہے جو محفوظ نہیں ہے لیکن ہم ہوا کے بہاو کے ساتھ بہہ رہے ہیں۔ جدید علوم وفنون سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ اگر قدیم سے بھی لگاو رکھا جائے تو کیا برا ہے؟ مدارس میں بھی جامعات کی طرح آخری ڈگری کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنا شرط ہونا چاہیے۔ ایسا کہیں کہیں ہے بھی۔ ترجموں کی طرف طلبا کو متوجہ کرنا بھی ضروری ہے۔ تحقیق کا ذوق پیدا کرنا لازمی ہے۔ صحتِ زبان -- تلفظ اور املا دونوں ہی کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ان سب کے لیے مطالعہ اور راہنمائی شرط اول ہے جب ہی اچھا قلم کار بنا جا سکتا ہے۔ عربی اور فارسی کے مختلف موضوعات پر مقالہ نویسی کا انعقاد اور انعامات کے ذریعے طلبا کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ ان کاموں میں مدارس کے ساتھ خدا بخش لائبریری اور رام پور رضا لائبریری جیسے عربی اور فارسی کے اہم ادارے تعاون کر سکتے ہیں۔ جس کی اس وقت ضرورت ہے۔ ان لائبریریوں میں سال بھر مختلف موضوعات پر سیمنار اور سمپوزیم ہوتے ہیں۔ ماہرین کو دعوت دے کر بلایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ اگر مدارس اور جامعات کے اعلا درجوں کے طلبا کو بھی اظہار خیال کی دعوت دی جائے تو طالب علموں کا ذوق تحقیق مہمیز ہوگا۔ نوجوانوں میں عربی اور فارسی زبان وادب کے مطالعے کا شوق پیدا کرنا بھی وقت کی ایک ضرورت ہے جس کے بارے میں سب کو غور کرنا چاہیے۔

ادراک کے اس شمارے میں بھی سابق کی طرح کئی علمی اور تحقیقی مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ اس بار اردو اور فارسی ادب سے تعلق رکھنے والے مضامین شامل ہیں۔ 'مکتوبات' کے عنوان سے مشاہیر اہل قلم کے خطوط کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ اس بار پروفیسر نظر صدیقی کے خطوط ڈاکٹر مختار الدین احمد اور پروفیسر گیان چند کے مکتوبات پروفیسر سید محمد حسنین کے نام پیش کیے جارہے ہیں۔ احمد جمال پاشا مرحوم کا نام ہمارے ادب کا ایک نہایت اہم اور قیمتی نام ہے۔ ان کی بے شمار تحریریں اب بھی زیور طبع سے آراستہ ہونے کی منتظر ہیں۔ پہلے شمارے میں ان کا ایک تنقیدی مضمون شائع کیا گیا تھا۔ اس شمارے میں 'انشائیہ کی پہچان' کے عنوان سے ان کا ایک اور غیر مطبوعہ مقالہ ڈاکٹر ظفر کمالی کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ دکنی ادب سے تعلق رکھنے والے مقالات بھی اس شمارے میں آپ پڑھیں گے۔ 'مخطوطہ اور کتاب شناسی' کے باب میں آپ کو مفید مقالے پڑھنے کو ملیں گے۔ سنہ دو ہزار میں وفات پانے والے مشاہیر اردو کا تذکرہ بھی آپ پڑھیں گے جسے ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب نے محنت سے ترتیب دیا ہے۔ ''خصوصی مطالعہ'' کے تحت حکیم سید ظل الرحمان کی شخصیت اور کارناموں سے واقفیت فراہم کرانے کی کوشش کی گئی ہے یہ لکھنا ضروری

نہیں ہے کہ حکیم صاحب کی شخصیت، تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ہم حکیم صاحب کے بارے میں اس سے زیادہ مواد پیش کرنا چاہتے تھے مگر اپنی تنگ دامانی دیکھ کر کفِ افسوس مَل کر رہ گئے۔

'چھیڑ خوباں سے' اور 'ہم عصر قلم کار' کے مستقل کالموں میں آپ کو قابل مطالعہ مواد ملے گا۔ یوسف ناظم صاحب اور ڈاکٹر ظفر کمالی نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں جو باتیں کہی ہیں ان سے آپ محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ 'سرحد پار' کے عنوان سے 'چین میں اردو' کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں منظومات وغزلیات، افسانے، کتابوں پر تبصرے وغیرہ حسب سابق ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ یہ شمارہ بھی متنوع اور گوناگوں موضوعات کا حامل ہو۔ اس شمارے میں پیش کردہ مواد کے بارے میں جب تک آپ کے نظریات وخیالات سے آگاہی نہیں ہوگی اس وقت تک ہم مغالطے ہی میں رہیں گے اور اپنے جی میں خوش ہوتے رہیں گے کہ ہم نے ایک اور تیر مارا۔ جبکہ ہمارا مطمح نظر یہ نہیں ہے بلکہ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہماری خامیاں اور کوتاہیاں گنوائی جائیں تاکہ انھیں دور کیا جاسکے۔

سن دو ہزار دو میں اردو کے جن شعرا وادبا نے اس خاکدان ہست وبود کو الوداع کہا ان میں ہماری بستی کی دو اہم شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ ایک مولانا سید سعید اختر رضوی تپش گوپال پوری اور دوسری شخصیت مولانا سید علی اختر رضوی شعور گوپال پوری کی ہے۔ علم وادب اور مذہب کے میدانوں میں دونوں کی عظیم خدمات سنہرے حرفوں میں لکھنے کے لائق ہیں۔ ادارہ ادراک ابھی غم کے اس بوجھ سے نکلا بھی نہیں تھا کہ جناب کوثر سیوانی نے ۷/ جنوری ۲۰۰۳ء کو اور پھر جناب سید عباس علی وفا ملک پوری نے بھی ۱/ جون ۲۰۰۳ء کو داغ مفارقت دے دیا۔ ان سانحات پر ادارہ ادراک اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور مرحومین کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی تلقین کے ساتھ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ انشا اللہ آئندہ شماروں میں ان شخصیتوں پر ادراک میں پُر مغز مقالے پیش کیے جائیں گے۔

سید حسن عباس

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

حمد

یہ کائنات یہ رنگِ بہار تیرا ہے
فلک کا روپ زمیں کا نکھار تیرا ہے

صبا میں رقص گلوں میں خمار تیرا ہے
چمن چمن شجر نغمہ بار تیرا ہے

سرودِ ہستیِ دوراں میں تیری شیرینی
ندی کا گیت رمِ جوئبار تیرا ہے

مقامِ شوق و مسافت کا مدعا تو ہے
یہ راہ تیری ہے یہ رہ گزار تیرا ہے

مری غزل، مرا نغمہ، مری نوا تو ہے
مرے وجود کا یہ لالہ زار تیرا ہے

مرے خدا، دلِ عاشقؔ کو آئینہ کر دے
یہ فکر، یہ سخنِ شعلہ بار تیرا ہے

مختار احمد عاصی

بارگاہِ خالقِ کائنات میں

دکھیوں کا ہے درد مٹانے والا تو
روتے بلکتوں کو ہے ہنسانے والا تو

پل پل پگ پگ راہ بھٹکنے والا میں — گمراہوں کو راہ دکھانے والا تو
جس کو ذلیل و خوار کریں دنیا کے لوگ — اُن کی ہے توقیر بڑھانے والا تو
بستی بستی فتنہ اٹھانے والا میں — دنیا دنیا پیار جگانے والا تو
کھیتوں میں نفرت کی فصل اُگاؤں میں — دھرتی دھرتی پھول اُگانے والا تو
بیکس اور مزدوروں کا حق ماروں میں — مظلوموں کی لاج بچانے والا تو
دھنوانوں کا ظلم سہیں مفلس، نادار — مفلس کو دھنوان بنانے والا تو
مفلس کو جب چاہے مالا مال کرے — رزق گھٹانے اور بڑھانے والا تو
کرتے ہیں پامال عبادت گاہوں کو — ظالم کو ہے خون رلانے والا تو
میں بگڑی تقدیر کا شکوہ کس سے کروں — ہے بگڑی تقدیر بنانے والا تو

میں عاصی ناپاک نجس بندہ تیرا
حشر میں میری لاج بچانے والا تو

Urdu Bhawan, Islampur, Muzaffarpur

علی احمد منظر مظفر پوری

نعت

ذرۂ خاکی ہیں طیبہ میں بکھر کر دیکھتے
دیدہ ور ہوتے تو قطرے میں سمندر دیکھتے

ہم بھی اپنی ذات کا اک ایسا منظر دیکھتے
خود ہی اپنے نفس کا کچلا ہوا سر دیکھتے

خواب کو اپنے حقیقت میں بدل کر دیکھتے
"ہم دیار پاک کا اے کاش منظر دیکھتے"

ٹوٹتا رہتا ہے جس کے دم سے باطل آئینہ
خانۂ کعبہ میں وہ جنت کا پتھر دیکھتے

وسعتِ تابِ نظر اپنی بہت محدود ہے
ورنہ ہم نورِ نبی امت کے اندر دیکھتے

کیا ضرورت تھی سمجھتے راہ کے بھی پیچ و خم
ہم مسافر تھے نشانِ پائے رہبر دیکھتے

گر زمیں طیبہ کی منظر ہم کو کر لیتی قبول
ریت کے شیشوں میں ہم اپنا مقدر دیکھتے

اختر نقوی چھپروی

قصیدہ

"بغیر الف" در مدحِ پنجتنِ پاکؑ

دیکھو نبیؐ سے سورۂ کوثر کی گفتگو
کثرت کے تذکرے میں ہے کس گھر کی گفتگو

بحرین، موتی، مونگے کی تفسیر کہتی ہے
یوں بھی ہوئی ہے بیتِ پیمبرؐ کی گفتگو

وہ نجم کے نزول کی سوگند دیکھیے
سوگندِ حق میں ہے درِ حیدرؑ کی گفتگو

ہے زیب و زین بزم زمیں ذکر بس وہی
رہتی ہے بزم عرش میں جس گھر کی گفتگو

روئے نبیؐ کے عکس کو نورِ سحر کہیں
ذرّے کریں جو مہرِ منور کی گفتگو

بے مثل نقش پر تو مصور کو ہے غرور
مشکل نہ کیوں ہو نور کے پیکر کی گفتگو

خلوت میں گفتگو جو ہوئی حسن و عشق میں
وہ ہو گئی محمدؐ و حیدرؑ کی گفتگو

ہے پنجتنؑ کے حسن پہ قدرت فریفتہ
دلکش ہے میری نور کے پیکر کی گفتگو

عظمت کہے کہ مرکزِ عصمت ہیں سیّدہ
کی جن کے بعد حق نے پیمبرؐ کی گفتگو

تعظیمِ سیّدہؑ کو کھڑے ہوتے تھے رسولؐ
پیوستہ یوں عمل میں تھی منبر کی گفتگو

ہر [illegible] جھکے جبین عقیدت جھکی رہے
بنتِ رسولؐ ہو جو ترے در کی گفتگو

لب پر رہی نبیؐ کے ہمیشہ بحکم رب
شبیرؑ کی کبھی، کبھی شبرؑ کی گفتگو

جب ہوں گے زیبِ دوشِ نبوت کے تذکرے
ہوگی نبیؐ کی، زلفِ پیمبرؐ کی گفتگو

خُلقِ حسنؑ میں خُلقِ محمدؐ ہے جلوہ گر
بے حد حسیں ہے حلم کے پیکر کی گفتگو

معبود جس پہ فخر کرے وہ حسینؑ ہے
رونق ہے دینِ حق کی بہتر کی گفتگو

پڑھیے درود ہوتی ہے عصمت کے فیض سے
حُر جیسے خوش نصیب غضنفر کی گفتگو

ہر صبحِ فتح کو بھی ہزیمت کی شب کہو
بے سود ہی ہے بختِ سکندر کی گفتگو

دوزخ میں شب کو، صبح کو جنت میں ہیں قدم — یچے یہ شوق حُر کے مقدر کی گفتگو
توفیقِ خیر سے ہوئی روشن جو چشمِ دل — ظلمت سے نکلے حُر، نہ سنی شر کی گفتگو

لو دور تیرگی شب گمرہی ہوئی
ہوگی نمود صبح مقدر کی گفتگو

قسمت پہ رشک کرتے ہوئے سن رہے ہیں حُر — شفقت بھری کرم کے سمندر کی گفتگو
سن سن کے مضطرب ہے دلِ جُرمِ منفعل — ہو کیے لبوں سے سبطِ پیمبرؐ کی گفتگو
فیضِ نظر سے سبطِ پیمبرؐ کے حشر تک — ہوتی رہے گی حُر کے مقدر کی گفتگو
پڑھیے درود پھر کہ رہے گی بہ فیضِ عشق — ہر بزمِ حق پرست میں بوذر کی گفتگو
جو سطوت و غرور سے مرعوب ہی نہ ہو — کیونکر کرے وہ منتِ قیصر کی گفتگو
عشرت کدے قصورِ حکومت کے ہل گئے — کتنی شدید ضرب تھی بوذر کی گفتگو
حق گوئی بہرِ عشقِ ستم منتخب ہوئی — ٹھہری جو جرم طرزِ پیمبرؐ کی گفتگو
وہ جبر و قہر و صولت و دولت سے کیوں دبے — ہو نقش جس کے قلب پہ حیدرؑ کی گفتگو

ہوتی ہے زیبِ بزم جو حیدرؑ کی گفتگو
سنتے ہیں سب بہ شوق سخنور کی گفتگو

ممدوحِ حق کی مدح مگر کس طرح سے ہو — قطرہ رہے تو کیسے سمندر کی گفتگو
فکرِ جمیل جذبۂ دل سے گلے ملے — تب کچھ ہو حسن و عشق کے پیکر کی گفتگو
صلبِ علیؑ کو کثرتِ نسلِ نبیؐ ملی — ہے حق پسند، معنئ کوثر کی گفتگو
یہ ذکر وہ ہے نفس کی صیقل کہیں جسے — ہے قوتِ روحِ نفسِ پیمبرؐ کی گفتگو
موجوں کی جست و خیز میں کوثر پہ ہر گھڑی — ہوتی ہے زور شور سے حیدرؑ کی گفتگو
کعبہ کرے یہ فخر کہ قسمت چمک گئی — سن گوشِ دل صدف سے بھی گوہر کی گفتگو
دوشِ نبیؐ پہ چڑھ کے علیؑ بت شکن ہوئے — ہوتی ہے یوں بھی دوشِ پیمبرؐ کی گفتگو

کہتی ہے ظلمتِ شبِ ہجرت کی گہری نیند
ہو نفس مطمئن ترے جوہر کی گفتگو

بستر پہ سو رہے ہیں محمدؐ یہ سمجھے سب
زندہ ہے یوں رسولؐ کے بستر کی گفتگو

کوئی کبھی کسی بھی تخی پر کرے نہ فخر
مدحِ علیؑ میں سن لے جو قنبر کی گفتگو

میثم سے بھی فضیلتِ حیدرؑ سنے کوئی
ڈوبی ہے معرفت میں قلندر کی گفتگو

سب کو ہے علم کون درِ شہرِ علم ہے
کرتے ہیں کچھ ہی لوگ مگر در کی گفتگو

کرتے ہیں کم نصیب تو مدحِ خذف بہت
کرتے نہیں خزینۂ گوہر کی گفتگو

گنجینۂ علومِ نبیؐ ہے دلِ علیؑ
ہے سیلِ فیض، فیض کے مظہر کی گفتگو

سلکِ گہر ہے نظم تکلّم کہیں جسے
جھرنے کی رَو ہے علم کے مصدر کی گفتگو

تفسیر کیسی حمد کے سورہ کی ہوگی وہ
پوری نہ کر سکی جسے شب بھر کی گفتگو

پھیلی تو پھیلتی گئی وسعت میں علم کی
سمٹی تو 'ب' کے نقطہ میں حیدرؑ کی گفتگو

ممدوح کے ہے ذکر میں یہ فکر شوق کو
لب پر ہو صفدری کے بھی جوہر کی گفتگو

جب ہوگی زورِ حیدرِؑ صفدرؑ کی گفتگو
تب ہوگی بزم میں درِ خیبر کی گفتگو

بدر و حنین و خیبر و خندق سے پوچھیے
ہے لب پہ ہر ہی جنگ کے حیدرؑ کی گفتگو

صیدِ زبوں سے تندیٔ لہجہ کو پوچھیے
ہوتی تھی جس میں تیغِ دو پیکر کی گفتگو

کٹتے رہے غرورِ تہوّر میں سب حریف
سن کر علیؑ کی تیغ کے جوہر کی گفتگو

ہر روحِ کفر بزمِ عدم میں لرزتی ہے
ہوتی ہے شیرِ حق کے جو تیور کی گفتگو

ہے دستِ حق، نصیرِ پیمبرؐ، ستونِ دیں
ہے دیں کی روح، نفسِ پیمبرؐ کی گفتگو

ہے فکر مدح ذوق کی تسکین کے لئے
نقویؔ نہ مُزدِ مدح بنے زر کی گفتگو

نظیر صدیقی کے خطوط

بنام

مختار الدین احمد

انتساب

محب مکرّم جناب مشفق خواجہ صاحب

کے نام

تمہید:

نظیر صدیقی کا نام میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۵۲ء میں سنا۔ ان کے دوست اور جامعۂ ڈھاکا میں اُن کے حلیف و معاصر ارشد کاکوی یونیورسٹی کی تعطیلات میں ڈھاکے سے پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی سے ان کی خط کتابت تھی، ملاقات نہ تھی۔ مجھ سے خط کتابت بھی تھی اور میں نے جب وہ کم عمر تھے انھیں دیکھا بھی تھا۔ وہ میرے محترم پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی کے بیٹے تھے جن سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے۔ ارشد کاکوی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور مجھ سے ملنے پٹنہ سے علی گڑھ آئے۔ کئی دن ہمارے ساتھ ۵- حالی روڈ پر رہے۔ ہم نے انھیں علی گڑھ کے لوگوں سے ملایا اور انھیں آگرہ اور دہلی کی سیر کرائی۔ خلیل صاحب نے دلچسپ سفر نامہ لکھا جو یونیورسٹی گزٹ میں شائع ہوا۔ علی گڑھ، آگرہ اور دہلی میں ارشد کاکوی نے جہاں ڈھاکا یونیورسٹی، حکیم حبیب الرحمٰن، عندلیب شادانی، شعبۂ فارسی و اردو کے بعض اساتذہ، اردو کے کچھ ممتاز طلبا اور وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا، وہاں نظیر صدیقی کا بھی ذکر کیا اور خاصی تفصیل سے۔ دونوں میں بعض باتیں مشترک تھیں۔ دونوں بہار سے مشرقی پاکستان پہنچے تھے، دونوں اردو میں ام-اے کر رہے تھے، دونوں عندلیب شادانی کے چہیتے شاگرد تھے اور دونوں کو شاعری اور تنقید نگاری سے دلچسپی تھی اس لیے نظیر صدیقی کا ذکر خاصا رہا۔ علی گڑھ میں بھی، ٹرین میں بھی اور آگرہ اور دہلی میں بھی۔ مجھے مومن اور شاد پر رسالہ ''نگار'' میں ان کے لکھے ہوئے دو تین مضامین یاد آئے۔ یہ بھی خیال آیا کہ مضامین مجھے پسند آئے تھے۔

بعد کو نظیر صدیقی کے متعدد مضامین اور کچھ اشعار مختلف رسالوں میں نظر سے گزرے، لیکن نہ ان سے خط کتابت شروع ہوئی نہ ان سے کہیں ملاقات کی کوئی سبیل نکلی۔ ان سے پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۸۰ء کے اواخر میں دہلی میں ہوئی جہاں وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے بین الاقوامی غالب سے می نار میں شرکت کے لیے اسلام آباد سے آئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقاتیں مختصر رہیں۔ سے می نار کی مصروفیات حائل رہیں۔ ہندستان کے مختلف شہروں سے مندوبین آئے ہوئے تھے جن میں مجروح سلطان پوری، راجندر سنگھ بیدی، ظ- انصاری، شمس الرحمٰن فاروقی، نیر مسعود اور عابد پیشاوری کے نام یاد آتے ہیں۔ اس سال پاکستان سے مشہور نقاد ممتاز حسین اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر بشیر حسین بھی آئے ہوئے تھے۔ شائد ایران اور افغانستان کے مندوبین بھی تھے۔ غرض خاصی چہل پہل تھی۔ نظیر صدیقی کا ہندستان کے کسی سے می نار میں شرکت کا پہلا موقع تھا۔ وہ ہندستانی ادیبوں سے والہانہ انداز میں ملتے رہے۔ سے می نار میں بھی اور سے می نار سے باہر بھی۔ دہلی شہر کے بھی انھوں نے خوب چکر لگائے۔ مختلف ادیبوں نے انھیں اپنے یہاں مدعو کیا اور وہ وہاں جانے کا وقت نکالتے رہے۔ مالک رام، قمر رئیس، خواجہ حسن ثانی نظامی اور ظہیر احمد صدیقی کے یہاں وہ مدعو ہوئے۔

ایک شام وہ وقت نکال کر خوشونت سنگھ سے بھی مل آئے۔ گوپی چند نارنگ سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے۔ ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کے وہ معترف نظر آئے۔ تقریر و تحریر پر جو انھیں زبردست قدرت حاصل ہے اس کا وہ مجھ سے خاص طور پر ذکر کرتے رہے۔

نظیر صدیقی سے دوسری ملاقات چار سال کے بعد ۱۹۸۴ء میں ہوئی۔ میں مجمع الملکی لبحوث الحضارۃ الاسلامیہ عمان ۔ اردن کے اجلاس سے شرکت کے بعد براہ کراچی، دہلی جا رہا تھا۔ راستے میں چند دنوں کے لیے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ واقع اسلام آباد میں قیام کر کے اس کے کتب خانے میں عربی کی ان نادر کتابوں اور ان کے مخطوطات کے عکس کا مطالعہ کرتا تھا جو الاستاذ عبدالعزیز المیمنی اپنے عہد نظامت میں ترکی اور بلاد اسلامیہ سے لائبریری کے لیے لائے تھے۔ نظیر صدیقی سے میں مصروفیات کی بنا پر ۱۷/مئی ۱۹۸۴ء سے پہلے نہ مل سکا۔ تاریخ مجھے یاد نہ تھی۔ یہ بات حافظے میں محفوظ تھی کہ اسی تاریخ کو ان کی نشست کے کمرے میں ان کی جمع کردہ کتابیں دیکھ رہا تھا۔ ان میں مولانا غلام رسول مہر کے خطوط (مرتبہ: امیس شاہ جیلانی، لاہور ۱۹۸۳ء) پر نگاہ پڑی۔ اسے شلف سے نکال لایا اور شوق سے ورق گردانی کرنے لگا۔ نظیر صدیقی نے میری دلچسپی دیکھتے ہوئے یہ کتاب تحفۃً مجھے دے دی۔ ان سطور کے لکھتے وقت کتب خانے سے کتاب نکالی تو سرورق پر جلی قلم سے ان کی تحریر پر نظر پڑی: ''برادر مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد کی نذر، نظیر صدیقی ۱۷/مئی ۱۹۸۴ء''۔

نظیر صدیقی سے ان کے گھر پر ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ انھوں نے اپنی بیگم اور بیٹی سے ملایا۔ یہ غالباً ان کی بڑی بیٹی رخشندہ تھیں جو بعد کو ڈاکٹر رخشندہ پروین کہلائیں۔ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کے ساتھ گزار کر دوسری ملاقات کا وعدہ کر کے اٹھ آیا۔ دوسرے دن بازدید کے لئے وہ ڈاکٹر وحید قریشی کے یہاں ملنے آئے جن کے یہاں میں مقیم تھا۔ اس سفر میں پھر ان سے ملنا ممکن نہ ہو سکا۔

ان سے تیسری ملاقات فروری ۱۹۸۶ء کے تیسرے ہفتے میں علی گڑھ میں ہوئی۔ ایک دن اچانک شعبۂ اردو سے ٹیلی فون آیا کہ پروفیسر نظیر صدیقی اور ڈاکٹر صدیق شبلی صدر شعبۂ اردو قائد اعظم اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، شعبے میں آئے ہوئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ حیرت ہوئی کہ میری اطلاع کے مطابق تو انھیں کتب خانہ خدا بخش کے سے می نار میں پٹنہ یا دہلی میں ہونا تھا۔ علی گڑھ آنے کے متعلق انھوں نے کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ بہر حال شعبۂ اردو پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ اور ان کے رفیق شعبہ اور رفیق سفر ڈاکٹر صدیق شبلی، فیکلٹی آف آرٹس کے لاؤنج میں ہیں جہاں پروفیسر عتیق احمد صدیقی صدر شعبہ نے ان دونوں مہمانوں کے اعزاز میں ایک جلسے کا انتظام کیا ہے، وہ طلبا اور اساتذہ کے ایک اجتماع کو خطاب کر رہے ہیں۔ حاضرین ان دونوں اساتذہ کے خطاب سے خوش ہوئے اور وہ دونوں علی گڑھ کی روایتی مہمان نوازی سے متاثر۔ نظیر صدیقی ویسے بھی علی گڑھ سے والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ جلسے کے اختتام پر شعبے کی لائبریری

میں چائے ہوئی جس میں ان سے اور ڈاکٹر صدیق شبلی سے کتب خانہ خدا بخش کے سے می نار کی تفصیلات معلوم ہوئیں مجھے سے می نار میں عدم شرکت کا افسوس ہوا۔ شریک ہوتا تو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، قدرت اللہ فاطمی، سراج منیر اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی سے ملاقات کی مسرت حاصل ہوتی۔ بہر حال ڈاکٹر غلام مصطفےٰ قاسمی، ڈاکٹر معزالدین اور ڈاکٹر یعقوب سے، جو نظیر صدیقی اور ڈاکٹر صدیق شبلی کے ساتھ علی گڑھ آ گئے تھے، ملاقات کا موقع مل گیا۔ لیکن یہ ملاقات بہت مختصر تھی۔ وائس چانسلر صاحب نے مہمانوں کو لنچ دیا پھر انھیں علی گڑھ کے بارے میں دو ایک فلمیں دکھائی گئیں۔ میں ڈاکٹر معزالدین اور پروفیسر نظیر صدیقی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لانا چاہتا تھا لیکن ان کے پاس وقت بہت کم تھا اور وہ سب حضرات اسی شام دہلی واپس چلے گئے۔

چوتھی ملاقات نظیر صدیقی سے ۹/ جولائی ۱۹۸۷ء کو اسلام آباد میں ہوئی۔ میں اور رشید حسن خاں مدیر نقوش محمد طفیل مرحوم (متوفی: ۵/ جولائی ۱۹۸۶ء) کی پہلی برسی پر اور رسالہ نقوش کے طفیل نمبر کی تقریب رونمائی میں شرکت کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے۔ ۶/ جولائی ۱۹۸۷ء کو ہلٹن ہوٹل میں صدر پاکستان کی صدارت میں تقریب شروع ہوئی۔ جس میں صدر جلسہ کے علاوہ اشفاق احمد، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، رشید حسن خاں اور راقم الحروف نے محمد طفیل مرحوم کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں پر تقریریں کیں یا مقالات پڑھے۔ یہ تقریریں اور تحریریں اور اس موقع کی تقریب کی تصویریں بعد کو نقوش ۱۳۶ (دسمبر ۱۹۸۷ء) میں شائع ہوئیں۔

۹/ جولائی کو ہم سب لوگ اسلام آباد پہنچے اور ۱۲ تک اسلام آباد ہوٹل میں مقیم رہے۔ میں جس دن وہاں پہنچا اسی دن نظیر صدیقی، محمود الرحمٰن پرویز کاکوی اور مظفر علی سید صاحبان سے ملاقات ہوئی۔ نظیر صدیقی کو ہم لوگوں کے اسلام آباد آنے کی اطلاع نہ تھی۔ میں ہوٹل سے ان کے مکان کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں اتفاق سے ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی جن سے پہلے کے تعلقات تھے، مل گئے۔ وہ نظیر صدیقی کے مکان کے قریب ہی رہتے تھے۔ انھوں نے نظیر صدیقی کے یہاں پہنچا دیا۔ وہ گھر پر موجود تھے۔ بہت خوش ہوئے۔ غیر متوقع ملاقات سے ویسے بھی خوشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان سے گھنٹوں بات چیت رہی۔ ڈھاکا، کراچی، اسلام آباد کی سرگزشت ان سے سنتا رہا۔ ان کے بیان میں کہیں کہیں تلخ نوائی نمایاں تھی۔ لیکن جن حالات سے وہ اس عرصے میں دوچار ہوئے تھے ان میں رہ کر قوی دل جگر رکھنے والا مضبوط ارادے کا آدمی بھی گفتگو میں حد اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ بعض معاملات میں خاصے حساس واقع ہوئے ہیں۔ باتوں باتوں میں انھوں نے اپنے ایک رفیق کار کا ذکر کیا جنھیں یونیورسٹی نے ان پر ترجیح دے کر پروفیسر اور صدر شعبہ بنا دیا تھا۔ میں نے کہا: آپ اچھے نقاد اور مستند ادیب ہیں، اگر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی آپ کے پاس ہوتی تو قرینہ غالب ہے کہ آپ ہی پروفیسر اور صدر شعبہ ہوتے۔ ایک آدھ منٹ خاموش رہے پھر بولے ارے یہ نمکین کا جو تو آپ نے چکھے ہی نہیں، یہ لیجیے۔ یہ کہہ کر وہ مسکرائے اور انھوں نے پلیٹ ہماری طرف بڑھا دی اور باتوں

کا رُخ کسی اور طرف پھیر دیا۔

ہوٹل پہنچا تو محمود الرحمٰن پرویز ہوٹل کے لاؤنج میں میرے منتظر تھے۔ یہ غالباً ان سے پہلی ملاقات تھی۔ ان
بچپن میں اگر انھیں دیکھا ہو تو یاد نہیں۔ کاکو۔ ضلع گیا، سادات اور صدیقی شیوخ کی مشہور بستی ہے جہاں متعدد ادیب
شاعر اور علوم و فنون کے ماہر پیدا ہوئے۔ قاضی عبدالودود (۱۸۹۶-۱۹۸۴ء) کا مسقط راس کاکو ہی ہے۔ اس خاندا
کے لوگوں میں چند حضرات نے خاصی شہرت حاصل کی۔ سید شاہ غفور الرحمٰن حمدؔ کاکوی (۱۸۶۳-۱۹۳۸ء)، سید شاہ ا
داناپوری (۱۸۷۳-۱۹۰۹ء)، وحید الہ آبادی (۱۸۲۹-۱۸۹۲ء) کے شاگرد تھے۔ ان کے تینوں بیٹے سید شاہ ولی الرحمٰ
ولیؔ کاکوی (۱۸۹۷-۱۹۶۳ء)، پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی (۱۹۰۴-۱۹۹۸ء) اور سید شاہ منظور الرحمٰن اح
کاکوی (۱۹۰۰-۱۹۹۲ء) شاعر تھے اور تینوں شادؔ عظیم آبادی (۱۸۴۶-۱۹۲۷ء) کے تلامذہ میں تھے۔ تینوں علمی داد
ذوق رکھتے تھے اور عطا کاکوی تو صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ رشید الرحمٰن ارشدؔ کاکوی (۱۹۲۸-۱۹۶۳ء) انھی کے ب
تھے۔ شاہ ولی الرحمٰن کے ایک بیٹے سے بھی میں واقف ہوں۔ ادبی ذوق رکھتے ہیں (۱)۔ محمود الرحمٰن جن کا ذکر ہو رہا ہے
شاہ غفور الرحمٰن حمدؔ کاکوی کے چھوٹے بیٹے شاہ منظور الرحمٰن کے صاحب زادے ہیں۔

ڈاکٹر شاہ محمود الرحمٰن پرویز کاکوی (متولد-۱۹۳۵ء) پاکستان کے ممتاز ادیبوں میں ہیں۔ شاعر بھی ہیں او
مصنف بھی۔ ان کی متعدد کتابیں مقتدرہ قومی زبان اور دوسرے اہم اداروں نے شائع کی ہیں۔ بچوں کے ادب پر تو
کرنے والے ہندستان، پاکستان دونوں ملکوں میں خال خال ہیں۔ محمود الرحمٰن صاحب نے اس موضوع کی طرف خاص
توجہ کی ہے۔ ان کی کتاب 'اردو میں بچوں کا ادب' کراچی سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔ وہ ایک ناول 'کونپل' کے مصنف
بھی ہیں اور ان کی کتاب 'آزادی کے مجاہد' دو جلدوں میں کراچی سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ طباعت و اشاعت سے ا
کی خاص دلچسپی ہے۔ 'اصطلاحات فنون طباعت و ترمیم' اسلام آباد سے ۱۹۸۶ء میں چھپی اور ان کا مقالۂ علمیہ 'جنگ
آزادی کے اردو شعرا' اسلام آباد سے ۱۹۸۶ء میں چھپا۔ اس پر انھیں سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ ا
سطور کے لکھتے وقت یہ کتاب میں نے کتب خانے سے نکلوا کر دیکھی۔ اس پر ان کی یہ تحریر ملی: "محترم ڈاکٹر مختار الدین
احمد کے لئے جن کی ذات سے میرے بچپن کے واقعات اب بھی ترو تازہ ہیں۔ محمود الرحمٰن ۱۱/۷/۸۷ء اسلام آباد"
اس سے یاد آیا کہ وہ ۱۱/ جولائی کو بھی ملنے آئے تھے لیکن میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی کہ میں اس دن مری میں تھا
اثنائے گفتگو میں جب انھیں معلوم ہوا کہ میں قاضی عبدالودود صاحب کے مکتوبات مرتب کر رہا ہوں اور ان کے چار پا
سو خطوط و رقعات جمع کر لیے ہیں تو انھوں نے کہا کہ میرے پاس بھی ان کے چند خطوط ہیں۔ دو تین دن کے بع

---

(۱) ان کا نام سید ریاض الرحمٰن ہے۔ جن کا حال ہی میں ۲۶/ جنوری ۲۰۰۳ء کو پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اپنے والد ولی کاکوی کے تنقید
مضامین کا ایک مجموعہ 'تنقید و ادب' ۱۹۸۹ء میں شائع کیا تھا۔ [مدیر]

انھوں نے ان کے عکس بنوا کر مجھے دیے اور اسی دن اپنی کتاب بھی پیش کی۔

اس دن میرے تیسرے ملاقاتی مظفر علی سید (۱۹۲۹ء - ۲۰۰۰ء) تھے۔ انھیں کسی طرح میری آمد کی اطلاع مل گئی۔ وہ ۱۱/ بجے شب کو تشریف لائے اور تاخیر سے آنے کی انھوں نے معذرت کی۔ میں نے مسرت کا اظہار کیا۔ پچیس تیس سال پہلے ان کا ایک خط میر تقی میرؔ کے سلسلے میں آیا تھا۔ میں نے جواب دے دیا تھا۔ اب جو پہلی بار وہ ملے تو ایسی محبت سے اور ایسی بے تکلفی سے ملے جیسے ہمارے برسوں کے تعلقات ہوں۔ میں نے کافی منگوائی۔ انھوں نے سگریٹ سلگائی اور ہم گفتگو میں ایسے محو ہوئے کہ وقت کا بالکل اندازہ نہیں ہوا۔ اس سفر میں میری بیگم صاحبہ ساتھ تھیں۔ سید صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے بھابھی! اب آپ جا کر آرام کریں، ہم دونوں بھائی دیر تک گپ شپ کریں گے۔ ہمارے پاس دو کمروں کا سوٹ تھا۔ بیگم صاحبہ آرام کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ سید صاحب پورے فارم میں ہیں۔ میں کچھ تھک بھی گیا تھا۔ گرم کافی کا ایک پوٹ اور منگوایا۔ کیا بے پناہ معلومات ان کے تھے اور اردو اور انگریزی ادبیات پر کیسی گہری بصیرت انھیں حاصل تھی۔ زبان ایسی پیاری اور لب ولہجہ ایسا خوبصورت کہ دل چاہتا تھا وہ بولتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ سید صاحب ایک بجے شب کو واپس گئے اور لطف و محبت کے گہرے نقوش میرے قلب پر چھوڑ کر گئے۔

نظیر صدیقی پر یہ تحریر سفرنامہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس لئے موضوع پر واپس آتا ہوں۔

۱۰/ جولائی کو نظیر صدیقی صبح سویرے ہی آ گئے۔ صبح کی چائے اپنے گھر لے جا کر پلانا چاہتے تھے۔ ہمارے اصرار پر چائے انھوں نے ہمارے ساتھ پی اور پھر پروگرام کے مطابق وہ ہمیں اسلام آباد کی سیر کرانے لے گئے۔ ۱۱/ کو ہم لوگ اشفاق احمد، جمیل جالبی، وحید قریشی، فرمان فتح پوری اور رشید حسن خاں کے ساتھ مری کی سیر کو گئے۔ ہم دوسرے دوسرے دن شام کو واپس آئے۔ نظیر صدیقی منتظر تھے۔ پروگرام کے مطابق ان کے گھر گیا۔ کھانے کے بعد آدھی رات تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ طرح طرح کے موضوعات پر۔ انھوں نے اپنے اسکول، اپنے کالج کی بات کی۔ چھپرا اور گورکھپور کا ذکر آیا۔ پھر انھیں ڈھاکا کی زندگی یاد آئی۔ وہاں سے ان کا سلسلۂ خیال کراچی پھر اسلام آباد جا پہنچا۔ اسی دوران میں وہ کچھ دیر کے لیے لندن بھی پہنچے۔ اس رات ملکوں کے حدود ٹوٹ گئے تھے اور سرحدیں ختم ہو گئی تھیں۔

نظیر صدیقی سے دو چار ملاقاتیں مشفق خواجہ صاحب کے گھر پر ناظم آباد میں ہوئیں۔ ایک دو بار.. 'نیپا' کراچی ملنے آئے۔ کچھ اچھی کتابیں اور رسالے ساتھ لائے۔ کراچی کے دوران قیام کچھ ایسی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا جس کی اشاعت کی ہندستان میں ہمیں اطلاع بھی نہ تھی۔ ان کا بہت ممنون ہوا۔

ایک بار (تاریخ اور سال ٹھیک سے یاد نہیں) میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں کام کے سلسلے میں بھی جاوید طفیل کے ساتھ لاہور میں مقیم تھا۔ انھیں کسی کام سے اسلام آباد جانا پڑا۔ ان کے اصرار پر میں بھی ان کے ساتھ چلنے

پر آمادہ ہو گیا۔ وہ کار چلاتے رہے اور لاہور سے اسلام آباد تک کے مشہور مقامات کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتے
رہے۔ سفر میں یہ چند گھنٹے ان کی معیت میں ایسے گزر گئے کہ پتا بھی نہ چلا اور ہم لوگ اسلام آباد کے حدود میں داخل ہو
گئے۔ میرا قیام ڈاکٹر جمیل جالبی کے یہاں تھا۔ ان دنوں وہ مقتدرہ قومی زبان کے سربراہ تھے۔ میں پہلی فرصت میں
نظیر صدیقی سے ملنے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پہنچا۔ انھوں نے اپنے بعض رفقا سے ملایا۔ کچھ یونیورسٹی کی سیر کرائی۔
پھر وہ اپنے نو تعمیر کردہ مکان لے گئے جہاں ان کی بیگم صاحبہ اور بچیوں سے ملا۔ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا۔ تین گھنٹے
ان کے ساتھ گزار کر سہ پہر کو جالبی صاحب کے گھر واپس آیا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے غالب سے می نار میں جو وسط نومبر ۲۰۰۲ء میں منعقد ہوا نظیر صدیقی کو مدعو کیا گیا
تھا۔ وہ ایک بار اور ہندستان آنے کے خیال سے بہت خوش تھے۔ چاہتے تھے کہ انھیں دہلی، علی گڑھ اور پٹنہ تین شہروں
کے ویزے ملیں۔ اس کے لیے انھیں یہاں کے اداروں کے کچھ دعوت نامے مطلوب تھے جنھیں پیش کر کے وہ ویزے
حاصل کر سکیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ نظیر صدیقی جیسے معتبر نقاد و ادیب کو یہاں کے ادبی ادارے اپنے یہاں مدعو کر کے
خوش ہوتے۔ دہلی سے غالب انسٹی ٹیوٹ کا دعوت نامہ جا چکا تھا۔ کتب خانہ خدا بخش پٹنہ کے ڈائرکٹر کی طرف سے لکچر
دینے کا دعوت نامہ بھجوانا مشکل نہ تھا۔ علی گڑھ کے لیے یہاں کے تین علمی و تعلیمی اداروں کے ناظموں سے گفتگو کی۔ ڈاکٹر
ریاض الرحمٰن شروانی سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ڈاکٹر اصغر عباس صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر طارق
چھتاری صدر یونیورسٹی لٹریری کلب جنرل ایجوکیشن سنٹر مسلم یونیورسٹی سے ان کے اداروں کی طرف سے ان کے یہاں
جلسوں میں شرکت کے دعوت نامے وقت پر بھجوا دیے گئے۔

اسلام آباد کے وزارت خارجیہ اور ویزا آفیسروں نے سوچا ہوگا کہ ایک غیر ملک سے جس اسکالر کو پانچ پانچ
ادارے تین تین شہروں دہلی، علی گڑھ اور پٹنہ سے اپنے یہاں تقریر کرنے اور مقالہ پڑھنے کو بلا رہے ہیں، وہ یقیناً بہت
اہم اسکالر ہوگا اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی قیمتی جان کو زیادہ دن تک ملک سے باہر رہنے کا خطرہ مول نہیں لینا
چاہیے۔ چنانچہ صدیقی صاحب کی علی گڑھ اور پٹنہ کے لیے ویزا کی درخواست یکسر نامنظور کر دی گئی اور صرف غالب انسٹی
ٹیوٹ نئی دہلی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے صرف تین دن کا ویزا دیا گیا۔ درخواست گزار کی فریاد پر کہ کانفرنس
پورے تین دن کی ہے۔ پہلے دن صبح ۱۰/ بجے ہی شروع ہو جائے گی اور تیسرے دن کی شب کو ختم ہوگی، دو دنوں کی انھیں
توسیع مل گئی۔ وہ نہ علی گڑھ آ سکے اور نہ پٹنہ پہنچ سکے۔ جب وہ دہلی پہنچے اور مجھے حالات کا علم ہوا تو میں نے انھیں ٹیلی فون
کیا کہ آپ ہمت نہ ہاریں۔ ایک بار اور کوشش کریں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹیوں میں آپ یونس سلیم صاحب، شفیع
قریشی صاحب، سید مظفر حسین برنی صاحب اور ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب (اولی الذکر مرکزی حکومت کے وزیر
اور بقیہ تین اصحاب مختلف صوبوں کے گورنر رہ چکے تھے) میں سے کسی سے ملیں۔ آپ کو دہلی سے ویزا کم از کم علی گڑھ کے

لیے مل جا سکتا ہے۔ اب یا تو انھوں نے اس کی کوشش نہیں کی یا کی، لیکن کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ بہر حال وہ علی گڑھ نہ آ سکے۔ میں اپنی علالت کی وجہ سے دہلی ان سے ملنے نہ جا سکا۔ اس طرح ان کی ملاقات سے محروم رہا۔

میں نے انھیں نومبر اور دسمبر میں دو خط لکھے۔ جواب نہ آیا۔ پھر شاید ڈاکٹر سید معین الرحمٰن سے ان کی علالت کی اطلاع ملی۔ میں نے خیریت جوئی کا خط لکھا۔ اس کا بھی جواب موصول نہیں ہوا تو مجھے کچھ تردّد ہوا۔ اس لیے کہ وہ خط لکھنے میں بہت مستعد تھے۔ چند دنوں کے بعد مشفق خواجہ صاحب کا خط آیا:

"۱۱/ اپریل کو نظیر صدیقی کا انتقال ہو گیا۔ ان کا آخری خط جو میرے نام آیا وہ ۸/ مارچ کا مکتوبہ تھا اور جس میں صرف اتنا لکھا تھا: 'خواجہ صاحب! میں بہت بیمار ہوں۔ معلوم نہیں صحت یاب ہوں گا یا سپردِ خاک ہوں گا'۔ اس کے بعد ان کی طبیعت بگڑتی گئی۔ اسپتال میں داخل کیا گیا مگر وہ اندر ہی اندر گھلتے چلے گئے۔ انھیں انتہائی نگہداشت کی وارڈ میں رکھا گیا۔ آکسیجن دی گئی۔ یہاں تک کہ وہ دائمی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ یہ تمام حالات مجھے افتخار عارف صاحب سے معلوم ہوتے رہے۔ یہ ایک بڑا سانحہ ہے اور اس سے بھی بڑا سانحہ یہ کہ وہ دنیا سے ناخوش گئے۔ خدا کرے اس ناآسودہ روح کو دوسری دنیا میں آسودگی نصیب ہو۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک معصوم انسان تھے جو دنیا کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کی زندگی ناآسودہ گزرتی ہے۔ بہر حال اس بات کی خوشی ہے کہ انھوں نے اپنی تمام تحریروں کو کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ ایک ضخیم کتاب تو انتقال سے دو تین ماہ پہلے ہی چھپی ہے۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اپنے پیچھے دوستوں کا کوئی حلقہ نہیں چھوڑا۔ ان کے لیے کوئی تعزیتی جلسہ نہیں ہوا۔ ہاں کراچی کے ایک دو اخباروں میں سرسری سے مضامین چھپ گئے۔ میں کوشش میں ہوں کہ 'قومی زبان' کا نظیر صدیقی نمبر شائع کر دیا جائے۔ مرحوم مجھ سے بے حد قریب تھے۔ اپنی ہر بات مجھ سے کہہ دیتے تھے بلکہ ناگفتنی بھی خطوں میں لکھ دیتے تھے۔ دو تین سال پہلے اپنے نام کے ادیبوں کے کوئی ایک ہزار خطوط مجھے دے گئے تھے کہ انھیں سنبھال رکھیے۔ بہت سے ایسے خط ہیں جو قابلِ اشاعت ہیں۔ ان خطوں کی تدوین کے لیے کسی دوست کو آمادہ کروں گا۔ میں تو کرتا ہی ہوں، آپ بھی ان کی مغفرت کی دعا کیجیے"۔

اللہ ان کی روح کو سکون بخشے، ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

نظیر صدیقی کی انگریزی اور اردو مطبوعہ تصانیف کی تعداد تیس کے قریب ہے۔ یہ ادب کی مختلف اصناف پر مشتمل ہیں۔ ان میں تنقید بھی ہے، انشائیہ بھی ہے اور شخصی خاکہ بھی۔ انھوں نے دو سفرنامے بھی لکھے ہیں اور ایک خود نوشت بھی ان کی تصنیف سے ہے۔ ان کی تصنیفات میں ایک مختصر شعری مجموعہ بھی ہے جس کا تیسرا اڈیشن اضافے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ان کے علاوہ پانچ کتابیں انھوں نے مرتب بھی کی ہیں۔ انھوں نے ایک جاپانی ناول کا انگریزی سے ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ غالباً ان کی آخری مطبوعہ کتاب ہے۔

نظیر صدیقی کی دلچسپی ایک اور ادبی صنف مکتوب نگاری سے بھی تھی جسے انھوں نے شاید زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وہ کثرت سے خط لکھتے تھے۔ وہ طویل خط کم وقت میں لکھنے پر قادر تھے۔ وہ خط لکھنے میں پہل کرتے اور خطوں کا جواب عام طور پر فوراً دیتے تھے۔ ان کے خطوط تلاش کئے جائیں تو ہزاروں کی تعداد میں نکلیں۔ ان کے مکتوب الیہم کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ یہاں کچھ نام بغیر کسی ترتیب کے لکھے جاتے ہیں:

فیض احمد فیض، خواجہ منظور حسین، الطاف گوہر، خالدہ حسین، آصف فرخی، احسان رشید، فصیح احمد صدیقی، گوپی چند نارنگ، ادا جعفری، حمیدہ اختر، مشفق خواجہ، مسعود مفتی، شمس الرحمٰن فاروقی، ساقی فاروقی، قاضی عبدالودود، عندلیب شادانی، نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، احتشام حسین، کنھیا لال کپور، اختر حسین رائے پوری، انور سدید، جوش ملیح آبادی، کنور سین، حسن عسکری، سلیم احمد، مختار مسعود، جسٹس اے۔ رحمان، افتخار عارف، وزیر آغا، ڈاکٹر محمد صادق، نعیم احمد، پیرزادہ قاسم، محبوب خزاں، صفدر میر، افتخار جالب، احسن فاروقی، شورش کاشمیری، لطیف الزماں خاں، سید انیس شاہ جیلانی، لطف اللہ خاں، جمیل الدین عالی، جمیل جالبی، محبّ عارفی، علی حیدر ملک، باقر مہدی، عابد رضا بیدار، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، ارشد کاکوی، سہیل عظیم آبادی، غیاث احمد گدی، قاضی اشرف (محمود بھائی)، عطاء الرحمٰن جمیل، سید معین الرحمٰن، صادق القادری، کامل القادری، سرور بارہ بنکوی، صلاح الدین محمد، نوشاد نوری، ادیب سہیل، افسر ماہ پوری، فضل احمد فضلی، حامد حسن قادری، خالد حسن قادری، پروین شاکر اور سیکڑوں دوسرے حضرات جو ہندستان، پاکستان، بنگلا دیش اور دوسرے ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

نظیر صدیقی اپنے نام آئے ہوئے خطوط بہت حفاظت سے رکھتے تھے۔ ان کی اہمیت کا انھیں احساس تھا۔ ان کے نام ارباب قلم کے کوئی ایک ہزار منتخب خطوط ان کے پاس جمع تھے جو انھوں نے آخر عمر میں حفاظت کے خیال سے جناب مشفق خواجہ کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ ان کی ترتیب و اشاعت کی فکر میں ہیں۔ نظیر صدیقی نے اپنے نام اپنے معاصرین کے بہت سے خطوط "نامے جو میرے نام آئے" (راولپنڈی، ۱۹۸۴ء) میں شائع کر دیے ہیں۔ کچھ مزید خطوط کے اضافے کے ساتھ وہ اس کا دوسرا اڈیشن نکالنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن شاید اس کا انھیں موقع نہ مل سکا۔ پروین شاکر کے کچھ خطوط بنام نظیر صدیقی ایک مجموعے میں جاوید وارثی نے کراچی سے ۱۹۹۷ء میں شائع کر دیے ہیں۔ اسی

طرح پروفیسر حامد حسن قادری کے ۸ خطوط خالد حسن قادری نے 'خطوط قادری (لندن، ۱۹۹۹ء)' میں محفوظ کردیے ہیں۔ اے۔ کے۔ بروہی، کولن ولسن اور دوسرے انگریزی مکتوب نگاروں کے خطوط خود نظیر صدیقی کے مرتب کیے ہوئے، کراچی سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئے ہیں۔

نظیر صدیقی نے اپنی تمام کتابیں اور اپنی تمام تحریریں اپنی زندگی میں چھاپ کر محفوظ کردی ہیں۔ لیکن اس بات پر مجھے کچھ تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے لکھے ہوئے خطوط کو اہمیت نہیں دی۔ نہ انھیں قابل اعتنا سمجھا اور نہ ان کی اشاعت کا انھیں کبھی خیال آیا۔ خیال آتا تو ان کے خطوط کے کئی مجموعے تیار ہو جاتے۔ بہر حال ان کے خطوط کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور باتوں سے قطع نظر۔ خود نظیر صدیقی کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کے لیے ان کے خطوط کا مطالعہ مفید ہوگا۔ خالد حسن قادری نے 'خطوط قادری' میں نظیر صدیقی کے گیارہ علمی و ادبی خطوط بنام حامد حسن قادری شائع کر دیے ہیں۔ امام اعظم نے اپنے رسالہ 'تمثیل نو' (دربھنگا) میں ان کے خطوط شائع کرنے شروع کیے ہیں (۱)۔ ہندستان میں مظہر امام، حامد علی، اسلوب احمد انصاری، ریاض الرحمٰن خاں شروانی، فصیح احمد خاں، ابوالکلام قاسمی، وارث کرمانی صاحبان اور کچھ دوسرے حضرات سے ان کی خط کتابت تھی، ان سے ان کے خطوط حاصل کر کے شائع کیے جا سکتے ہیں۔

میرے ذخیرۂ خطوط میں نظیر صدیقی کے ۳۳/ خطوط ملے ہیں جو جون ۱۹۹۲ء اور اکتوبر ۲۰۰۰ء کے دوران کوئی ۹ سال کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ ممکن ہے کچھ خطوط محفوظ نہ رہ سکے ہوں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہ ہوگی۔ ڈاکٹر سید حسن عباس مدیر رسالہ 'اوراک' کی فرمائش پر میں نے انھیں مرتب کردیا ہے اور ضروری حواشی لکھ دیے ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی، اسلوب احمد انصاری، ریاض الرحمٰن خاں شروانی کے نام کے خطوط ہم نے حاصل کر لیے ہیں۔ یہ 'اوراک' کے آئندہ شماروں میں شریک اشاعت ہوں گے۔

نظیر صدیقی بہت چاہتے تھے کہ 'نذر نظیر صدیقی' کے لیے ان کی ادبی کاوشوں پر میں کوئی مضمون ضرور لکھوں۔ ارادے کے باوجود مضمون نہ لکھ سکا جس کا افسوس رہا۔ ان کی وفات کے بعد یہ احساس شدید رہا کہ ایک دوست کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا۔ مرحوم کی دوسری برسی پر ان کے کچھ خطوط شائع کر کے اور ان کی یاد میں چند صفحات لکھ کر تلافی کی کوشش کر رہا ہوں۔ توقع ہے ان کے احباب و مخلصین ان کے خطوط اور ان پر لکھے ہوئے حواشی اور تمہید دلچسپی سے پڑھیں گے۔

(ڈاکٹر) مختارالدین احمد

ناظمہ منزل

۲۸۶/۴ امیر نشان روڈ، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲

۱۱/ اپریل ۲۰۰۳ء

۱ ڈاکٹر امام اعظم نے اب تک اپنے نام کے دس خطوط 'تمثیل نو' میں شائع کیے ہیں۔ [مدیر]

نظیر صدیقی کے خطوط مختار الدین احمد کے نام

(1)

Prof. Nazeer Siddiqi
Former Chairman, Department of Urdu
Allama Iqbal Open University
Islamabad- Pakistan

A-29 Relax Apartments
Block 20, Federal B Area
Karachi - 38, Pakistan

۸/جون ۱۹۹۲ء

میرے محترم، السلام علیکم

میں ۲۵/اپریل سے بہ تلاش معاش کراچی میں ہوں۔ کل مشفق خواجہ صاحب کے ہاں جانا ہوا تو غیر متوقع طور پر آپ کے بھیجے ہوئے دو قیمتی تحفے ملے جن کے ساتھ آپ کا اخلاص نامہ بھی تھا۔ بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے یاد کیا۔ تحفوں کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں۔

میں پچھلے سال یکم جولائی کو چین سے واپس آ گیا تھا۔ وزارت تعلیم نے ایک سال کے لئے بھیجا تھا۔ میں ۴/اکتوبر ۱۹۹۰ء کو بیجنگ یونیورسٹی پہنچا تھا۔ اس اعتبار سے مجھے اکتوبر میں واپس آنا چاہئے تھا لیکن شعبۂ اردو (فی الحقیقت وہاں کوئی شعبۂ اردو نہیں ہے۔ پندرہ سولہ زبانوں کا ایک شعبہ ہے جس کا ایک سیکشن اردو ہے) کی خاتون صدر ڈاکٹر خواجہ زکریا یا ڈاکٹر سہیل احمد خاں کو اپنے شعبے میں دیکھنا چاہتی تھیں اس لئے اول تو مجھے Extension نہیں دی، دوسرے مجھے دل کی بیماری (شکر ہے کہ پاکستانی ڈاکٹروں نے چینی ڈاکٹر کی تشخیص سے اختلاف کیا اور بتایا کہ فی الحال میں دل کے حملے سے محفوظ ہوں) کے بہانے قبل از وقت مجھے پاکستان واپس آنے کی اجازت دے دی۔ چین کے دوران قیام میں میں اوپن یونیورسٹی سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ نتیجتاً یہاں واپس آنے کے بعد بیروزگاری سے دوچار ہونا پڑا۔ پاکستان کی کسی یونیورسٹی اور کسی علمی و ادبی ادارے کو نظیر صدیقی کی ضرورت نہیں ہے اس لئے Freelance جرنلزم کا سہارا لینا پڑا۔ اسلام آباد کے ایک انگریزی اخبار The Muslim میں مضامین لکھنے کے علاوہ ریڈیو اور ایک سرکاری ادارے کے متفرق کام (ترجمہ وغیرہ) کرتا رہا ہوں۔ چونکہ باقاعدہ ملازمت زیادہ اطمینان بخش ہوتی ہے اس لئے ملازمت کی تلاش میں کراچی آیا ہوں جہاں سردست اردو کالج میں ایم-اے کو پڑھانے کی جز وقتی ملازمت مل گئی ہے۔ لیکن جز وقتی ملازمت میرے مسائل کا حل نہیں۔ اب اگر حکیم سعید صاحب کے "ہمدرد" سے کوئی ملازمت ملی تو ملی ورنہ ممکن ہے مجھے اسلام آباد واپس جانا پڑے۔ اگر اسلام آباد واپس جانا پڑا تو جولائی کے آخر تک جاؤں گا۔ ان حالات میں سفر نامہ کیا لکھوں (۱) اور ادبی کام کیا کروں۔ بڑی بیٹی ایم-بی-بی-ایس کے آخری سال میں ہے۔ بیٹا بی-ایس-سی کا فائنل

امتحان دینے والا ہے۔ منجھلی بیٹی نے ایم-بی-اے کر لیا ہے۔ فیملی وہیں اسلام آباد میں ہے۔ علم و ادب کی قدر دانی میں آپ کا ملک ہمارے ملک سے بہتر ہے۔ یہاں کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ میر و غالب سے بدتر زمانے میں جی رہا ہوں۔ آپ کراچی آئیں تو مجھے ضرور اطلاع دیں۔ بھابی جان کی خدمت میں آداب عرض ہے۔ بچوں کو دعائیں۔

ممنونِ محبت

نظیر صدیقی

---

(۱) میں نے انہیں لکھا تھا کہ آپ چین گئے ہیں تو چین کا سفرنامہ لکھیں۔ دلچسپ چیز ہوگی۔ بعض ادبی موضوعات کی طرف انہیں متوجہ کیا تھا۔

(2)

کراچی

۱۳ر ستمبر ۱۹۹۲ء

برادرِ مکرم، السلام علیکم

شرمندہ ہوں کہ آپ کے دو خطوں کا جواب خاصی تاخیر سے جا رہا ہے۔ آپ کے ایک خط کے ساتھ سید انیس شاہ جیلانی کے نام ایک خط تھا۔ اسے میں نے ان کے نام بھیج دیا تھا۔ ممکن ہے اس کا جواب آپ تک پہنچ گیا ہو۔ وہ خط و کتابت میں بڑے مستعد قسم کے آدمی ہیں۔

جہاں تک قاضی عبدالودود اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خطوط کا تعلق ہے میرے نام قاضی صاحب کے جتنے خطوط (تقریباً ساٹھ ستر پوسٹ کارڈ) تھے وہ میں نے برسوں پہلے مشفق خواجہ صاحب کو دے دیئے تھے (۱)۔ آج کئی سال پہلے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انہوں نے وہ خطوط آپ کے حوالے کر دیئے ہیں۔ اب اس معاملے میں آپ براہِ راست انہیں سے گفتگو کریں۔ میرے پاس رشید احمد صدیقی کا کوئی خط غیر مطبوعہ نہیں رہا۔ میرے نام ان کے جو پچیس تیس خط تھے وہ سب ہندوستان اور پاکستان کے مرتبہ مجموعوں میں آ چکے ہیں۔ ایک مجموعہ ڈاکٹر سلیمان اطہر نے ہندوستان سے شائع کیا تھا۔ دوسرا لطیف الزماں خاں نے پاکستان سے۔ جن خطوط کے بارے میں آپ نے لکھا ہے کہ حکیم محمد سعید صاحب نے جمع کئے ہیں (۲) ان کے بارے میں مسعود برکاتی صاحب (ان دنوں میرے افسرِ اعلیٰ) نے بتایا کہ وہ اس حالت میں نہیں ہیں کہ ان کو آسانی سے دیکھا اور دکھایا جا سکے۔ آپ نے برکاتی صاحب کے نام جو خط لکھا ہے اس کے جواب میں بہت ممکن ہے قدرِ تفصیل سے وہ ان خطوط کا حال بتائیں۔ اگر آپ کے پاس میرے نام قاضی عبدالودود کے خطوط (مشفق خواجہ صاحب کے دیئے ہوئے) موجود ہوں تو مجھے اس کی اطلاع ضرور دیجئے گا۔ مجھے خوشی ہوگی اگر وہ خطوط آپ کے ذریعے محفوظ ہو جائیں۔

مجھ پر حکیم سعید صاحب کا بڑا کرم بلکہ احسان ہے کہ انہوں نے مجھے یکم جولائی سے ہمدرد فاؤنڈیشن میں مدیر شعبہ تصنیف و تالیف کی حیثیت سے جگہ دے رکھی ہے۔ ماہانہ تنخواہ (الاؤنس سمیت) پانچ ہزار ہے۔ سردست یعنی پہلے تین مہینے on probation ہیں۔ اوقات کار صبح ساڑھے آٹھ بجے سے شام کے ساڑھے پانچ بجے تک۔ چونکہ پاکستان کی روز افزوں مہنگائی کے باعث پانچ ہزار ماہانہ میری ضروریات (دو جگہوں کی ضروریات) کے لئے کافی نہیں اس لئے مجھے اسلام آباد کے انگریزی اخبار کے لئے ہفتہ وار کالم بھی لکھنا پڑتا ہے اور کراچی کے اردو کالج میں جز وقتی Cooperative Professor کی حیثیت سے ایم۔اے کے طلبہ کو پڑھانا بھی پڑتا ہے۔ کراچی میں ابھی تک میرا قیام ایک عزیز کے ساتھ ہے۔ لیکن یہ انتظام دیر تک چلنے والا نہیں۔ میرے اہل و عیال اسلام آباد میں ہیں اور وہ یہاں آنا نہیں چاہتے ہیں۔

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

ان حالات کی بنا پر زندہ رہنے کی صورت تو نکل آئی ہے لیکن ادبی کام کرنے کی کوئی سہولت باقی نہیں رہی۔

بیجنگ (چین) سے خواجہ زکریا صاحب کا خط آیا تھا۔ وہ اپنی شرطوں پر چین گئے ہیں۔ لہذا میرے اور ان کے جانے میں بڑا فرق ہے۔ میں تو وہاں جاتے ہی اپنی یونیورسٹی سے ریٹائر ہو گیا تھا۔ خواجہ صاحب چونکہ ہنوز پنجاب یونیورسٹی میں ہیں لہذا انہیں وہاں کی پوری تنخواہ مل رہی ہے۔ پھر یہ کہ انہیں چین میں فرسٹ سیکریٹری کا مرتبہ اور اس کے فوائد (جو کچھ بھی ہوں) حاصل ہیں۔

مشفق خواجہ اور جمیل الدین عالی سے دوستانہ تعلقات کے باوجود انجمن میں میری سمائی ممکن نہ ہو سکی۔ یہاں کے چھوٹے عہدوں سے میری ضروریات پوری ہو بھی نہیں سکتی تھیں۔ انجمن کے رسالے قومی زبان اور اردو دونوں شائع ہو رہے ہیں۔ اگر آپ تک نہیں پہنچتے تو آپ مشفق خواجہ، عالی، ڈاکٹر جمیل جالبی میں سے کسی سے بھی کہہ دیں کہ یہ رسالے آپ کے پاس بھیجے جائیں۔ ادھر کئی سال سے میرے نام رسالۂ اردو نہیں آتا — توجہ دلانے کے باوجود۔ پاکستان کے حالات ایسے ہی ہیں (۳)۔

مشتاق یوسفی سے ذاتی طور پر واقف ہوں۔ ان کے حلقۂ احباب میں سے نہیں ہوں لیکن کراچی سے لے کر لندن تک ان سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت وہ برصغیر میں اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار اور چوٹی کے انشاپردازوں میں سے ہیں۔

نہ جانے ان دنوں فصیح احمد صدیقی صاحب کہاں ہیں۔ امریکہ سے واپس آئے یا نہیں۔ انہوں نے اپنے خط میں اسلام آباد اور کراچی دونوں شہروں میں جانے کے امکان کا ذکر کیا تھا۔ ممکن ہے کبھی یہاں ملاقات ہو جائے۔ وہ مجھ سے یقیناً بڑی محبت رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے مصر ہیں کہ انگریزی میں رشید احمد صدیقی پر ایک کتاب لکھ دوں۔ میں انہیں یہ

سمجھانے میں ناکام رہا ہوں کہ جو آدمی صرف زندہ رہنے کی جدوجہد سے فارغ نہیں وہ رشید صاحب جیسے بڑے ادیب پر کتاب تو کیا ایک مضمون بھی نہیں لکھ سکتا۔ اگر علی گڑھ یونیورسٹی مجھے سال دو سال کے لئے Visiting Professor کی حیثیت سے علی گڑھ بلا لیتی تو کوئی ڈھب کا کام کر گزرتا۔ لیکن برصغیر میں ایسی روایت کہاں ہے۔

علی گڑھ کا شعبۂ اردو کبھی کبھار میگزین بھیج دیا کرتا تھا سو ایک مدت سے وہ نہیں آتا۔ شعبے نے مشاہیر علی گڑھ پر ایک جلد شائع کی تھی دوسری جلد میں رشید صاحب بھی ہوں گے۔ اگر ممکن ہو تو دوسری جلد بھجوا دیں۔ میرے پاس پہلی جلد ہے (۴)۔ گھر میں سب لوگوں سے سلام کہئے۔

آپ کا

نظیر صدیقی

---

(۱) مشفق خواجہ صاحب سے قاضی صاحب کے خطوط کی نقل مجھے مل گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید مکتوب نگار کے پاس ان کے کچھ اور خطوط محفوظ ہوں جو انھیں بعد کو ملے ہوں۔

(۲) اطلاع ملی تھی کہ ڈاکٹر محمد باقر (لاہور) نے کتابوں کے ساتھ اپنا ذخیرۂ خطوط بھی ہمدرد یونیورسٹی لائبریری کو دے دیا ہے۔ قاضی صاحب سے ان کی خط کتابت تھی مجھے ان خطوط کی تلاش اس وقت بھی تھی اور اب بھی ہے۔ مسعود برکاتی صاحب میرے مہربان ہیں اور پرانے دوستوں میں (ہیں) انھیں متوجہ کیا لیکن اب تک مطلب برآری نہ ہو سکی۔

(۳) مشفق خواجہ صاحب کی مہربانی سے انجمن کے دونوں رسالے پابندی سے آرہے ہیں۔

(۴) مرتبہ پروفیسر نورالحسن نقوی کی دوسری جلد بھی بھیج دی گئی تھی۔

(3)

کراچی، ۱۰ نومبر ۱۹۹۲ء

برادر مکرم، السلام علیکم

تقریباً تین ہفتے قبل یعنی ۱۵ را کتوبر کو مشفق خواجہ صاحب نے مجھے آپ کا خط مورخہ ۲۵ ر ستمبر دیا۔ ۱۵ را کتوبر سے پہلے تک خواجہ صاحب سے میری ملاقاتیں طویل وقفوں پر ہوتی رہیں۔ اب یہ وقفے کچھ مختصر ہو گئے ہیں۔

آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ "کسی مجموعے میں چھپے ہوئے خطوط، میں اپنے مجموعے میں شامل نہیں کر رہا ہوں۔ ہاں کسی کتاب، اخبار، رسالے میں چھپا ہو تو وہ میرے مجموعے میں آئے گا"۔

جو خطوط کسی کے مرتب کردہ مجموعے میں چھپ چکے ہیں کیا وہ مجموعہ ایک کتاب کی حیثیت نہیں رکھتا؟

یہ سوال صرف آپ کی بات کو سمجھنے کے لئے کر رہا ہوں۔ ورنہ مجھے اس پر اصرار نہیں ہے کہ میرے نام رشید احمد صدیقی کے خطوط جو سلیمان اطہر جاوید اور لطیف الزماں کے مرتب کردہ مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں وہ آپ کے

ر ترتیب مجموعے میں ضرور شامل کیے جائیں (۱)۔

ڈاکٹر محمد باقر نے جو خطوط حکیم محمد سعید یا ہمدرد فاؤنڈیشن کے حوالے کر دیے ہیں ان تک میری رسائی ممکن ں۔ اس معاملے میں صرف برکاتی صاحب آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔

"مشاہیر" (۲) کی دوسری جلد جس میں رشید صاحب پر مضمون ہے کسی معتبر آنے والے کے ہاتھ مشفق خواجہ حب یا برکاتی صاحب کے پاس بھیج دیں تو امید ہے کہ مجھے مل جائے گا۔ اس کتاب کے اندرونی سرورق پر میرے چند الفاظ اپنے دستخط کے ساتھ لکھ دیجیے گا۔ ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی سے میرا سلام کہیے۔ وہ رشید صاحب کو ان کے ں سے بھی زیادہ چاہتے ہیں۔

علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر اصغر عباس اور ڈاکٹر شہریار سے اگر آپ کے تعلقات ہوں تو ان دونوں میرا سلام کہیے اور یہ کہ اگر یہ حضرات مجھ سے اپنے روابط کی تجدید کر لیں تو خوشی ہوگی (ان دونوں کو آپ میرا ودہ پتا (گھر کا نہ کہ ہمدرد کا) دے دیں تو بہتر ہوگا)۔ شہریار نے سرسید پر ایک اچھا رسالہ شائع کیا ہے جو میں نے ق خواجہ کے ہاں دیکھا۔

سرسید پر انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام سیمینار ہونے والا ہے۔ پاکستان سے بہت سے لوگ شریک ہوں ۔ میرے مدعو ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔ ویسے میری ہمدرد والی ملازمت بھی مجھے یہاں سے نکلنے نہیں دے ۔ ابھی تک تو میرے پاس ایک ہفتے کی Casual leave تک نہیں ہے۔

اور حالات بدستور۔ گاہے گاہے خط لکھتے رہیے۔ سب لوگوں کی خدمت میں آداب عرض ہے۔

دو ایک خط پوسٹ کر دیجیے گا۔ خطوں پر پتے درج ہیں۔

آپ کا

نظیر صدیقی

میں نے انھیں لکھا تھا کہ میں رشید صاحب کے خطوط کا ایک مجموعہ مرتب کر رہا ہوں، اس میں ان کے غیر مطبوعہ خطوط ہوں گے۔ ور وہ خطوط بھی جو کسی رسالے، اخبار وغیرہ میں چھپے ہوں لیکن رشید صاحب کے خطوط کے شائع شدہ مجموعوں میں شامل نہ ہوں۔ جو خطوط رشید صاحب کے خطوط کے کسی مجموعے میں چھپ گئے ہیں انھیں اپنے زیر ترتیب مجموعے میں نہیں لے رہا ہوں۔ نظیر صدیقی صاحب کے نام رشید صاحب کے خطوط چونکہ دو مجموعوں میں شائع ہو چکے تھے اس لیے میں نے انھیں اپنے زیر ترتیب مجموعے میں نہیں لیے ہیں۔

مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن نقوی۔

کراچی

۱۰ر جنوری ۱۹۹۳ء

برادر مکرم، السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۲۹ر نومبر اور تہذیب الاخلاق کا ایک پرچہ مل گیا تھا۔ جلال اصغر فریدی اور راجندر سنگھ ورما کے نام آپ نے میرے خطوط بھیج دیے۔ ان سب عنایتوں کے لئے تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔

'خطبات رشید احمد صدیقی' جو پاکستان میں چھپی ہے اس پر میرا ایک تبصرہ ماہ رواں کے 'قومی زبان' کراچی میں شائع ہوا ہے۔ اس کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔ اسے پڑھ کر ڈاکٹر فصیح احمد کو دے دیجئے گا اور یہ تاکید کر دیجئے گا کہ وہ مہر الٰہی اور فرخ جلالی جیسے پرستارانِ رشید کو یہ تبصرہ ضرور دکھا دیں۔ ڈاکٹر فصیح کے نام ایک خط بھی ارسال ہے۔ ڈاکٹر فصیح نے آج کل سیاحی اختیار کر رکھی ہے۔ پھر بھی میری ان کی ملاقات ابھی تک ممکن نہ ہو سکی ہے۔

'مشاہیر علی گڑھ' (وہ جس میں رشید احمد صدیقی پر مضمون ہے) کے بھیجنے میں تاخیر ہو تو ہو لیکن جب بھی بھیجیں معتبر ذریعے سے بھیجیں۔ اس کتاب پر اپنا اور میرا نام ضرور لکھ دیں۔ اگر مشفق خواجہ صاحب کے ذریعے بھیجنے کی کوئی صورت ہو تو وہ بہتر ہوگی کیوں کہ بعض اوقات کتابیں کراچی پہنچ جاتی ہیں لیکن کراچی میں جس کو ملنی چاہئے اس تک نہیں پہنچتیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلوب احمد انصاری، شہریار اور کبیر احمد جائسی صاحبان کے رسالوں کے حصول کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے رسالوں کے لئے ایک ایک مضمون بھیج دیا جائے لیکن اس میں دشواری وہی ہے جو درد سر کے واسطے صندل لگانے میں ہے۔ میں اپنے موجودہ حالات میں کوئی ادبی کام نہیں کر پا رہا ہوں۔ مضامین کس طرح لکھوں وہ بھی اتنے اچھے رسالوں کے لئے (۱)۔

'تہذیب الاخلاق' ، جو پرچہ آپ نے بھیجا ہے اس میں میں نے آپ کا مضمون پڑھا۔ آپ نے اچھا کیا کہ اپنے کچھ حالات اس طرح محفوظ کر دیے (۲)۔ آپ کے حالات قابل رشک اور آپ کی کارکردگی قابل فخر رہی ہے۔ حیرت ہے کہ آپ پر اب تک پی-ایچ-ڈی کا کام کیوں نہ ہو سکا۔ یہ روایت تو ہندوستان ہی کی ہے کہ وہاں زندوں پر پی-ایچ-ڈی ہوتی ہے۔ یہاں تو پی-ایچ-ڈی کے لئے مرنا اولین شرط ہے۔ کیا اب آپ کے اُردن جانے کا سلسلہ ختم ہو گیا؟ پاکستان کب آ رہے ہیں ؟

کیا آپ کا یہ پتا کافی ہے۔ جامعۂ اردو، علی گڑھ (۳)۔ ایک خط پوسٹ کر دیجئے گا۔

آپ کا

نظیر صدیقی

(۱) مکتوب نگار نے خواہش ظاہر کی تھی کہ علی گڑھ کے رسالے نقد و نظر، فکر و نظر اور تہذیب الاخلاق انھیں پابندی سے ملتے رہیں۔

(۲) 'تہذیب الاخلاق' میں اپنے حالات میں میں نے کوئی مضمون نہیں لکھا، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم اور بعض دوسرے علی گڑھ کے اصحاب پر لکھے تھے۔ ایک مضمون، اپنے علی گڑھ اور آکسفرڈ کے معاصر ڈاکٹر احمد شفیق پر لکھا تھا جو اس وقت امریکہ میں ہیں اور وہاں سائنس کے ممتاز اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ صدیقی صاحب کا اشارہ شاید اسی مضمون کی طرف ہو۔ اس میں آکسفرڈ کی زندگی کا کچھ ذکر آ گیا ہوگا۔

(۳) میں اس زمانے میں ڈاکٹر مسعود حسین صاحب کے ساتھ جامعۂ اُردو علی گڑھ میں بحیثیت نائب شیخ الجامعہ کام کر رہا تھا۔

(5)

کمرہ-۳، ڈی-۱۹، رضویہ سوسائٹی
ناظم آباد (گل بہار) کراچی-۱۸، پاکستان
[۸؍جولائی ۱۹۹۳ء]

برادر مکرم، السلام علیکم

یاد نہیں آتا کہ اگر میں آپ کے کسی خط کے جواب کا مقروض ہوں تو کس خط کا۔ چیزیں منتشر حالت میں ہیں۔ اتنا بھی نہیں ہو پاتا کہ مہربانوں اور قدردانوں کے خطوط کو الگ الگ فائلوں میں رکھتا چلا جاؤں۔ یہ ہنر مشفق خواجہ صاحب کے ہاتھ میں ہے اور میرے لئے باعث رشک ہے۔ ان سے تقریباً ہر جمعے کو ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ان کا گھر پاکستان اور ہندوستان کے ادیبوں سے ملنے کا ایک مرکز ہے۔

میں تین ملازمتوں (ہمدرد فاؤنڈیشن، اردو کالج اور انگریزی اخبار ''دی نیوز'' کراچی میں ہفتہ وار مضمون نگاری) کے سوا اور کچھ نہیں کر پا رہا ہوں۔ نہ رہنے سہنے کا انتظام درست، نہ کھانے پینے کا انتظام درست۔ اس لئے کوئی ڈھب کا کام نہیں ہو پاتا۔

حامل ہذا ابوسفیان اصلاحی صاحب سال میں دو ایک مرتبہ کراچی ضرور آتے ہیں۔ اگر آپ مشاہیر علی گڑھ جلد دوم انہیں دے دیں تو مجھ تک پہنچ جائے۔ آپ قاضی عبدالودود یا رشید احمد صدیقی کے خطوط کا مجموعہ شائع کریں تو ایک جلد مجھے ضرور عنایت کریں۔

کیا اب آپ کا پاکستان آنا ممکن نہیں رہا؟

اور سب بدستور۔

آپ کا
نظیر صدیقی

کراچی

۱۰ر نومبر ۱۹۹۳ء

برادر محترم ڈاکٹر مختار الدین صاحب، السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مورخہ ۹ر ستمبر مشفق خواجہ صاحب کے ذریعے مل گیا تھا۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ آپ جیسا مصروف آدمی میری ایک معمولی کتاب (۱) کو اتنی توجہ سے پڑھ کر مجھے اتنا طویل خط لکھ سکے گا۔ دراصل یہ آپ کی محبت ہے جس نے آپ کو مجھ پر اتنا وقت صرف کرنے پر اکسایا۔ آپ نے میری بہت سی کوتاہیوں کی نشاندہی کے باوجود اپنے خط کے آخر میں میری کتاب کے متعلق بڑی حوصلہ افزا رائے ظاہر کی ہے جس کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ میرے عزیز اور محترم دوست مشفق خواجہ تو برابر یہ کہتے رہے ہیں کہ مجھے یہ خود نوشت ہرگز نہیں لکھنی چاہئے تھی۔ ان کے نزدیک اس سے زیادہ ناقص اور فضول خود نوشت دنیا میں شاید ہی کوئی اور ہو۔ ان کا خیال ہے کہ اپنی خود نوشت میں لکھنے کے لئے میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان جیسے ممالک میں پوری سچائی کے ساتھ ایک مکمل خود نوشت لکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ جن لوگوں نے اس کام کی ہمت کی ہے انہوں نے اپنی عزت اور وقار کو خاصا خطرے میں ڈالا ہے۔ میں نے اپنی خود نوشت میں جو کچھ محفوظ کرنا چاہا وہ محفوظ کر دیا ہے۔ اب اسے کوئی پڑھے یا نہ پڑھے، اچھا کہے یا بُرا مجھے اس سے کوئی بحث نہیں۔ ممکن ہے کہ اس کتاب کو خود نوشت کی بجائے Memoirs یادداشتیں کہنا زیادہ مناسب ہو۔

آپ نے اس بات کی داد دی ہے کہ میں نے کتاب کے شروع میں دردؔ کا شعر برمحل لکھا ہے (۲)۔ خود میرے ساتھ بھی ایسا ہوا کہ میں کسی شعر سے صاحب شعر کی کتاب میں اتنا متاثر نہ ہو سکا جتنا کسی خاص تناظر میں اس کے نقل ہونے سے متاثر ہوا۔ ویسے دردؔ کے جن شعروں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے جسے میں نے نقل کیا۔ ان کا ایک اور شعر مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ دردؔ جیسے صوفی شاعر نے یہ شعر کیوں کر کہا۔

جو خرابی کہ دردؔ یاں پھیلی
دست قدرت سے کب سمٹتی ہے

جب دردؔ جیسا صوفی خدا کے بارے میں ایسی بات کہہ سکتا ہے تو مجھے بھی یہ کہنے کا حق ملنا چاہئے کہ اس ذوق خدا پر ہو خدا ہی کی مار۔ دراصل میرے اندر تھوڑی سی وہ چنگیزیت بھی آگئی ہے (۳) جو یگانہ چنگیزی کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے۔

عبدالحفیظ ثمرؔ صدیقی (۴) میرے قریبی رشتہ داروں میں تھے۔ سیمابؔ کے شاگرد ہونے کے باعث ان کا

زیادہ تر کلام 'شاعر' آگرہ میں چھپا۔ میرے پاس ان کا ایک شعر بھی محفوظ نہیں۔ ان کے سب سے چھوٹے بھائی عبداللہ ہلال صدیقی کراچی ہی میں رہتے ہیں اور اب وہ اپنے سات بھائیوں میں تنہا بھائی ہیں جو حیات ہیں۔ برصغیر کے حالات کی بنا پر اب قریبی رشتہ داروں سے بھی تعلقات باقی نہیں رہے۔ والد صاحب کے معاملے میں میرا دل بہت دکھا ہوا ہے اس لئے ان سے متعلق بیانات میں دو ایک جگہ بے ادبی ناگزیر ہو گئی (۵)۔

سہیل عظیم آبادی مرحوم کے خطوط میں کوئی علمی اور ادبی بات نہیں ہے۔ صرف رسالہ ''کہانی'' اور موہن لال شیدا سے متعلق کاروباری باتیں ہیں۔ شیدا کوئی بڑے سرمایہ دار نہ تھے۔ ایک ٹٹ پونجیے کاروباری تھے۔ محض اپنے ادبی شوق میں رسالے کا بوجھ لے بیٹھے۔ غیاث احمد گدی کے خط سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ سہیل مرحوم مالی معاملات میں دیانتدار نہ تھے (۶) اس لئے شیدا کا تباہ ہو جانا ناگزیر ثابت ہوا۔

میرا خیال ہے کہ یہ حامد علی وہی ہیں جو میرے ہم جماعت (انٹر میں) تھے (۷)۔ اگر ملاقات ہو تو ان کا پتا بھیجئے۔ اب ان سے میری ملاقات تو ناممکنات میں سے ہے۔

خیر بہوروی (۸) بہت اچھے مقرر تھے لیکن مجھے کبھی ان کی تقریر سننے کا موقع نہ ملا۔ ان کی نظم 'صبح بنارس' اس زمانے میں (یعنی جب میں گورکھپور میں تھا) مشہور تھی۔ اگر آپ کے پاس ہو تو فوٹو کاپی بھیجنے کی زحمت گوارا کیجئے۔

فطرت واسطی (۹) سے ڈھاکے میں ملاقاتیں رہیں۔ چونکہ میں نہ کبھی ان کی شاعری سے متاثر ہو سکا نہ ان کی شخصیت سے اس لئے میری خودنوشت میں ان کا تذکرہ نہ آسکا۔

ڈاکٹر یوسف (۱۰) جن سے ڈھاکے میں میری ملاقاتیں تھیں۔ لیکن میں ان سے بھی کبھی متاثر نہ ہو سکا اس لئے میری خودنوشت میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

خیر بہوروی صاحب کے سلسلے میں آپ نے جن خالدی صاحب کا ذکر کیا ہے میں ان سے بالکل واقف نہیں۔ نہ جانے ان کا پورا نام کیا ہے (۱۱)۔

اس میں شک نہیں کہ اپنی زندگی کے معاملے میں مجھ سے جو بڑی غلطیاں ہوئی ہیں ان میں میرا علی گڑھ نہ جانا بھی ہے۔ لیکن گورکھپور سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد ہندوستان یا علی گڑھ جانا اس لئے ناممکن ہو گیا تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی۔

یہ بات آپ کی سمجھ آئے یا نہ آئے کہ شادانی صاحب نے میرے اور ارشد کاکوی کے پاؤں کی دھول کو شعبۂ اردو میں کیوں کر جگہ دی، لیکن ہوا یہی۔ دراصل انسانوں کی اکثریت بے حد مفاد پرست واقع ہوئی ہے۔ شادانی صاحب بھی اسی اکثریت کا حصہ تھے۔ اس لئے ارشد یا مجھے شعبے میں جگہ دینا ممکن نہ ہو سکا۔

میرے بنگالی دوست محمود بھائی (مرحوم) کے نام ہندی میں گاندھی جی کے جو خطوط کتابی شکل میں ہیں ان کے دو ایک نسخے یقیناً میرے پاس ہیں۔ میں اسلام آباد جاؤں گا تو ڈھونڈھ کر نکالوں گا اور آپ کے پاس بھیج دوں گا۔

بجنو جعفری نوٹرے ڈیم کالج (امریکن کالج) ڈھاکا میں اردو کے لیکچرار تھے۔ ان کی حالات کے دوران جب وہ کراچی آگئے تھے میں نے نوٹرے ڈیم میں جزوقتی لیکچرار کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد میں اس کالج میں مستقل ہو گیا تھا۔ ان کا ایک بیٹا کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر یا پروفیسر ہے۔ کسی ذریعے سے بجنو جعفری کی تاریخ وفات معلوم کر کے لکھوں گا۔

ڈاکٹر امیر الحسن صدیقی سے میری مراد امیر حسن صدیقی ہی ہیں (۱۲)۔ میں ان کا نام غلط لکھ گیا۔

مولانا تمنا عمادی کا جو واقعہ (شرف الحسینی کے سلسلے میں) میں نے لکھا ہے وہ میرے لیے نہایت تکلیف دہ ہے۔ مذہب کس طرح انسان کو تنگ دل اور تنگ نظر بناتا ہے یہ اس کی بہترین مثال ہے۔ مذہب تنگ دلی اور تنگ نظری کی تلقین نہیں کرتا بلکہ وہ تو فراخ دلی اور وحدت انسانی کی تعلیم دیتا ہے لیکن مذہب کے سانچے سے جو لوگ پیدا ہوتے ہیں ان کی بھاری اکثریت تنگ دل اور تنگ نظر ہوتی ہے۔

عطاء الرحمن جمیل دو تین ماہ قبل امریکہ سے بنگلہ دیش واپس جاتے ہوئے کراچی میں مجھ سے ملے تھے۔ میرے ڈھاکے کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ ان سے متعلق ایک مضمون مجھ پر یقیناً قرض ہے۔ لیکن وہ اپنی خوش حالی کے باوجود اپنا ایک مجموعۂ کلام شائع نہیں کرتے ہیں۔ میں مضمون کس طرح لکھوں۔ اگر ان سے فرمائش کی جائے کہ اپنی تمام تر غزلیں اور نظمیں بھیج دو تو وہ یہ بھی نہیں کر سکتے (۱۳)۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اسلام آباد میں مقتدرہ اردو زبان کے صدر نشیں تھے تو انہوں نے املا اور تلفظ سے متعلق مسائل پر ایک سیمینار کرایا تھا۔ میں نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر اردو بولنے والے حضرات اسکول کہتے ہیں تو وہ بھی غلط ہے اور اہل پنجاب سکول کہتے ہیں تو وہ بھی غلط ہے۔ انگریزی کے ایک ماہر پروفیسر نے مجھے ایسا ہی بتایا ہے۔ اب اگر اس بات پر اصرار کیا جائے کہ سکول ہی کہنا درست ہے تو اردو کے کئی مشہور شعر ناموزوں ہو جائیں گے۔ مثلاً اکبر الہ آبادی کا شعر ؎

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روئی رات کی

میرا خیال ہے کہ دونوں قسم کے تلفظ کو درست سمجھنا چاہیے۔

خیر، بھوروی نے میرا اکادمی کی طرف سے میر پر جو ضخیم اور گراں قیمت کتاب شائع کی تھی آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ اس میں پاکستان کے جن دو تین لکھنے والوں کے مقالات تھے ان میں ایک میں بھی تھا۔

ہاں حکیم حمید دہلوی سے میری مراد حکیم عبدالحمید دہلوی ہیں۔ حکیم سعید کے بڑے بھائی۔ ڈاکٹر سمیع سے مراد ڈاکٹر سمیع الدین احمد۔ ڈاکٹر ایم احمد سے مراد ایم۔ ایم احمد ہیں (۱۴)۔ کراچی یونیورسٹی میں فلسفے کے استاد تھے۔

میں نے احمد شاہ بخاری کی 'سرگزشت' کا ذکر نہیں کیا بلکہ زیڈ۔ اے۔ بخاری (پطرس کے چھوٹے بھائی ریڈیو والے) کا ذکر کیا ہے۔

نیاز صاحب اور رشید صاحب کو مجھ سے ملنے کا جو اشتیاق تھا اس کے لئے ان کو 'ملاقات کا آرزومند' کہنا غالباً سوءادب ہے لیکن وہ دونوں مجھے بہت عزیز رکھتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ مجھ سے ملنے کے آرزومند تھے (۱۵)۔

آپ نے زبان کے معاملے میں میری بعض غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جس سے میں مستفید ہوا لیکن بعض لفظوں اور فقروں کے معاملے میں سمجھ میں نہ آیا کہ وہ غلط کیوں کر ہیں۔ لفظ ''چھوٹا'' کم عمری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا کیا حرج ہے (۱۶)۔ اگر یہ لکھا جائے کہ میں بالکل چھوٹا تھا یعنی بہت کم عمر تھا۔ زندگی کے انجھیڑوں، لغت میں ''انجھیڑوں'' کا مطلب الجھنیں ہے (۱۷)۔ یہ لفظ ''انجھیڑوں'' میں نے سہیل عظیم آبادی کے خطوں سے سیکھا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ کتاب کی ''جلدیں'' کی جگہ ''نسخے'' لکھنا چاہئے تھا۔

آپ نے غالب کی طرح اپنے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ مجھے جواب لکھتے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں آپ سے روبرو باتیں کر رہا ہوں۔ آپ سے میری اتنی گفتگو تو کراچی میں بھی نہیں ہو پاتی۔

اچھا اب آپ سے دو گزارشیں ہیں۔ میرا مختصر سا مجموعۂ کلام ''حسرت اظہار'' بھی آپ کے پاس ہے۔ کبھی وقت نکال کر اس کے بارے میں بھی ایک ایسا ہی طویل خط لکھئے تاکہ مجھے اندازہ ہو کہ میں نے شاعری میں کیا جھک ماری ہے۔ جس کی بنا پر شاعری میں بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہوں۔

علی گڑھ کے پروفیسر ریاض الرحمن شروانی میرے بڑے قدردانوں میں سے ہیں۔ حال میں ان کا خط آیا تھا۔ آپ سے ملاقات کا ذکر بھی تھا۔ وہ میری خودنوشت پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ انہیں میری دونوں کتابوں (خودنوشت اور حسرت اظہار) کو پڑھنے کا موقع دیں۔

ابوسفیان اصلاحی کے پاس کوئی ہندوستانی اخبار ہے جس میں میرے بارے میں کچھ لکھا گیا ہے۔ انہوں نے متعلقہ حصہ کی فوٹو کاپی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے ایفائے وعدہ کا ہنوز انتظار ہے۔

اکتوبر یا نومبر ۱۹۹۰ء کے کتاب نما دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد پر میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اگر ممکن ہو تو اسے پڑھ کر اپنی رائے سے مستفید ہونے کا موقع دیجئے۔

مشفق خواجہ بخیریت ہیں۔ لیکن حال میں ان کے ایک سگے سالے ایک سخت حادثے کی زد میں آگئے۔ بہر حال اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔ اور سب بدستور۔

آپ کا نیازمند
نظیر صدیقی

---

(۱) نظیر صدیقی کی خودنوشت سوانح حیات سو یہ ہے اپنی زندگی (ایبٹ آباد، ۱۹۹۱ء)۔ یہ کتاب انھوں نے مجھے کراچی میں ۱۶ اگست ۱۹۹۳ء کو دی تھی جس پر ان کے قلم کی یہ تحریر ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کی خدمت میں جن کی برادرانہ شفقت اور محبت میری زندگی کی بہترین نعمتوں میں سے ہے۔ نظیر صدیقی

(۲) سرورق کے بعد دوسرے صفحے پر احسن کا ایک قول اور درد کا یہ شعر درج ہے:

عالم سے اختیار کی ہر چند صلح کل — پر اپنے آپ سے تو شب و روز جنگ ہے

(۳) "میرے اندر تھوڑی سی چنگیزیت آگئی ہے" ان کے یہ لکھنے پر میں نے ایک ملاقات میں ان سے کہا یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ مسکرائے اور بات ختم ہوگئی۔

(۴) عبدالحفیظ قمر صدیقی کی نظم ونثر ۱۹۳۵-۱۹۳۶ء میں بہار کے بعض رسالوں میں دیکھتا تھا۔ سید منظر علی ندوی ایڈیٹر اخبار "مسلم" کے مطبع "برقی پریس" میں انھیں دیکھنا بھی یاد آتا ہے۔ نظیر صدیقی کی خودنوشت سے معلوم ہوا کہ وہ ان کے قریبی رشتے کے چچا تھے۔

(۵) ایک شاعر کو (جو انھیں کے بقول Accentric ٹائپ کے آدمی تھے) قرض دینے سے معذوری ظاہر کرنے پر انھوں نے لکھا تھا: "میرے والد صاحب نے شرم تک محسوس نہیں کی اور ایک شاعر جیسی مخلوق کو مایوس کر دیا"۔ ان کے ایک اور فقرے قابل اعتراض تھے۔

(۶) سہیل عظیم آبادی سے میرے تعلقات کی مدت نصف صدی سے زائد ہے۔ میرے سامنے ان کی عدم دیانت داری کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ ہاں، عالم شباب میں کچھ آزاد رو تھے۔ لیکن تھے بہت مخلص اور دوست نواز۔

(۷) جی ہاں یہ وہی حامد علی صاحب ہیں ساکن محلہ قاضی خورد، گورکھپور۔ انھوں نے بی-اے علی گڑھ سے کیا۔ میرے دوستوں میں ہیں۔ بہت قیمتی نفیس کتب خانے کے مالک ہیں۔ خیر بہوروی مرحوم سے ان کے بے تکلفانہ تعلقات تھے۔

(۸) ابوالخیر خیر بہوروی (۱۹۰۱-۱۹۷۱ء) بہت کامیاب مقرر تھے اور اچھے شاعر۔ ان کی تقریریں بھی میں نے سنیں اور ان کی نظمیں بھی۔ ۱۹۳۵-۱۹۴۰ء کے عرصے میں نبل الہ آبادی، خیر بہوروی اور فطرت واسطی پٹنہ کے مشاعروں میں اکثر شرکت کرنے آتے تھے۔ خیر صاحب کی نظم 'صبح بنارس' ان سے اسی زمانے میں سنی تھی۔ ان سے تعلقات علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ جب وہ انجمن ترقی اردو ہند سے وابستہ ہوئے۔

(۹) فطرت واسطی نوجوان خوبصورت آدمی تھے۔ رومانوی شاعر تھے اور شعر اچھی طرح پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں گورکھپور میں رہتے تھے۔

ایک بار پٹنہ کالج کے ایک مشاعرے میں آئے۔ سینیٹ ہال پٹنہ میں اور طالب علموں کے ساتھ ان سے ملاقات ہوئی۔ دوسرے دن مدرسۂ شمس الہدیٰ کے ہوسٹل "شیش محل" میں میں اتفاق سے موجود تھا کہ ملنے تشریف لائے۔ ان کا مجموعۂ کلام "حدیث حسن" اسی زمانے میں شائع ہوا تھا۔ مختصر سا مجموعہ تھا۔ ایک روپیہ قیمت تھی۔ ہم طالب علموں نے چھ نسخے خرید لئے۔ ان سے کچھ شعر بھی سنے وہ خوش خوش واپس گئے۔ پھر انھیں نہ کہیں دیکھا نہ ان سے کبھی ملاقات ہوئی۔ ڈھاکا وہ غالباً تقسیم ہند کے بعد گئے۔

(۱۰) سید یوسف حسن علی گڑھ میں میرے معاصر بلکہ ہم سبق تھے۔ ممتاز ہوسٹل میں رہتے تھے اور جذبی صاحب کے خاص شاگردوں میں تھے۔ بی۔اے کے بعد پٹنہ اور پھر ڈھاکا چلے گئے۔ بنگال کے ادب کی تاریخ پر انھوں نے مقالۂ علیہ لکھا جس پر انھیں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ آج کل کھلنا میں ایک تعلیمی ادارہ چلا رہے ہیں۔ یہ مشہور افسانہ نویس احمد یوسف (یوسف منزل، محلہ صدر گلی پٹنہ سیٹی) کے دوستوں میں ہیں۔ اس زمانے میں محلہ صدر گلی میں انھیں کے قریب کہیں رہتے تھے۔ ایک بار جوش ملیح آبادی (غالباً پٹنہ کالج کے) ایک مشاعرے میں آئے ہوئے تھے اور پٹنہ سیٹی میں مقیم تھے۔ سید یوسف حسن نے انھیں ایک صبح کشتی پر دریائے گنگا کی سیر کرائی جوش صاحب بہت خوش ہوئے۔ اسی زمانے میں ان کے اشعار کا ایک مجموعہ "شعلہ وشبنم" چھپا تھا۔ اس کا ایک نسخہ انھیں دیا اور اپنے قلم سے یہ عبارت لکھ کر دستخط کئے: "عزیزی یوسف حسن نے دریا کی سیر کرائی، میں نے انھیں یہ کتاب دی، وہ بھی ایک موج تھی، یہ بھی ایک موج ہے"۔ جوش

یوسف حسن صاحب نے آج سے کوئی پچپن ساٹھ سال پہلے "شعلہ وشبنم" کا وہ نسخہ علی گڑھ میں مجھے دکھایا تھا۔ جہاں تک یاد آتا ہے عبارت کچھ ایسی ہی تھی۔ خدا کرے انھوں نے اس نسخے کو سنبھال کر رکھا ہو۔ یوسف حسن ممتاز ہوسٹل میں رہتے تھے۔

(۱۱) محمد یونس خالدی (۱۹۱۷-۱۹۸۵ء) اچھے مقرر تھے اور مستعد سیاسی کارکن۔ قاضی عبدالغفار مرحوم کی سکریٹری شپ کے زمانے میں انجمن ترقی اردو میں کام کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام کے گہرے عقیدت مندوں میں تھے۔ صاحب السیف والقلم تھے۔ تیز اور تند تقریریں کرتے تھے۔ تحریر میں بھی بلند تھے۔ سید علی غمگین ملقب بہ حضرت جی (متوفی ۱۲۶۸ھ) اور غالب کے تعلقات پر ایک کتاب مطالعہ حضرت غمگین دہلوی (دہلی ۱۹۶۳ء) کے مصنف ہیں۔

(۱۲) ڈاکٹر امیر حسن صدیقی سے میری ملاقات تھی۔ وہ علی گڑھ اور لندن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ اسلامی تاریخ کے استاد تھے۔ یہاں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم کے بہت قریب تھے۔ تقسیم ہند سے بہت پہلے ہی علی گڑھ سے کراچی چلے گئے تھے۔ اور سندھ مسلم کالج سے متعلق ہو گئے تھے۔

(۱۳) ۱۹۹۱ء میں شعبۂ اردو کی ایک استاد محترمہ ام سلمیٰ کا شفوی امتحان لینے کے لئے ڈھاکا یونیورسٹی نے مجھے مدعو کیا تھا۔ انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لئے بنگال کے اردو ادب کے مقالۂ علیہ لکھا تھا۔ وہاں متعدد ادیبوں اور مصنفوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ شمس عظیم آبادی، کلیم سہسرامی، نوشاد نوری، عطاء الرحمٰن جمیل۔ جمیل صاحب سے ان کے شعر بھی سنے۔ میں نے کسی خط میں نظیر صدیقی کو لکھا تھا کہ جمیل صاحب اچھے شاعر ہیں آپ کے دوست بھی ہیں ان پر بھی کوئی مضمون تحریر کیجئے۔ آپ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "ان کے کچھ اشعار اردو شاعری میں یادگار رہیں گے"۔

(۱۴) نظیر صدیقی مرحوم خطوط ہی میں نہیں مضامین اور کتابوں میں بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگوں کے نام بے خیالی میں کچھ کا کچھ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی کو امیر الحسن صدیقی لکھ دیا ہے۔ کبھی سہل انگاری سے کام لے کر پروفیسر سمیع الدین احمد صدر

شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی کو ڈاکٹر مسیح، حکیم عبدالحمید دہلوی کو حکیم حمید، ایم۔ ایم احمد (پروفیسر محمد محمود احمد (صدر شعبہ فلسفہ کراچی یونیورسٹی) کو ڈاکٹر ایم احمد لکھ دیتے ہیں۔

(۱۵) ''نیاز اور رشید صدیقی میرے بڑے قدردانوں میں سے تھے۔ نیاز صاحب خواہش مند تھے کہ میں ان پر بھی مضمون لکھوں مکتوبات نیاز پر میں نے جو کچھ لکھا اور جیسا کچھ لکھا ویسا نہ پہلے لکھا گیا ہے اور نہ اب تک لکھا گیا ہے۔ نیاز فتح پوری اور رشید احمد صدیقی، دونوں اس بات کے آرزومند تھے کہ ان سے میری ملاقات ہو جاتی لیکن نہ یہ سعادت میرے نصیب میں تھی نہ یہ مسرت ان کے نصیب میں''۔ (سو یہ ہے اپنی زندگی، ص ۱۰۸) میں نے اس عبارت کی طرف انھیں متوجہ کیا تھا۔

(۱۶) میں نے جواب دیا: حرج تو کوئی نہیں لیکن آپ جیسے ادیب و مصنف کی زبان پر یہ لفظ اچھا نہیں لگتا۔

(۱۷) تو پھر ''الجھنیں'' لکھنے میں کیا تکلف ہے۔ سہیل عظیم آبادی کے خطوں سے کچھ سیکھنا تھا تو کچھ اچھے فقرے اور اچھے جملے سیکھتے۔

(7)

کراچی

۴؍اپریل ۱۹۹۴ء

محب مکرم ڈاکٹر مختارالدین صاحب، السلام علیکم

مشفق خواجہ صاحب کے ذریعہ نوازش نامہ مورخہ ۴؍فروری کو مل گیا تھا۔ بوجوہ جواب خاصی تاخیر سے جا رہا ہے جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ یہ آپ کی بڑی عنایت ہے کہ آپ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود مجھ سے تفصیلی گفتگو کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ کراچی میں ایسی گفتگو کسی سے نہیں ہو پاتی۔ نتیجتاً بڑی بے کیفی اور تشنگی رہا کرتی ہے۔ آپ کے خط کے آنے سے پہلے حامد گورکھپوری کا خط آ گیا تھا۔ میں نے جلد سے جلد جواب بھیج دیا تھا۔ لیکن ابھی تک جواب الجواب نہیں آیا۔ اس دوران میں بالواسطہ طور پر معلوم ہوا کہ بہار یونیورسٹی مظفر پور میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی نگرانی میں رضی حیدر نامی جو طالب علم 'نظیر صدیقی —— حیات و خدمات' کے عنوان سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے کام کر رہے تھے انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ میں اس سرفرازی کے لئے خدا کا شکر گزار ہوں ویسے دل یہی کہتا ہے کہ میں اس سرفرازی کا اہل نہ تھا نہ ہوں۔ کیسے کیسے ارباب علم موجود ہیں جن پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا۔ میں نے رضی حیدر کو خط لکھا۔ لیکن ان کی طرف سے بھی کوئی جواب نہ آیا۔ آپ غالباً قمر اعظم ہاشمی کو جانتے ہوں گے۔

آپ ہرگز یہ تصور نہ کریں کہ آپ نے میری خودنوشت کی زبان کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ مجھ پر گراں گزرا۔ جواباً جو کچھ میں نے عرض کیا اس کا مقصد اپنی الجھنوں سے نجات حاصل کرنا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ آپ کی بدولت میری خودنوشت کو کیسے کیسے عظیم الشان قارئین مل رہے ہیں۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی نے میری خودنوشت پڑھ کر مجھے خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ وہ 'حسرت اظہار' بھی پڑھ چکے ہوں گے۔ فون پر ان کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے اور یہ کہ میں ان کے خط کا منتظر ہوں۔ ابوسفیان سے ملاقات ہوئی تو اتنا کہہ دیجئے کہ وہ جو ایک ہندوستانی اخبار کا

تراشہ بھیجنے والے تھے اس کا کیا ہوا۔ ممکن ہے وہ موسم گرما کی چھٹیوں میں کراچی آرہے ہوں۔

شادانی صاحب نے میری اور ارشد کی جگہ...... اور...... کو لے لیا تھا۔ عارضی Vacancies میں بھی وہ ایک سے ایک نااہل کا انتخاب کرتے رہے (۱)۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان لوگوں سے ان کی توقعات کیا تھیں اور وہ کہاں تک پوری ہوئیں۔ اتنا ضرور ہے کہ شعبے کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں۔ شعبہ نااہل اسٹاف کی بدولت بدنام ہوتا رہا۔ مجھے اور ارشد کو بھی چھوڑیئے ان کی مصلحتوں نے مجنوں گورکھپوری اور اختر اورینوی تک کو قبول نہ کیا۔ البتہ وہ اختر انصاری (علی گڑھ والے) اور قاضی عبدالودود کو لانا چاہتے تھے سو اختر انصاری ڈھاکے آنے پر آمادہ نہ ہو سکے اور قاضی عبدالودود کو ڈاکٹر عبدالحق کی مخالفت نے آنے نہ دیا۔ کلثوم ابوالبشر اور ام سلمٰی وغیرہ شاید ہی ان معاملات سے واقف ہوں۔ آج کل ڈھاکے کا شعبۂ اردو جن بنگالی خواتین سے عبارت ہے وہ شادانی صاحب کے ریٹائرمنٹ اور انتقال کے بعد بہت بعد میں آئی ہیں۔ نہ جانے آپ نے کلثوم کی پی-ایچ-ڈی کا مقالہ 'ڈاکٹر عندلیب شادانی' دیکھا کہ نہیں۔ اب تو یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ مجھے اس کتاب میں شادانی صاحب کے منحرف شاگردوں میں شمار کیا گیا ہے۔

محمود بھائی کے نام گاندھی جی کے خطوط کا مجموعہ اسلام آباد جاؤں گا تو ڈھونڈھ کر بھیج دوں گا۔

'یہ خبر سب لوگوں کے لئے باعث مسرت اور باعث فخر ہے کہ قرۃ العین حیدر کو ساہتیہ اکادمی کا فیلو منتخب کرایا گیا ہے۔ پاکستان میں ساہتیہ اکادمی جیسا باوقار ادارہ ایک بھی نہیں ہے۔ پہلا پاکستانی ادارہ جس نے ادبی انعامات کا سلسلہ شروع کیا تھا وہ پاکستان رائٹرز گلڈ تھا جس کا سب سے بڑا انعام دس ہزار روپے کا ہوتا تھا۔ وہ انعام بہت جلد دو دو لکھنے والوں میں تقسیم ہونے لگا یہاں تک کہ دس ہزار نہ صرف دو پانچ ہزار میں تقسیم ہوتا رہا بلکہ پانچ ہزار کو بھی ڈھائی ڈھائی ہزار میں تقسیم کر دیا گیا۔ صدر ضیا کے زمانے سے پاکستان اکیڈیمی آف لٹرز نے پاکستان رائٹرز گلڈ کی جگہ لے لی۔ اکیڈمی کے انعامات مالی اعتبار سے بڑے ہیں۔ مثلاً پہلا انعام چالیس ہزار کا ہے لیکن اس ادارے کو ساہتیہ اکادمی جیسا وقار حاصل نہیں ہے۔ ہندوستان میں علم و فضل کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے مقابلے میں پاکستان کی صورت حال نہایت افسوسناک ہے۔ اور سب بدستور۔

ممنون کرم

نظیر صدیقی

---

(۱) میرا خیال ہے کہ شادانی صاحب کے نزدیک اس وقت کے شعبۂ اردو کو نقاد و شاعر سے زیادہ اچھے استاد، مستعد اور منتظم اساتذہ کی ضرورت تھی جو شعبے کے علمی و تعلیمی مسائل اور انتظامی امور سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ ان کے منتخب کئے ہوئے لوگوں میں بعض نے دور دور تک شہرت حاصل کی۔

کراچی، ۱۷ر جون ۱۹۹۴ء

برادر مکرم، ڈاکٹر مختار الدین صاحب السلام علیکم

آپ کے لئے مندرجہ ذیل کتابیں بھیج رہا ہوں :-

(۱) A Letter box of an unknown man

(۲) Reflections on life and literature

(۳) حاصل سفر

میں مئی میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ اب کے بار میں نے آپ کی مطلوبہ کتاب ڈھونڈھی تو اس کی دو جلدیں مل گئیں (۱)۔ ایک جلد آپ کی نذر ہے اور ایک مشفق خواجہ صاحب کی نذر۔

دوسری کتاب میرے چند انگریزی مضامین کا مجموعہ ہے جو حال میں (اپریل میں) شائع ہوا ہے۔ تیسری کتاب میرے چھوٹے بھائی ذکی آذر مرحوم کا مجموعۂ کلام ہے جو ان کے خاندان والوں نے شائع کیا ہے۔ ذکی آذر بہت خوش فکر شاعر تھے گو شہرت سے محروم تھے۔

بچّو جعفری جن کا نام سید احمد جعفری تھا ان کی تاریخ وفات ۶ر اپریل ۱۹۶۱ء ہے۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ ڈھاکے کے کئی تعلیمی اداروں میں اردو کے لیکچرار رہے۔ علمی اور تدریسی صلاحیت تقریباً صفر تھی (۲)۔ البتہ ان کے دو بیٹے باصلاحیت نکلے۔ بڑا بیٹا امجد ہمدان پاکستان میں انگریزی کا مشہور صحافی ہے اور دوسرا بیٹا مسعود امجد کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں پروفیسر ہے۔

بچّو جعفری کے بھائی حامد جعفری سے میں بالکل واقف نہیں۔ میں نے بڑی مشکلوں سے بچّو جعفری کی تاریخ وفات معلوم کی ہے۔ اب حامد جعفری کی تاریخ وفات معلوم کرنے کا یارا نہیں۔ مشفق خواجہ سے کہوں گا کہ وہ معلوم کر کے بتائیں۔ میرا خیال ہے کہ بچّو جعفری کی طرح حامد صاحب بھی غیر ممتاز تھے (۳)۔

مشفق خواجہ صاحب بالکل بخیریت ہیں۔ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو نہایت اور عمدہ طریقے سے استعمال کر رہے ہیں۔ ''خامہ بگوش'' کے نام سے کالم نگاری دوبارہ شروع کر دی ہے۔ حسب معمول ان کے کالم ہندوستان میں بھی شائع ہو رہے ہیں۔

شجاع احمد زیبا (۴) ان دنوں بیمار ہیں۔ خواجہ صاحب کے ہاں بھی نہیں آ رہے ہیں۔ ایک ڈیڑھ ماہ قبل ہندوستان (امروہہ) گئے ہوئے تھے۔

عبدالغنی شمس صاحب (۵) کی خدمت میں دوبارہ حاضر نہ ہو سکا۔ کراچی میں ذاتی سواری نہ ہو تو جانا آنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ پروفیسر اختر امام (۶) کی وفات کی تاریخ آپ ان سے براہ راست معلوم کر لیں۔ جہاں تک مجھے علم

ہے مرحوم کی وفات پر پاکستان میں کوئی مضمون شائع نہیں ہوا۔ اہل پاکستان میں مختار مسعود ان سے واقف اور ان کے قائل ہیں (۷)۔ مگر وہ ان پر مضمون کیوں لکھیں؟

مقتدرہ میں جالبی صاحب کا عہدہ بحال ہو گیا۔ اب غالباً تین سال تک وہ ضرور رہیں گے۔ آپ ان سے براہ راست مراسلت کریں۔

مسعود احمد برکاتی صاحب پر دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ دو مہینے گھر پر آرام کرتے رہے۔ اب دفتر آنے لگے ہیں۔ مگر اب بھی ان کی صحت مکمل طور پر ٹھیک نہیں۔

انجمن کے رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ مالک رام نمبر بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں خواجہ صاحب سے بات کیجئے۔ اور حالات بدستور۔ اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیے۔ خوشی ہوئی کہ جذبی صاحب کو ایک بڑا انعام ملا۔ ان تک میری دلی مبارک باد پہونچائیے۔ ان کا بیٹا جو انگریزی میں ریڈر ہے، مجھ سے آشنا ہے۔ اس سے میری انگریزی کتاب کا ذکر کر دیجیے گا۔ یہ کتاب آزاد لائبریری میں بھی جا رہی ہے۔

آپ کا
نظیر صدیقی

---

(۱) بنگال کے محمود صاحب کے نام گاندھی جی کے ہندی خطوط کا مجموعہ۔

(۲) یحییٰ جعفری، ادیب و نقاد نہیں تھے لیکن بہت کامیاب اور شفیق استاد تھے۔ تاریخ اسلام اور متعدد موضوعات پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ خاندان علمائے صادق پور پٹنہ سے ان کا تعلق تھا۔ ۱۹۴۲ء کی ایک شام مجھے یاد آتی ہے۔ اہل علم کی ایک مجلس میں حشیشین کا ذکر آ گیا انھوں نے نزاریہ، الموت، حسن بن صباح، سلاجقہ، شیخ الجبلی اور ان کے قلعوں اور آخر میں حشیشین کی ہزیمت پر ایسی مسلسل رواں پُر معلومات گفتگو کی کہ ہم طالب علم ششدر رہ گئے۔ ان کے بھائی سید حامد جعفری میرے استاد تھے میٹرکولیشن میں ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ اس تعلق سے ہمارا اس خاندان سے علی گڑھ آنے تک گہرا ربط رہا۔

(۳) سید حیدر امام بار ایٹ لا، ام۔ایل۔اے (سنٹرل) اور بہار کے چند مسلم قائدین نے مسلمان طالب علموں کی آسانی کے لئے محلہ رمنہ کے قریب مسلم ہائی اسکول قائم کیا اور اس میں جہان آباد کے ایک سینیر استاد کو (جن کا نام بھول رہا ہوں) ہیڈ ماسٹر مقرر کیا۔ ان کے جانے کے بعد سید حامد جعفری صاحب نے اسکول کی نظامت سنبھالی۔ وہ جماعت یازدہم میں ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ بہت شریف، نیک اور نہایت مخلص انسان تھے اور ساتھ ہی ساتھ بہت اچھے منتظم اور کامیاب ہیڈ ماسٹر۔ ۱۹۴۳ء کے بعد ان سے رابطہ قائم نہ رہ سکا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان اور بعد کو کراچی منتقل ہو گئے۔ کوشش کے باوجود میں ان کے کوائف سے بے خبر رہا۔

(۴) شجاع احمد زیبا امروہہ کے رہنے والے تھے اور علی گڑھ میں مجھ سے بہت سینیر۔ میں اواخر ۱۹۴۳ء میں انٹرمیڈیٹ میں تھا اور وہ ایم۔اے اردو کی فائنل کلاس میں۔ اختر الایمان، محمود ہاشمی (کشمیر)، ملک حامد حسین (بستی۔یوپی)، وغیرہ ان کے ہم جماعت تھے۔ ۱۹۴۸ء۔۱۹۴۹ء میں رشید صاحب نے انھیں علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر اور مجھے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا۔ وہ چند مہینوں میں اپنے

اعزا سے ملنے کراچی گئے اور پھر وہیں کے ہو گئے۔ علی گڑھ سے دلی تعلق رکھنے والوں میں تھے۔ جب بھی کراچی سے امروہہ آتے تو علی گڑھ ضرور آتے۔ خورشید الاسلام صاحب کے ساتھ قیام کرتے، مجھ سے ملنے بھی آتے۔ میں کراچی جاتا تو مشفق خواجہ صاحب کے یہاں ہر جمعہ کو ان سے ملاقات ضرور ہوتی۔

(۵) سیع عبدالغنی بشس اردو کے مستند بزرگ شاعر۔ کرائے پرسرائے ضلع پٹنہ کے رہنے والے۔ مدرسۃ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے ممتاز طالب علم۔ تقسیم ہند کے بعد سے کراچی میں مقیم ہیں بڑے زود گو شاعر ہیں۔ ان کا کلام مرتب کیا جائے تو کئی مجموعے تیار ہو جائیں گے۔ میرے پاس ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت سی نظمیں محفوظ ہیں۔

(۶) سید اختر امام (۱۹۱۰-۱۹۹۳ء) ضلع پٹنہ کے مردم خیز گانو کرائے پر سرائے کے رہنے والے تھے۔ شمس العلماء، خان بہادر میر وحید الدین آزاد (مصنف، حدِ تحقیق) ان کے پرداد ا، نواب امداد امام اثر کے بھائی سید یوسف امام ان کے دادا تھے۔ سید وصی امام ان کے والد تھے۔ علی گڑھ آ کر اسکول کے ابتدائی درجوں میں داخل ہوئے اور یہاں سے ۱۹۳۶ء میں عربی میں ایم-اے کر کے نکلے۔ علامہ عبدالعزیز میمن، ڈاکٹر عابد احمد علی اور مولانا بدر الدین علوی ان کے اساتذہ میں تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی گئے۔ ڈاکٹر اوٹو اشپیز کی نگرانی میں انھوں نے ۱۹۳۹ء میں بون یونیورسٹی سے پی-ایچ-ڈی کیا۔ کلکتہ یونیورسٹی میں عربی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد سیلون یونیورسٹی میں صدر شعبۂ عربی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا خاندان کراچی منتقل ہو گیا۔ وہ کئی سال تک وزارت خارجہ سے منسلک رہنے کے بعد سیلون یونیورسٹی واپس چلے گئے۔ انھوں نے لنکا کی شہریت حاصل کی اور اس کے شہر کینڈی (Kandy) میں سکونت پذیر ہو گئے۔ انھوں نے کراچی میں ۴؍ستمبر ۱۹۹۴ء کو وفات پائی۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ مکتوبات اختر امام ان کے بھائی ڈاکٹر سید قیصر امام نے کراچی سے شائع کر دیا ہے۔

(۷) مختار مسعود صاحب اور ڈاکٹر اختر امام دونوں علی گڑھ کے پروردہ و تعلیم یافتہ ہیں۔ دونوں نے اپنی زندگی کا خاصا حصہ علی گڑھ میں گزارا۔ مختار مسعود صاحب اب بھی علی گڑھ والوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔

(9)

کراچی

۱۰؍نومبر ۱۹۹۴ء

برادرِ مکرم، السلام علیکم

آپ کے خط مورخہ ۲۳؍جولائی کا جواب لکھنے والا تھا کہ طاعون کی وبا کے باعث دونوں ملکوں کے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔ اب ۱۰؍نومبر سے دونوں ملکوں کے درمیان ٹرین چلنے والی ہے۔ ۶؍نومبر سے پی-آئی-اے کی پروازیں بھی بحال ہونے والی تھیں۔ غالباً ہو چکی ہوں گی۔ امید ہے کہ طاعونی وبا سے علی گڑھ مکمل طور پر محفوظ رہا ہوگا۔

حکیم نعیم الدین زبیری صاحب سے تین چار دن پہلے ملاقات ہو گئی تھی۔ انہیں آپ کا خط مل چکا ہے (۱)۔

معلوم نہیں میری انگریزی کتاب (۲) ہندوستان میں اور خصوصاً علی گڑھ میں کن لوگوں تک پہنچ سکی۔ آپ کے سوا کسی نے رسید نہیں دی۔ زحمت تو ہوگی لیکن اگر ممکن ہو تو شروانی صاحب، اسلوب احمد انصاری، سرور صاحب،

ابوالکلام قاسمی، فسیح احمد صدیقی، شہریار اور مولانا آزاد لائبریری کے لائبریرین صاحب سے بشرط سہولت معلوم کر کے بتایئے گا کہ ان حضرات کو میری کتاب ملی یا نہیں۔

گوپی چند نارنگ اور ابوالکلام قاسمی کی کتابوں پر میرے تبصرے شائع ہوئے تھے۔ ان کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔ اگر آپ کے ذریعے ان تک یہ تبصرے پہنچ جائیں تو ممنون ہوں گا۔

میری انگریزی ہے تو پاکستانی ہی لیکن اس کی داد کچھ معتبر لوگوں سے مل رہی ہے۔ الطاف گوہر جنھیں میں پاکستان کے پانچ بہترین انگریزی لکھنے والوں میں شمار کرتا ہوں ذاتی تعلقات کے نہ ہونے کے باوجود انہوں نے میری انگریزی میں روانی اور اسلوب کی نشاندہی کی ہے۔ ابھی حال میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ آپ کی انگریزی صاف، رواں اور جاندار ہے۔ انگریزی کا ایک ادیب کولن ولسن (۳) جو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے میری انگریزی تحریروں کے لئے ایک مرتبہ Absolutely fascinating اور دوسری مرتبہ Marvellous کا لفظ استعمال کر چکا ہے۔ ویسے اندر کی بات یہ ہے کہ مجھے تو اردو لکھنے اور بولنے پر بھی اتنی قدرت نہیں ہے جتنی اچھے اہل زبان کو ہوتی ہے۔ اسے آپ خاکساری پر محمول نہ کریں۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ میں چھپرہ (بہار) کے ایک دیہات کا رہنے والا ہوں اور میری تعلیم بہت ناقص ہوئی ہے۔

خوشی ہوئی کہ آپ کو حاصل سفر کے متعدد اشعار پسند آئے۔ ہاں میرا خیال ہے کہ ذکی نے اپنے اس شعر میں:

خواب تم نے دیکھے تھے درد ہم نے جھیلے ہیں

خواب دیکھنے والے کاش تم یہاں ہوتے

ہندوستانی مسلمانوں، پاکستانی مہاجروں اور مقبوضہ کشمیریوں کی بھرپور ترجمانی کردی ہے۔

یہاں تک لکھنے کے بعد خیال آیا کہ میں آپ کے خط کا جواب بھیج چکا ہوں لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب دونوں ملکوں کے درمیان ٹرین اور ہوائی جہاز کی آمد و رفت بند ہونے والی تھی۔ نہ جانے وہ خط آپ تک پہنچا کہ نہیں۔ اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کی فرمائش پر میں نے محمود بھائی کے مختصر حالات (جو میری کتاب 'سویہ ہے اپنی زندگی' میں بھی درج ہیں) لکھ بھیجے تھے۔

ڈاکٹر نارنگ اور ابوالکلام قاسمی کی کتابوں پر میرے جو تبصرے شائع ہوئے ہیں ان کی فوٹو کاپیاں بھیج رہا ہوں۔ ابوالکلام قاسمی کو تو آپ خود شعبۂ اردو میں دے دیں گے۔ ڈاکٹر نارنگ کے نام یہ تبصرہ پوسٹ کردیں۔ ان دونوں حضرات میں سے کسی نے کتاب میرے پاس نہیں بھیجی۔ میں نے مشفق خواجہ سے کتابیں لے کر یہ کار خیر کرڈالا۔

خواجہ صاحب بخیریت ہیں۔ ان کے کالموں کا مجموعہ (۴) طباعت کے لئے ہندوستان جاچکا ہے اور وہ یگانہ پر اپنا کام مکمل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

باقی باقی۔ امید ہے کہ آپ سب لوگ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا

نظیر صدیقی

---

(۱) ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی نے الصابی کی تصنیف کتاب التاجی مرتبہ ڈاکٹر محمد صابر خاں (کلکتہ) شائع کی تھی، خط اسی سلسلے میں لکھا گیا تھا۔

(۲) Reflection on life and Literature (شاہد پبلی کیشنز، اسلام آباد، اپریل ۱۹۹۲ء) گیارہ انگریزی مضامین کا مجموعہ جو ادبی اور فلسفیانہ موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔

(۳) Collin Wilson انگریزی زبان کا ایک معاصر ادبی نقاد جسے ڈاکٹر وزیر آغا بیسویں صدی کے تین سب سے بڑے مصنفوں میں شمار کرتے ہیں۔ کولن ولسن، نظیر صدیقی کے بیحد پسندیدہ ادیبوں میں ہیں۔ انھوں نے ۱۹۷۰ء میں ان پر ایک طویل مضمون لکھ کر اردو دنیا میں انھیں متعارف کرایا۔ اس مصنف پر ان کا دوسرا مضمون ان کے انگریزی کالموں کے مجموعے Views and Reviews (کراچی، ستمبر ۱۹۹۴ء) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۴) ''خامہ بگوش کے قلم سے'' مرتبہ مظفر علی سید (م-۲۰۰۰ء) ۱۹۸۳ تا ۱۹۹۰ء کے طنزیہ مزاحیہ کالموں کا انتخاب، شائع کردہ مکتبۂ جامعہ نئی دہلی-۱۹۹۵ء۔

(10)

House 1915, street 10
Sector 9-10/2
Islamabad.

۱۳/اپریل ۱۹۹۵ء

برادر مکرم، السلام علیکم

میرے نام آپ کا خط مورخہ ۷/مارچ اور آپ کے نام گوپی چند نارنگ کے خط کی عکسی نقل مشفق خواجہ صاحب کے ذریعے ۲/اپریل کو مل گئی تھی۔ مکروہات زندگی کے باعث جواب تاخیر سے جا رہا ہے۔ اس خط کے ساتھ دوسروں کے نام تین خط ہیں۔ براہ کرم انہیں پوسٹ کر دیجئے گا... یہ شخص تو عجیب و غریب نکلا۔ برسوں سے میرے ساتھ انتہائی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتا رہا اور جب میں نے ایک ذمہ داری اس کے سپرد کی جسے اس نے بہ رضا و رغبت قبول کیا تو اس میں انتہائی غیر ذمے داری کا ثبوت دے بیٹھا۔ آج تک یہ بھی پتا نہ چلا کہ اس کے ہاتھ جو چار پانچ کتابیں بھیجی تھیں وہ پہنچیں یا نہیں۔ پروفیسر ریاض بڑی محبت سے باقاعدگی کے ساتھ مجھے خط لکھتے تھے یا کم از کم مستعدی کے ساتھ میرے خط کا جواب دیتے تھے۔ اب انہوں نے بھی اس کار خیر سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ان کے لئے اپنی نئی کتاب To Prof. Nazeer Siddiqi خواجہ صاحب کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ نہ بھجوا سکے۔ میں خواجہ صاحب کے پاس مولانا آزاد لائبریری کے لئے بھی اپنی تین نئی کتابیں چھوڑ آیا تھا۔ اگر آپ

لائبریرین سے معلوم کر کے بتادیں کہ ان کے پاس میری تین کتابیں (دو انگریزی کی جو آپ کے پاس پہنچیں اور تیسری 'حسرت اظہار') پہنچیں کہ نہیں تو بڑا کرم ہوگا۔

جب آپ کی وساطت سے ڈاکٹر نارنگ کی کتاب پر میرا تبصرہ ان کے پاس پہنچا تھا تو انہوں نے ایک بہت اچھا خط لکھا تھا جس میں میرے تبصرے کے لئے نہایت پرجوش شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے میری انگریزی کو قابل رشک قرار دیا تھا۔ آپ کے نام جو خط ہے اس میں انھوں نے میری انگریزی کو ستھری انگریزی کہا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ جنھوں نے امریکن یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی (۱) ہے اور جو خود بھی انگریزی کے ادیب ہیں ان کی یہ رائیں بہت وقیع ہیں۔ اگر اسلوب احمد انصاری (۲) کی رائے معلوم ہو سکے تو وہ مستند ہوگی۔ آپ اپنے طور پر معلوم کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ پروفیسر ریاض اور پروفیسر انصاری کو میری دونوں کتابیں پڑھوا کر ان کے تھوڑے بہت تاثرات معلوم کرلیں گے۔ ایسے لوگوں کی رائیں میرے لئے بڑے انعام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پاکستان میں کسی قسم کی لابی سے تعلق نہ رکھنے کے باعث میں بالکل نظر انداز قسم کا رائٹر ہو کر رہ گیا ہوں۔ نہ سرکاری حلقے میں میری کوئی Recognition ہے نہ ادبی حلقوں میں۔ مجھے اس کا غم نہیں ہے لیکن اس صورت حال کا احساس ضرور ہے۔ ہندوستان زیادہ ادب نواز اور ادیب نواز ملک ہے۔

کولن ولسن پر ۱۹۷۰ء میں میرا ایک طویل تعارفی مضمون رسالہ 'اردو' میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت مشفق خواجہ اس کے ایڈیٹر تھے۔ وہ مضمون میری کتاب 'اردو ادب کے مغربی دریچے' میں شامل ہے۔

گزشتہ تین سال کے دوران میرے ذاتی حالات اتنے نامساعد رہے ہیں کہ 'نیا دور' جیسے رسالے کے لئے کوئی ڈھب کی چیز لکھنا ممکن نہ ہو سکا (۳)۔ انگریزی میں کالم نگاری کی بدولت مالی حالت غنیمت رہی ہے۔

پچھلے سال (۱۹۹۴ء) فروری میں میں نے اپنی بڑی بیٹی کی شادی یوپی کے ایک گھرانے میں کردی تھی۔ نومبر ۹۴ء میں ایک بچی پیدا ہوئی ہے۔ میری بیٹی ڈاکٹر ہے۔ اس کے پاس وقت نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کی پرورش کر سکے۔ میری بیوی آج کل کچھ زیادہ ہی بیمار ہے۔ نتیجہ یہ کہ بیوی اور بچی دونوں کی دیکھ بھال میری ذمہ داری بن گئی ہے۔ اس لحاظ سے زندگی کے مشکل ترین دور سے گزر رہا ہوں۔ یہاں تادم تحریر کوئی ملازمت نہیں مل سکی ہے۔ کالم نگاری اور پنشن (جو معمولی ہے) کو ملا کر کام چل رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی عمر اور روز افزوں تردّدات کے باعث تاب توانائی میں کمی آتی جارہی ہے۔ نتیجتاً زندگی کے Strain & Stress کا مقابلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

ابو الکلام قاسمی نے میرے تبصرے کے جواب میں کوئی خط نہیں لکھا۔ خورشید الاسلام کے بارے میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ روبہ صحت ہیں۔ میری کتاب 'تاثرات و تعصبات' کبھی ان کی نظر سے گزری تھی۔ جب سے میرے بارے میں وہ ایک اچھی رائے رکھتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے خطوط جو آل احمد سرور کے نام ہیں ان کی ایک جلد بھجوانے کی کوشش کیجئے گا۔ 'ماہِ نو' ایک مدّت سے میرے پاس نہیں آتا۔ اس لئے معلوم نہیں کہ آج کل اس کا ایڈیٹر کون ہے۔ مقتدرہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے بعد افتخار عارف ان کے جانشین مقرر ہوئے ہیں۔ ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا حال معلوم نہیں۔

اور سب بدستور۔ آپ کی طرف سے ایک طویل خط کا انتظار رہے گا۔ میں گھریلو حالات و مسائل کے زیرِ اثر فروری میں کراچی سے اسلام آباد واپس آ گیا۔

آپ کا
نظیر صدیقی

---

(۱) نارنگ صاحب امریکی یونیورسٹیوں کے طالب علم نہیں وہاں استاد رہے ہیں۔ وہ برسوں وسکونسن یونیورسٹی اور بعض دوسرے مقامات پر روس اور امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں لکچر دیتے رہے ہیں۔

(۲) میں نے اسلوب صاحب سے نظیر صدیقی کی انگریزی کے بارے میں بوجوہ ان کی رائے نہیں پوچھی لیکن انھوں نے متعدد موقعوں پر ان کے اردو انشائیوں کی مجھ سے تعریف کی۔ وہ انھیں اچھا انشا پرداز سمجھتے ہیں۔ ان کی کتاب ''شہرت کی خاطر'' انھیں پسند ہے اور اپنی پسندیدگی کا مجھ سے کئی بار ذکر کر چکے ہیں۔ ان کی دوسری کتاب تاثرات و تعصبات پر انھوں نے ایک مضمون بھی لکھا ہے۔

(۳) نیا دور (لکھنؤ) کے ایک دو شمارے میں نے انھیں بھیجے تھے۔ انھوں نے پسند کیا۔ وہ چاہتے تھے یہ رسالہ پابندی سے انھیں بھیجا جاتا رہے۔ میں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ اس کے لئے کوئی مضمون لکھ کر بھیجیں رسالہ آپ کو برابر ملتا رہے گا۔ وہ ''یہ نہیں کر سکے، میں'' یہ نہیں کر سکا۔

(11)

اسلام آباد
۲۶ ر جون ۱۹۹۵ء

بھائی مختار الدین صاحب، السلام علیکم

کچھ یاد ہے کہ آپ پر میرے خط کا جواب کتنے عرصے سے باقی ہے؟ پھر بھی میں آپ کے جواب کو اپنا حق تصور نہیں کرتا بلکہ اسے ہمیشہ ایک عطیہ سمجھتا ہوں۔

آج کل خطوں پر ہی جی رہا ہوں۔ ایک ڈیڑھ ماہ سے طبیعت بھی ناساز رہی۔ ایک نہایت عزیز دوست کی وفات نے بھی بڑا غم ڈھایا ہے۔ وہ افسر ماہ پوری تھے جو ۱۵ ر فروری کو داغ مفارقت دے گئے۔ ماہ پور ضلع چھپرا کی ایک بستی ہے۔

براہ کرم ڈاکٹر فصیح سے بھی فون پر کہئے کہ مجھے ان کے جوابی خط کا شدید انتظار رہتا ہے۔

اگر میری کتابوں کو دیکھنے کا وقت ملا ہو تو کچھ ان کے بارے میں گفتگو کیجئے یا اگر آپ کی بدولت دوسروں کو

ان کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہو تو انہی کے ردعمل (خواہ وہ کتنا ہی غیر موافقانہ کیوں نہ ہو) سے مطلع کیجیے۔
کیا علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام اکتوبر میں رشید احمد صدیقی پر کسی بین الاقوامی سیمینار کا امکان ہے؟
خدا کرے آپ سب لوگ بخیریت ہوں۔ خواجہ صاحب کے تازہ خط سے ان کی خیریت معلوم ہوئی۔

آپ کا
نظیر صدیقی

اسلام آباد
(12)
۱۵/اگست ۱۹۹۵ء

برادر مکرم، السلام علیکم

کوئی آٹھ نو مہینے کے بعد آپ کا خط مورخہ ۲۱/جولائی ڈاکٹر نجم الاسلام کے ذریعے ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے ڈاکٹر توصیف تبسم کے ذریعے میرے نام خط، اسلوب انصاری صاحب کا رسالہ 'نقد و نظر' اور مکتوبات مطبوعہ رسالہ 'تحقیق' حیدر آباد بھیجے۔ آپ کے موجودہ خط کے ملنے سے پہلے گزشتہ ایک ماہ کے دوران میں دو مرتبہ ڈاکٹر توصیف تبسم سے ملا مگر انہوں نے اپنے علی گڑھ جانے، آپ سے ملنے اور میرے لئے آپ کی ارسال کردہ چیزوں کا ذکر تک نہیں کیا۔ اب جو میں نے فون پر آپ کے موجودہ خط کے حوالے سے گفتگو کی تو کہنے لگے کہ جو خاتون ہندوستان سے آنے والی ہیں وہ ابھی تک نہیں آئیں۔ جب وہ آئیں گی تو آپ کے نام جو کچھ ہے وہ مل جائے گا۔

آپ نے میرے خط مورخہ ۱۳/اپریل کا جو جواب ۴/مئی کو بھیجا تھا وہ بھی مجھے نہیں ملا۔ آپ کے خطوط کے نہ ملنے کے باعث میں آپ کو اپنے خطوط کے جوابات کا مقروض سمجھتا رہا ورنہ مجھے اندازہ ہے کہ آپ حتی الامکان جواب جلد دیتے ہیں۔

افسر ماہ پوری سے کراچی میں آپ کی ملاقات (انجم اعظمی کے ہاں) سمجھ میں آئی لیکن دہلی میں ان سے آپ کا ملنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ افسر تو کبھی دہلی گئے ہی نہیں (۱)۔ البتہ کلیم سہسرامی کراچی اور لاہور آتے جاتے رہے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر نعیم احمد کا خط میرے نام آیا تھا۔ وہ خط رشید احمد صدیقی کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کا دعوت نامہ تھا۔ پتے کی غلطی سے وہ خط میرے کراچی کے پتے پر چلا گیا تھا۔ کسی نے وہاں سے اسے یہاں بھیج دیا۔ میں نے اپنی شرکت کی رضامندی اس شرط کے ساتھ بھیج دی ہے کہ اگر مجھے اسلام آباد سے علی گڑھ تک کا سفر خرچ (جس میں ہوائی جہاز، ریل اور ٹیکسی وغیرہ کا سفر شامل ہے) ملے گا تو علی گڑھ آسکوں گا۔ سفر خرچ کے ملنے کی صورت یہ ہونی چاہئے کہ ادھر سے تو میں اپنے خرچ پر سفر کروں گا لیکن علی گڑھ پہنچنے کے بعد میرے دہرے سفر (واپسی کا سفر سمیت) میرے اخراجات Reimburse ہو جانا چاہئے۔ یہ بات اس لئے لکھنی

پڑی کہ ڈاکٹر نعیم نے لکھا تھا کہ ہمارے وسائل محدود ہیں لہذا آپ کوشش کریں کہ اکیڈمی آف لٹرز جیسے ادارے سے یا اپنی یونیورسٹی (وہ مجھے ابھی تک یونیورسٹی میں برسر روزگار سمجھ رہے ہیں) سے سفر خرچ لے کر آئیں۔ یہاں صرف ایک ادارہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اس طرح کی مدد کر سکتا تھا۔ کیوں کہ ایک زمانے تک اس طرح کی ثقافتی مدد کا ایک فنڈ تھا۔ اب ایک مدت سے موجودہ وزیراعظم نے اس فنڈ کو ختم کر دیا۔ میں نے ڈاکٹر نعیم کے نام خط ۱۵ر جولائی کو بھیجا تھا۔ جواب ابھی تک نہیں آیا۔ میں نے گزارش کی تھی کہ جواب حتی الامکان جلد دیں اور مقالے کے موضوعات کے بارے میں ضروری ہدایات بھیجیں تاکہ مقالہ لکھنے کی تیاری کی جا سکے۔ وقت کم رہ گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ڈاکٹر نعیم کا جواب کب آتا ہے اور کیا آتا ہے۔ اگر میں خوش حال ہوتا تو سفر کا سارا خرچ برضا و رغبت برداشت کر لیتا لیکن آپ جانتے ہیں میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی کا خط ڈاکٹر نعیم کے خط سے پہلے آیا تھا۔ انہوں نے اپنے خط میں اصرار کیا تھا کہ مجھے رشید صاحب کی صد سالہ تقریبات میں ضرور آنا ہے۔ اول تو رشید صاحب کے کارناموں سے مجھے جو محبت اور عقیدت رہی ہے وہ مجھے علی گڑھ جانے پر اکسا رہی ہے۔ دوسرے یہ خیال بھی اکسا رہا ہے کہ بہت ممکن ہے یہ میری زندگی کا آخری ہندوستانی سفر ہو لہذا اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ ابھی یہ نہیں معلوم کہ اکتوبر تک یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کس شکل میں ہوں گے۔ ہندوستان جانے کا ویزا ملے گا یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ خود پاکستان کے حالات کون اچھے ہیں۔

اگر یہ خط آپ تک پہنچ جائے تو ڈاکٹر نعیم کو یہ ساری باتیں بتا دیجئے گا۔ ڈاکٹر فصیح کو بھی ان امور سے مطلع کر دیجئے گا۔ وہ بھی ایک مدت سے میرے خط کے جواب کے مقروض ہیں۔ ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی کا خط بھی آیا تھا۔ میں نے اس کا جواب بھی بھیج دیا تھا۔ ذرا فون پر بتا دیجئے گا۔

میاں حامد گورکھپوری پھر میری زندگی سے غائب ہو گئے۔ کئی خط لکھے۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ انسانی تعلقات انسانی زندگی سے بھی زیادہ ناقابلِ اعتبار اور ناپائدار ہوتے ہیں۔ ادھر ایک مدت سے مشفق خواجہ کا خط بھی نہیں آ رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کراچی کے حالات بہت خراب ہیں اور وہ ایک مخدوش محلے میں رہتے ہیں۔ تاہم کراچی سے میرے نام خط آتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ میری انگریزی تحریروں کو کولن ولسن جیسے بین الاقوامی شہرت کے ممتاز ادیب نے سراہا ہے۔ بعض نے انگریزی پر میری قدرت کا اعتراف کیا ہے تاہم میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی رائے جاننے کا آرزومند رہا ہوں۔ میری نظر میں ان کی رائے کی بڑی وقعت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی رائے جاننے کی کوئی معقول صورت کیا ہو سکتی ہے۔ میری کتابیں بھی ان تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔ اگر میں علی گڑھ آ سکا تو لیتا آؤں گا۔ اگر آپ نے ان کو میری کتابیں پڑھوا دی ہیں اور اگر انہوں نے برسبیل تذکرہ کوئی رائے ظاہر کی ہے تو مجھے ضرور بتائیے۔ آپ اس

پوزیشن میں ہیں کہ ان سے میرے بارے میں ان کی رائے پوچھ بھی سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کسی خط میں عرض کر چکا ہوں میں فروری ۹۵ء میں کراچی کی ملازمتوں سے مستعفی ہو کر یہاں آ گیا۔ یہاں آنے میں یہاں کے حالات و مسائل کو دخل رہا ہے۔ لیکن یہاں ابھی تک نہ کوئی ملازمت مل سکی ہے نہ ملنے کے آثار نظر آتے ہیں۔ صرف ایک انگریزی اخبار "نیوز" کے ہفتہ وار کالم پر گزارا ہے۔ یہ اخبار راولپنڈی، لاہور اور کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ میرا کالم بھی تینوں ایڈیشنوں میں ہوتا ہے۔ انگریزی کالم نگاری نے میری Survival کو ممکن بنا دیا ہے لیکن میں اردو ادب سے کٹ گیا ہوں۔ کن کن باتوں کا رونا رویا جائے۔

زندگی جس کی ہے فقط رونا
وہ ہمارا خدا ہے کیا کہیے

پاکستان کے ایک نئے سہ ماہی ادبی رسالہ 'بادبان' کراچی میں آل احمد سرور کی خود نوشت پر اسلوب احمد انصاری کا تبصرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے بڑا سخت تبصرہ لکھا ہے۔ افسوس ہے کہ ارباب قلم کے باہمی تعلقات بھی خوش گوار نہیں رہتے۔ ایسا لگتا ہے کہ سرور صاحب کی شخصیت بوجوہ نامقبول شخصیت ہے (۲)۔

ہندوستانی ارباب قلم کے لئے میں اپنی جو کتابیں مشفق خواجہ صاحب کو دے آیا تھا ان میں پچاس فی صد کتابیں ہنوز انھیں کے پاس پڑی ہوئی ہیں (۳)۔ مجھے ٹھیک سے معلوم بھی نہیں کہ وہ پچاس فی صد کس کس کے نام ہیں۔ ممکن ہے اسلوب صاحب کے نام کی کتابیں بھی انہی کے کمرے میں بند پڑی ہوں۔ آپ کے پاس جو کتابیں ہیں وہ ان کے پاس بھجوا کر پڑھوا دیں تو بہتر۔

اور کیا عرض کروں۔ جواب حتی الوسع جلد عنایت کیجئے گا۔

آپ کا
نظیر صدیقی

---

(۱) مجھ سے سہو ہوا۔ جن سے دہلی میں میری ملاقات ہوئی وہ بنگلہ دیش کے دوسرے ادیب شام بارک پوری تھے افسر ماہ پوری نہیں۔ شام صاحب ڈاکٹر کلیم سہسرامی کے ساتھ اواخر دسمبر ۱۹۸۰ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے۔

(۲) میں نے پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب سے نظیر صدیقی صاحب کی انگریزی تحریروں کے بارے میں، اُن کے اصرار کے باوجود، ان کی رائے نہیں پوچھی۔ اس کا امکان تھا کہ ان کی رائے الطاف گوہر اور کولن ولسن وغیرہ کی رایوں سے مختلف ہو۔ اشخاص کے بارے میں رایوں کا اختلاف ہمیشہ ممکن ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک پروفیسر آل احمد سرور مقبول ہی نہیں وہ ان کی محبوب شخصیتوں میں تھے۔ کچھ لوگ ان سے غیر مطمئن تھے، کچھ ناراض۔

(۳) مشفق خواجہ صاحب نے مولوی عبدالحق کے نام پر علی گڑھ، رام پور اور خدا بخش پٹنہ کے کتب خانوں میں علحدہ سیکشن قائم کروا دیے ہیں اور ان کے لئے وہ وقتاً فوقتاً اردو کی اہم کتابیں خرید کر بھیجتے رہے ہیں۔ وہ دیر سویر اپنے احباب کی کتابیں بھی ارسال کرتے رہے ہیں۔ کبھی کبھی شرق اردن، سعودی عربیہ کے سفرا اور کراچی کے قیام کے دوران سینکڑوں کتابیں میرے پاس جمع ہو جاتی تھیں۔ خواجہ صاحب میری آسانی کے لئے یہ کتابیں اپنے یہاں رکھ لیتے تھے اور پیکٹ بنوا کر ڈاک سے بھیج دیتے تھے۔ ایسی محبت کرنے والے لوگ اب خال خال ہیں۔

اسلام آباد

[اواخر فروری ۱۹۹۶ء]

برادر مکرم، السلام علیکم

عنایت نامہ مورخہ ۲۳ر نومبر ۹۵ء کا مجھے ۱۱/ جنوری کو ملا تھا۔ بوجوہ جواب خاصی تاخیر سے جا رہا ہے۔ آپ سے سلسلۂ مراسلت اس وقت سے ٹوٹا ہوا ہے جب آپ نے ڈاکٹر توصیف تبسم کے ذریعے میرے لئے دو ایک رسالے بھیجے تھے۔ شاید کوئی اور چیز بھی تھی۔ توصیف تبسم وہ چیزیں نہ لا سکے اور یہ کام انہوں نے اپنی جن عزیزہ کے سپرد کیا وہ بھی اس ذمے داری کے بوجھ کو نہ اٹھا سکیں۔ تبسم صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ اب وہ چیزیں ڈاکٹر مختار الدین کو واپس مل جائیں گی۔ نہ جانے آپ کو واپس ملیں یا نہیں (۱)۔ آپ نے جو خط لکھا وہ مجھے نہیں ملا۔

شروانی صاحب کے خط سے آپ کی علالت کی اطلاع ملی تھی۔ شکر ہے کہ صحت یاب ہو کر آپ نے مجھے خط کے ذریعے یاد کیا۔ مجھے کراچی سے واپس آئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو رہا ہے۔ اس دوران میں میں گھر کے جھمیلوں میں اتنا مصروف اور منتشر الحواس رہا ہوں کہ آپ کو اور بعض دوسرے کرم فرماؤں کو خط نہ لکھ سکا۔ رشید احمد صدیقی کی صدی تقریبات میں شریک نہ ہو سکنے کے باعث آپ لوگوں سے ملاقات کا ایک نہایت اہم موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

ریٹائرمنٹ (اکتوبر ۱۹۹۰ء) کے بعد میرے حالات کچھ زیادہ ہی سخت رہے ہیں۔ لہٰذا اردو میں لکھنا تقریباً ترک ہو چکا ہے۔ کسبِ معاش کے لئے انگریزی اخبار ''دی نیوز'' (راولپنڈی، لاہور اور کراچی) میں ہر ہفتے (بدھ کے دن) ایک مضمون لکھتا رہا ہوں۔

جنوری کے پہلے ہفتے میں مشفق خواجہ اسلام آباد آئے تھے۔ وہ جس دن یہاں سے واپس گئے اسی دن آپ کا موجودہ خط ملا۔

اقبال اکیڈمی لاہور نے میری ایک انگریزی کتاب (انگریزی میں یہ پانچویں کتاب ہوئی) شائع کی ہے۔ Iqbal: In his varied aspects۔ اگر آپ ڈاکٹر وحید قریشی کو خط لکھ کر ایک جلد منگوا لیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔

رشید احمد صدیقی والے سیمینار کا حال دوبارہ لکھ بھیجیں تو عنایت ہوگی۔ پاکستان سے کوئی بھی نہ جا سکا۔ خالد شمس الحسن صاحب سے میری ملاقات غالباً کبھی نہیں ہوئی (۲)۔ خدا مغفرت کرے۔

آپ کا

نظیر صدیقی

(۱) توصیف تبسم صاحب میرے مہربان دوستوں میں ہیں۔ میری درخواست پر کتابیں اور کتابوں کے عکس بھیجتے رہتے ہیں۔ ان کی ہمشیر کا سفر پاکستان کسی وجہ سے التوا میں پڑ گیا اس لئے نظیر صدیقی کو یہاں کی مطبوعات نہیں مل سکیں۔

(۲) میں نے انھیں لکھا کہ کراچی میں، وہ اگر آپ خالد حسن صاحب سے نہیں ملے تو کراچی میں آپ نے سارا وقت ضائع کیا۔

اسلام آباد

(14)

۲۹ر مئی ۱۹۹۶ء

برادر مکرم، ڈاکٹر مختار الدین السلام علیکم

مشفق خواجہ کے ذریعے آپ کا خط مورخہ ۲ر مارچ ملا تھا۔ صحت کی زوال پذیری کے باعث جواب نہ لکھ سکا۔ ادھر دو تین مہینے سے طبیعت ناساز چلی جارہی ہے۔ Low Blood Pressure اگر چہ زیادہ نہیں پھر بھی اس کی وجہ سے ایسی کمزوری رہتی ہے کہ کسی بھی کام پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی۔ ثقل سماعت کا مسئلہ الگ دامن گیر ہے۔ بہر حال اب یہ سب تو ہونا ہی ہے۔

ایک مدت سے —— رشید احمد صدیقی سیمینار کے بعد سے —— ڈاکٹر فصیح کا کوئی خط نہیں آیا۔ امریکہ جانے والے تھے۔ نہ جانے گئے یا اب جانے والے ہیں۔ ان سے فون پر میرا سلام کہئے اور یہ کہ خیرات زکوٰۃ کے طور پر ایک آدھ خط سے نوازتے رہیں تو کیا حرج ہوگا۔

آپ کے پاس رشید صاحب کے خطوط کا جو ذخیرہ ہے اسے آپ کب تک شائع کریں گے؟

آل احمد سرور کے بارے میں گزشتہ تین سال سے سنتا آرہا ہوں کہ وہ اپنے نام رشید صاحب کے خطوط شائع کرنے والے ہیں۔ غالباً انہوں نے بھی اب تک شائع نہیں کئے۔

میں پروفیسر نعیم اختر (۱) سے واقف نہیں تھا۔ شہریار (۲) سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہئے اور صدر نشینی پر مبارکباد۔ اپنی خیریت اور کوائف سے مطلع کیجئے۔

مخلص

نظیر صدیقی

(۱) پروفیسر نعیم احمد سابق صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی۔ مکتوب نگار نام لکھنے میں احتیاط نہیں کرتے تھے۔ کچھ کا کچھ کر دیتے تھے۔

(۲) ڈاکٹر شہریار منفرد رنگ کے مقبول ترین شاعر اور شعبہ اردو کے استاد جو نعیم احمد مرحوم کی وفات کے بعد صدر شعبہ ہوئے۔ اب متقاعد ہو کر علی گڑھ ہی میں مقیم ہیں۔

اسلام آباد

۱۹ راگست ۹۶ء

برادر مکرم، السلام علیکم

طویل مدت کے بعد عنایت نامہ مورخہ ۲۷/ جون خواجہ صاحب کے ذریعے ملا۔ اس دوران میں علی گڑھ سے کسی اور کا بھی خط نہیں آیا کہ آپ کی خیریت معلوم ہوتی۔ امید ہے کہ اب آپ کی صحت بحال ہو چکی ہوگی۔ ہم لوگ عمر کی جس منزل سے گزر رہے ہیں وہ صحت سے زیادہ عدم صحت کا دور ہے۔

اب کے بار آپ نے مشاہیر علی گڑھ کے بارے میں جو اطلاعات دی ہیں وہ دل چسپ بھی ہیں اور اہم بھی۔ ہندوستان میں آج بھی اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی پذیرائی اور قدردانی ہمارے وطن عزیز سے کہیں زیادہ ہے۔ وہاں میری عمر اور میری کارکردگی کا شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر ایسا ہوگا جسے ایک سے زائد بار حکومت نے نہ نوازا ہو۔ یہاں بھی مجھ سے کم تر درجے کے لکھنے والے نوازے جا چکے ہیں۔ چونکہ دنیوی نعمتوں میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے اس لئے

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

آپ کا یہ جملہ "نظیر صاحب آپ خواہ مخواہ کومیلا (کومیلا سے میرا تعلق کبھی نہیں رہا۔ میری زندگی ڈھاکے میں برباد ہوئی) اور کراچی چلے گئے۔ آپ کو تو یہاں رہنا تھا۔ میرے Career پر بہترین تبصرہ ہے۔ میری دلی آرزو علی گڑھ ہی کی تھی تاکہ اپنے محبوب ترین ادیب رشید احمد صدیقی کو دیکھ سکتا اور ان سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کرتا۔ لیکن تقدیر مخالف نکلی۔

سرورؔ صاحب پر فالج کے حملے کی خبر سے دکھ ہوا۔ شکر ہے کہ اچھے ہو گئے۔ کبھی میرا اسلام پہنچا دیجئے گا۔ خورشید الاسلام تو ایک طویل مدت سے گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔ کسی رسالے میں پڑھا کہ قیام پاکستان کے بعد تلاش روزگار میں پاکستان آ نکلے تھے۔ لیکن انہیں اردو کالج کراچی (عبدالحق صاحب کا زمانہ تھا) میں لیکچر شپ تک نہ ملی۔ نتیجۃً واپس چلے گئے۔ کاش وہ اپنی سوانح عمری لکھ ڈالتے (۱)۔ ان کا واپس چلے جانا کتنا مبارک ثابت ہوا آپ نے اچھا کیا کہ ڈاکٹر فصیح تک میرے شکوے پہنچا دیئے۔

ہاں جذبیؔ صاحب کو بھی خود نوشت کے لئے آمادہ کرتے رہیے۔ ان سب حضرات نے علی گڑھ کا بہترین دور دیکھا ہے۔ ان کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ ہوگا۔

سنا ہے کہ ابوالکلام قاسمی صدر شعبہ ہو گئے ہیں۔ مبارک باد بھیج چکا ہوں۔ میں انگریزی اخبار The News International کے لئے ہر ہفتے بدھ کو جو مضمون لکھتا ہوں اس کا ایک انتخاب شائع کرنے والا ہوں اس میں قاسمی کی کتاب سے متعلق مضمون بھی ہوگا۔ کتاب آپ لوگوں تک پہنچے گی۔

فروری ۱۹۹۵ء میں جب میں اسلام آباد واپس آرہا تھا تو میں مشفق خواجہ صاحب کی رضامندانہ آمادگی پر ہندوستان کے کئی لوگوں کے لئے ۹۴ء اور ۹۵ء میں اپنی چھپی ہوئی کتابوں کے پیکٹ بنا کر چھوڑ آیا تھا کہ وہ بھجوا دیں گے۔ کچھ عرصہ قبل انہوں نے اطلاع دی تھی کہ انہوں نے مولانا آزاد لائبریری کو میری ایک کتاب بھیج دی تھی۔ اول تو انہوں نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ آزاد لائبریری کو کون سی کتاب بھیجی گئی۔ دوسرے حافظہ یہ کہتا ہے کہ آزاد لائبریری کو چار کتابوں میں سے صرف ایک کتاب میں نے کیوں بھیجی ہوگی۔ اگر زیادہ زحمت نہ ہو تو آزاد لائبریری کے لائبریرین سے اتنا پوچھ لیجئے کہ میری مندرجہ ذیل کتابوں میں سے انہیں کون سی کتاب مل چکی ہے تاکہ باقی کتابیں بھیجنے کی کوشش کروں گا۔

(1) Reflections on Life and Literature (2) Views and Reviews (3) To Prof. Nazeer Siddiqi (4) حسرت اظہار۔

نہ جانے ان میں سے کوئی کتاب آپ کی نظر سے گزری یا نہیں۔ اقبال اکیڈمی لاہور کے سربراہ ڈاکٹر وحید قریشی سے تو آپ کے نہایت گہرے مراسم ہوں گے۔ نہ جانے وہ آپ کے پاس اکیڈمی کی مطبوعات بھیجتے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے میری انگریزی کتاب Iqbal: In his varied aspects شائع کی ہے۔ کبھی ملی؟

اگر ممکن ہو تو میرے نام اپنا خط براہ راست بھیجا کریں۔ ڈاکٹر شروانی کی خیریت ایک مدت سے معلوم نہیں ہو رہی ہے۔ میرا اسلام پہنچا دیجئے گا۔

شعبۂ اردو کے ڈاکٹر اصغر عباس سابق وی۔سی حامد صاحب کے اعزاز میں ایک کتاب مرتب کر رہے تھے۔ اس میں میرا بھی ایک مضمون ہونا چاہئے۔ کچھ اندازہ ہو تو اس کے بارے میں لکھئے گا۔

بھائی سرور صاحب رشید احمد صدیقی کے خطوط شائع کرنے والے تھے۔ اس کا کیا ہوا؟ کچھ اور حالات بھی قابل ذکر ہیں۔ مگر باقی آئندہ۔

آپ کا

نظیر صدیقی

---

(۱) میں خورشید الاسلام صاحب اور جذبی صاحب کو برابر متنبہ کرتا رہا ہوں کہ وہ اپنی خود نوشت ضرور تحریر کریں۔ اس تحریک کے اصل داعی ڈاکٹر عابد رضا بیدار ہیں۔ خورشید الاسلام صاحب کے بیان کے مطابق پیدائش سے ہائی اسکول تک تعلیم کی سرگزشت انہوں نے لکھ لی ہے۔ میں نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے کہا کہ مسودہ لندن میں ہے وہاں ہر سال چند ماہ کے لئے جاتا ہوں وہیں اطمینان سے بیٹھ کر لکھتا ہوں۔ ان کی موجودہ صحت کے پیش نظر اب اس کی تکمیل مشکل معلوم ہوتی ہے۔ جذبی صاحب نے بھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ سرور صاحب اور مسعود حسین صاحب کی سوانح عمریاں شائع ہو چکی ہیں۔

(16)

اسلام آباد

۱۵ر جنوری ۱۹۹۷ء

برادر مکرم، ڈاکٹر مختار الدین السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا تھا۔ مصروفیت کے باعث جواب نہ دے سکا۔ آپ کا یہ خیال کہ میرے خطوط کا مجموعہ چھپنا چاہیے (۱) یہ ذمے داری آئندہ نسلوں کی ہے اگر وہ اس کو اپنی ذمے داریوں میں شمار کریں۔

سرِدست میری آرزو یہ ہے کہ میں نے ۱۹۸۶ء میں وارث کرمانی صاحب (شعبۂ فارسی) کے نام ایک خط لکھا تھا۔ وہ اگر ان کے پاس محفوظ ہو تو آپ ضرور دیکھیں بلکہ اس کی فوٹو میرے پاس بھیج دیں (۲)۔ میں اپنے خطوط کی نقلیں نہیں رکھتا —— آپ کے پاس میری کتاب ''نامے جو مرے نام آئے'' ہے یا نہیں۔

کتابوں کا یہ پارسل پروفیسر شروانی کے نام بھیجنا چاہتا تھا لیکن عجلت میں ان کا پتا نہیں مل رہا ہے۔ رسید جلد بھیجیے گا۔

ان دنوں میری زندگی بہت غیر منظم ہے۔ اور حافظے کی کمزوری پہلے سے زیادہ۔

باقی آئندہ۔

آپ کا

نظیر صدیقی

---

(۱) مرحوم نے اپنے نام ادیبوں کے خطوط کا ایک مختصر انتخاب ''نامے جو میرے نام آئے'' راولپنڈی سے ۱۹۸۴ء میں شائع کیا تھا۔ وہ اس کی دوسری جلد اشاعت کے لئے مرتب کر رہے تھے۔ میں نے لکھا تھا کہ آپ کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی چھپنا چاہیے۔ پروفیسر خالد حسن قادری (لندن یونیورسٹی) نے پروفیسر مولوی حامد حسن صاحب قادری کے مکاتیب کے مجموعے خطوط قادری (لندن ۱۹۹۹ء) میں مولانا قادری کے نام نظیر صدیقی کے گیارہ خطوط شائع کیے ہیں۔ اس مجموعے میں قادری صاحب کے خطوط بار بار پڑھنے کے لائق ہیں۔

(۲) یہ خط کرمانی صاحب کے پاس محفوظ نہیں رہا۔

(17)

اسلام آباد

۱۳ر فروری ۹۷ء

برادر مکرم، السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۸ر جنوری مجھے ۲۳ کو مل گیا تھا لیکن میں نے اس کے جواب کو بوجوہ ملتوی رکھا۔ پہلی وجہ التوا تو یہ تھی کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے آپ کے نام میری نئی کتاب 'ادبی جائزے' (پروفیسر آلِ احمد سرور اور ڈاکٹر فصیح کے نام بھی) بھیجی تھی میں چاہتا تھا کہ کتابیں آپ حضرات تک پہنچ جائیں تو خط لکھوں تا کہ جواب میں کم از کم آپ کی

طرف سے اس کتاب کی رسید مل جائے۔ پروفیسر سرور اپنی پیرانہ معذوریوں کی بنا پر رسید یا خط لکھنے کے قابل نہیں رہے۔ ڈاکٹر فصیح نے غالباً یہ اصول اپنا رکھا ہے کہ سال بھر میں ایک سے زیادہ خط نہیں لکھنا چاہئے —— دوسری وجہ التوا یہ تھی کہ ۱۵/جنوری کو میں نے آپ کے نام اپنی تین کتابیں آپ کے شعبۂ عربی کے By Sruface Mail روانہ کر دی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی پہنچ جائیں تو ان کی رسید بھی آ جائے گی۔ تیسرا انتظار یہ تھا کہ ۱۲/فروری کو آپ کی مرتبہ کتاب 'نقد غالب (۱)' پر The News میں میرا کالم آنے والا تھا سو کل آ گیا۔ میں اس کا تراشا اور عکسی نقل دونوں بھیج رہا ہوں۔ اس دوران میں ڈاکٹر معین نے 'رشید احمد صدیقی بنام آل احمد سرور' پر میرا کالم آپ حضرات (آل احمد سرور، ڈاکٹر فصیح اور آپ) کے نام بھیج رکھا ہے۔ نہ جانے اتنی چیزوں میں سے کون کون سی چیزیں آپ تک پہنچیں۔

میں نے آپ کے نام شعبۂ عربی کے پتے پر جو تین کتابیں بھیجی ہیں ان میں دو ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی کے لئے ہیں۔ ایک انگریزی اور ایک اردو —— اور ایک انگریزی کتاب آپ کے لئے ہے۔ امید ہے کہ کچھ عرصے کے بعد میں آپ کے نام اپنی چھوٹی سی زیر طبع کتاب 'پروین شاکر بنام نظیر صدیقی' بھیج سکوں گا۔ میرے نام پروین شاکر کے پچیس چھبیس خطوط تھے۔ کتاب تقریباً ایک سو صفحے کی ہے (۲)۔ نہ جانے آپ کو میرا سابقہ جوابی خط ملا یا نہیں۔ وہ 'رشید احمد صدیقی بنام آل احمد سرور' کی رسید کے طور پر غالباً براہ راست بھیجا گیا تھا۔ اور اگر وہ آپ کو ملا تو آپ نے پروفیسر وارث کرمانی کے نام میرے ایک خط کا پتا چلایا یا نہیں۔ وہ خط ۱۹۸۶ء میں لکھا گیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ 'جدید اردو نظم' سمینار بہت شاندار رہا ہوگا۔ اگر آپ مجھے ڈاکٹر نارنگ کا کلیدی خطبہ اور وارث علوی کا مقالہ فراہم کر دیں تو بے حد ممنون ہوں گا۔

پچھلے سال رشید احمد صدیقی پر جو سمینار ہوا تھا اس کے مقالوں کو ظہیر احمد صدیقی نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ اس میں میرا مضمون بھی شامل کر لیا گیا ہے (۳)۔ براہ کرم ظہیر احمد صدیقی کو ایک خط یا فون کے ذریعے بتایئے کہ مجھے ان کی ارسال کردہ کتاب مل گئی ہے جس کے لئے میں ان کا بہت ممنون ہوں۔ میرے پاس ان کا پتا نہیں ہے لیکن آپ صرف پتا بھیجنے پر اکتفا نہ کریں۔

اپنی دونوں کتابوں کے بارے میں آپ کی بے لاگ مخلصانہ رائے کا انتظار رہے گا۔ ۶/مارچ کو ہماری چھوٹی بیٹی سیما فرحت کی شادی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ مالی مسائل کو حل کرنے کے لئے میں ایک جاپانی ناول (ترجمہ انگریزی میں ہے) کا اردو میں ترجمہ کر رہا ہوں حالانکہ مجھے ترجمے سے بہت گریز ہے۔ میری علمی اور ادبی مصروفیتوں کا المناک پہلو یہی ہے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہئے تھا وہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ اور سب بدستور۔

آپ کا
نظیر صدیقی

(۱) غالب پر ۱۳ تنقیدی مضامین کا مجموعہ "نقدِ غالب" انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۵۶ء میں دہلی سے شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن پروفیسر سید معین الرحمن کے ادارہ الوقار پبلی کیشنز (۵۰ ریونیو ہال، لاہور) کی طرف سے ۱۹۹۵ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں آل احمد سرور صاحب کا تعارف تو ہے لیکن قاضی صاحب کا طویل مضمون "غالب بحیثیت محقق" شریکِ اشاعت نہیں۔ شاید اسے علیحدہ شائع کرنے کا خیال ہو۔ نظیر صدیقی کا تبصرہ اسی اشاعت پر ہے۔

(۲) "پروین شاکر کے خطوط نظیر صدیقی کے نام" مرتبہ جاوید وارثی (کراچی ۱۹۹۷ء)

(۳) یہ مجموعہ مضامین جامعہ اردو علی گڑھ نے شائع کیا تھا۔ نظیر صاحب کی فرمائش پر اس کا ایک نسخہ میں نے انھیں بھیج دیا تھا۔ ظہیر احمد صدیقی اس زمانے میں علیل تھے۔ انھیں زحمت دینا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ صدیقی صاحب اب بھی علیل ہیں خدا انھیں صحت دے۔

(18)

اسلام آباد

۱۱/اپریل ۹۷ء

برادر مکرم، السلام علیکم

مشفق خواجہ کے ذریعے آپ کا خط مورخہ ۲۷/فروری مجھے ۷/مارچ کو مل گیا تھا۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد کوئی اور خط نہیں ملا۔ توقع تھی کہ آپ جمشید پور وغیرہ کے سفر سے واپس آ کر تفصیلی خط لکھیں گے جس میں نقدِ غالب اور مکتوبات رشید بنام آل احمد سرور سے متعلق میرے کالموں کے بارے میں آپ کی رائیں ہو سکتی ہیں۔ مگر ابھی تک ایسا کوئی خط نہیں ملا۔

پروین شاکر کے خطوط نظیر صدیقی کے نام شائع ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمن کے ذریعے آپ تینوں حضرات کے لئے بھیجنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تینوں سے مراد پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر فصیح بھی ہیں۔

اس دوران میں ریاض الرحمن شروانی کا خط آیا تھا۔ انھیں آپ کے ذریعے میری دونوں کتابیں مل چکی ہیں۔

کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر فصیح کا خط بھی موصول ہوا۔ اس کا جواب اسی خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔

میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ کے نام رشید صاحب کے جو خطوط ہیں ان کو کتابی شکل میں شائع کرنے کے سلسلے میں آپ مزید تاخیر گوارا نہ دیں۔ سردست یہ خط جلدی میں لکھ رہا ہوں

امید ہے کہ آپ سب لوگ بخیریت ہوں گے۔

نیاز مند

نظیر صدیقی

(19)

اسلام آباد

۹/اکتوبر ۹۷ء

برادر مکرم، السلام علیکم

آپ کی برادرانہ اور محبانہ محبتوں کا تحفہ "آل احمد سرور" (۱) چند ماہ قبل مل گیا تھا جب کہ یہ کتاب دو تین ماہ

ڈاکٹر معز الدین (۲) کے ہاں بھی پڑی رہی۔ ایک تقریب میں ان سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی تو انہوں نے فرمایا۔ بھائی آپ کے لئے ایک کتاب ڈاکٹر مختار الدین نے دی تھی۔ میرے ہاں کسی وقت آ کر لے لیجئے۔

یہ کتاب جس نہج سے ترتیب دی گئی ہے اور مضمون نگاروں کے جن مشاہدات و تجربات تک محدود رکھی گئی ہے اس کی یہ خصوصیتیں مجھے بہت پسند آئیں۔ کاش اس طرح کی سیریز پاکستان میں بھی شائع ہوتی۔

ڈاکٹر فصیح تو میرے خط کا جواب دیئے بغیر امریکہ چلے گئے یا امریکہ کے ہو رہے۔ مجھے آلِ احمد سرورؔ صاحب کی خیریت سے کون مطلع کرے۔ بہر حال میرا اسلام ان تک پہنچا دیجئے گا۔

The News International میں میری کالم نگاری کا جو سلسلہ چھ سات سال سے چل رہا تھا وہ ۱۴ر مئی سے اچانک منقطع کر دیا گیا۔

امید ہے کہ آپ کی صحت ٹھیک جا رہی ہوگی۔ کسی عنوان سے آپ دلی یا علی گڑھ بلائیں تو آپ لوگوں سے Possibly آخری ملاقات ہو جائے۔

ڈاکٹر معین الرحمن کے ذریعے آپ کے پاس پروین شاکر کے خطوط نظیر صدیقی کے نام پہنچیں گی۔

کم از کم چھ مہینے میں تو ایک خط بھیج دیا کریں۔ اپنے نام رشید صاحب کے خطوط کی طباعت میں مزید تاخیر کو راہ نہ دیں۔ یہ کام کر ڈالیں۔

آپ کا
نظیر صدیقی

---

(۱) غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے اراکین پانچ سات سال سے کسی نہ کسی بزرگ معتقد شاعر و ادیب کی خدمات کے اعتراف میں ہر سال ان کے ساتھ ایک شام مناتے ہیں اور وہ ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کرتے ہیں۔ اراکین انھیں سپاس نامہ اور پچیس ہزار کا ایک چیک پیش کرتے ہیں۔ دو چار اصحاب ان کے ادبی کارناموں پر ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ پھر وہ ادیب اظہار خیال کرتا ہے اس کے بعد حاضرین جلسہ اس کے ساتھ عصرانے میں شریک ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ملک کے مختلف اصحاب قلم کے تاثرات اس شاعر و ادیب کے بارے میں ایک کتابچے کی شکل میں چھاپ کر تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اب تک اس کے جلسے پٹنہ، آگرہ، دہلی، لکھنؤ اور علی گڑھ میں منعقد ہوتے رہے ہیں۔ جن مصنفین، شعرا کے ساتھ یہ ادبی شامیں گزاری گئی ہیں وہ یہ ہیں۔ قاضی عبدالودود، ہیکش اکبر آبادی، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر آلِ احمد سرورؔ، پروفیسر سید نور الحسن ہاشمی، بیگم حمیدہ سلطان احمد اور ڈاکٹر معین احسن جذبی۔

(۲) اردو کے ممتاز استاد اور ماہر اقبالیات، اقبال لاہور کے ڈائرکٹر اور ہجرہ کونسل اسلام آباد کے سکریٹری۔

(20)

اسلام آباد
۱۲ر جنوری ۱۹۹۸ء

برادر مکرم، السلام علیکم

آپ کا خط تو طویل وقفے ہی پر آتا ہے۔ ڈاکٹر فصیح علی گڑھ میں ہوتے تو ان کے ذریعے آپ کی اور سرورؔ صاحب

کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ نہ جانے وہ امریکہ سے واپس کب آئیں گے۔ اگر آپ کے جواب دینے تک آ جائیں تو انہیں بھی اس کام میں شریک کیجئے۔ جس کی زحمت آپ کو دے رہا ہوں۔

کراچی کے کچھ احباب مجھ پر ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں۔

''نظیر صدیقی —— شخصیت اور کارکردگی''۔ اس موضوع کے تحت آپ مجھ پر دو چار صفحے اُس طرح لکھ دیں جیسے آل احمد سرور سے متعلق حالیہ کتاب میں آپ اور دوسروں کے مختصر مضامین ذاتی واقفیت اور ذاتی تاثرات پر مبنی تھے نہ کہ علمی اور تنقیدی مطالعے پر۔

اسی طرح کے دو تین صفحات سرور صاحب سے لکھوا دیں اور ڈاکٹر شروانی سے بھی۔ گو ان سے آج تک میری ملاقات نہیں ہے۔ وہ شخصیت کے بارے میں کچھ نہ لکھ پائیں گے لیکن میری تحریروں سے متعلق اپنے تاثرات لکھ سکتے ہیں۔ اس کام میں زیادہ وقت نہ لیجئے۔ اسے اس طرح لکھ ڈالئے جیسے آپ ایک طویل خط لکھ رہے ہیں۔ اب صحت کا زوال مائل بہ ترقی ہے۔ عمر طبیعی بھی ختم ہو چکی ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ ۱۴ر مئی ۹۷ء سے میری کالم نگاری کا سلسلہ انتظامیہ کے ہاتھوں ختم ہو چکا ہے۔ میں نے آپ کی کتاب —— علی گڑھ میگزین غالب نمبر پر جو کالم لکھا تھا اس کے بارے میں آپ کا تاثر معلوم نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے میرا کالم تو آپ کے پاس بھیج دیا تھا۔ آپ کا تو کوئی خط ہی نہیں آ رہا ہے۔ اپنے مضمون کے ساتھ سرور صاحب (ان کو میرا اسلام ضرور پہنچایئے) شروانی صاحب اور ڈاکٹر فصیح کے مضامین رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجئے۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے کام کبھی تاریخی اہمیت حاصل کریں گے۔ اسلوب انصاری صاحب کی کتاب 'اطراف' پر آپ میرا مضمون دیکھیں گے۔

آپ کا

نظیر صدیقی

(21)

اسلام آباد

۲۱ر فروری ۱۹۹۸ء

برادر مکرم، السلام علیکم

میں نے آپ کے نام پچھلے خط میں گزارش کی تھی کہ آپ مجھ پر زیر طبع کتاب ''نذر نظیر'' کے لئے شخصیت اور کارکردگی کے حوالے سے دو چار صفحوں میں اپنے تاثرات لکھ بھیجیں۔

موجودہ مواد کی کمپوزنگ شروع ہو چکی ہے۔ کتاب کی طباعت میں تاخیر کتاب کے نہ چھپنے کا باعث بن سکتی ہے۔

میں ایک شادی کے سلسلے میں ۵ر فروری کو کراچی گیا تھا۔ رشید احمد صدیقی کے بڑے بیٹے اقبال رشید نے مجھے جیم خانہ کلب کراچی میں لنچ پر مدعو کر کے پہلی ملاقات کا اہتمام کیا جس میں ڈاکٹر احسان رشید بھی شریک تھے۔ جب میں

ڈھاکے سے کراچی منتقل ہوا تھا اسی زمانے میں رشید صاحب نے دونوں بیٹوں کو لکھ بھیجا تھا کہ مجھ سے کراچی میں ضرور ملیں۔ چنانچہ اسی زمانے سے ڈاکٹر احسان رشید سے ملاقات چلی آرہی ہے۔ اقبال رشید سے اب کے ملنے کا موقع ملا۔ میں نے اسلوب احمد انصاری کی کتاب ''اطراف رشید احمد صدیقی'' پر مضمون لکھ کر چھپنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ ایک نقل ان کے پاس بھی بھیج دی ہے۔ ایک مدت سے آپ کا کوئی خط نہیں آرہا ہے۔ اپنی خیریت سے مطلع فرمائیں۔ آپ کا

نظیر صدیقی

(22)

اسلام آباد

۱۸ اپریل ۱۹۹۸ء

برادر مکرم، السلام علیکم

عنایت مورخہ ۱۳/ مارچ مجھے ۲ اپریل کو ملا۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان خطوط عموماً دس گیارہ دن میں پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن آپ کے اس کارڈ کے پہنچنے میں بیس دن لگے۔

اس میں شک نہیں کہ آپ کے ہاں اجمال میں تفصیل ہوتی ہے اور میرے ہاں تفصیل میں اجمال۔

موجودہ پوسٹ کارڈ سے پہلے مشفق خواجہ نے آپ کا ایک خط بھیج دیا تھا۔ ان دنوں وہ کسی تحقیقی کام سے اسلام آباد آئے ہوئے ہیں۔ گزشتہ ساڑھے تین سال کی کشیدہ خاطری کے باوجود ایک شام اپنے میزبان گوہر نوشاہی کے ساتھ میرے ہاں تشریف لائے۔ دیر تک شکوہ شکایت اور حرف و حکایت کا سلسلہ جاری رہا۔ آج وہ لاہور چلے جائیں گے۔ پھر لاہور سے کراچی۔

آپ نے شروانی صاحب اور اسلوب صاحب دونوں سے متعدد بار مضمون کے لئے کہہ کر اپنا فرض ادا کر دیا لیکن ان دو حضرات کی طرف سے کچھ آتا نظر نہیں آتا۔

اسلوب صاحب نے ۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء میں رشید صاحب کی خواہش پر فکر و نظر علی گڑھ میں 'تاثرات و تعصبات' پر خاص طویل تبصرہ لکھ دیا تھا جو یقیناً میرے کسی بکس میں ہے لیکن مل نہیں رہا ہے۔ اگر مل جاتا تو میں اسے کتاب میں ضرور شامل کر لیتا۔ اگر آپ کے پاس اس زمانے کا 'فکر و نظر' محفوظ ہو تو تبصرہ کی فوٹو کاپی بھیج دیجئے۔ میں نے اسلوب صاحب سے گزارش کی تھی کہ وہ 'شہرت کی خاطر' (میرے انشائیوں کا مجموعہ) پر دو تین صفحے لکھ دیں کیوں کہ اسے وہ میری بہترین کتابوں میں شمار کرتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو پھر ایک مرتبہ آپ ان کی توجہ دلائیں۔ ان کے دو تین صفحے صدیوں میرے کام آتے رہیں گے۔ شروانی صاحب تو مجھ پر بہت مہربان رہے ہیں۔ لیکن ان کی ایک دشواری شاید یہ ہو کہ ان سے اب تک میری ایک ملاقات بھی نہیں ہے اور ان کے پاس میری کتابیں بہت کم پہنچیں۔ تاہم وہ میرے مضمون 'مولانا آزاد' کے حوالے سے دو ایک صفحے لکھ سکتے ہیں جو انہیں بہت پسند ہے۔ براہ کرم ان سے ایک مرتبہ اور کہہ کر دیکھئے۔ اگر اسلوب

صاحب اور شروانی صاحب دو تین صفحے بھی لکھ دیں تو ان کی تحریروں سے کتاب کے اہم صفحات میں اضافہ ہو جائے۔

کراچی میں کتاب کی کمپوزنگ شروع ہو چکی ہے۔ مضامین کے انتظار میں زیادہ تاخیر کتاب کی طباعت کے لئے خطرہ بن سکتی ہے ع

کہ التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

مشفق خواجہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔

آپ کا

نظیر صدیقی

(23)

اسلام آباد

۴ر مئی ۹۸ء

برادر مکرم ڈاکٹر مختار الدین، السلام علیکم

تین چار دن ہوئے کہ کوئی شخص آپ کے بھیجے ہوئے تین رسالے دے گیا جن میں علی گڑھ میگزین کا خصوصی شمارہ 'علی گڑھ آئینہ ایام میں' بھی ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ان تحفوں کے لئے میں آپ کا کتنا ممنون ہوں۔ جس وقت یہ رسالے آئے میں سویا ہوا تھا۔ بیگم نے لانے والے کا نہ نام پوچھا نہ پتا۔ تینوں پرچے ''مقتدرہ'' کے پیکٹ میں تھے۔ معلوم نہیں وہاں سے کون آیا۔ شاید کبھی معلوم ہو جائے۔

اس خط کے پہنچنے سے پہلے ڈاکٹر فصیح کے ذریعے آپ کو میرا ایک جوابی خط ملنا چاہئے۔

'نذر نظیر' کے لئے آپ کی کوششوں کا نہایت احسان مند ہوں۔ لیکن یہ کس قدر افسوس کی بات ہوگی کہ اس کتاب میں آپ کے ڈیڑھ دو صفحے کا مضمون بھی نہ ہو۔ یہ کمی ابد تک کھٹکتی رہے گی۔

آپ کے بھیجے ہوئے علی گڑھ میگزین کو پڑھتے ہوئے اپنی محرومی قسمت پر رونے کو جی چاہا۔ لیکن اب رونے سے بھی کیا ہوگا۔ وہاں کے علمی و ادبی ماحول سے یہاں کے علمی و ادبی ماحول کا کیا مقابلہ ع

وہیں اے کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

اچھا بھائی جو کچھ ہو سکے جلدی کیجئے۔ مشفق خواجہ کی خیریت لکھ چکا ہوں۔ تقریباً ساڑھے تین سال کی بے تعلقی کے بعد وہ یہاں آئے تو مجھ سے مل کر گئے۔

اسلام آباد میں اسلوب انصاری صاحب کے ہونے کی خوشبو کہیں سے نہیں مل رہی ہے۔ جہاں تک کراچی کا تعلق ہے وہاں تو وہ آتے جاتے رہتے ہیں۔

گھر کے لوگوں سے مناسبات کہئے۔

آپ کا

نظیر صدیقی

اسلام آباد

۲۲ر جون ۱۹۹۹ء

برادر مکرم، السلام علیکم

بڑی مدت کے بعد آپ کا مفصل خط مورخہ ۶ / جون مجھے ۱۵/ جون کو ملا۔ میں نے آپ سے خط و کتابت کبھی بند نہیں کی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ کچھ اپنی مصروفیت (نذر نظیر سے متعلق) اور آپ کی مصروفیت (وائس چانسلری (۱) سے متعلق) کے پیش نظر میں نے آپ سے خط و کتابت ملتوی کر دی تھی۔ اس سلسلے میں میں آپ کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے بے چین تھا۔ شکر ہے کہ وہ غلط فہمی اپنے آپ دور ہو گئی۔

خوشی ہوئی کہ میری انگریزی کتاب Columns آپ تک پہنچ گئی۔ ''نذر نظیر'' کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ چونکہ کتاب بہت محدود تعداد میں چھپی تھی اس لئے دوبارہ بھیجنا بھی ممکن نہیں ہو رہا ہے۔ اچھا ہوا کہ مشفق خواجہ نے کچھ زیادہ جلدیں اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ انہوں نے آپ کے پاس جو نسخہ بھیجا اسے علی گڑھ کے کئی متعلقہ حضرات نے دیکھ لیا۔ کم از کم دیکھ تو لیا۔ ڈاکٹر شروانی کا خط آیا ہے کہ ان کے مضمون میں کمپوزنگ کی کئی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اگر میں کراچی میں ہوتا تو شاید اتنی غلطیاں نہ رہتیں۔

گھپلا تو Columns کے بھیجنے میں بھی زبردست ہوا ہے لیکن اس پر میں نے خیر سے قابو پا لیا۔ اس گھپلے کی تفصیل ڈاکٹر فصیح سے پوچھ لیجئے گا۔

''نذر نظیر'' میں صفحات کی قید سخت تھی۔ پھر بھی حد مقررہ سے آگے جانا پڑا۔ اسی لئے اپنے نام ادبا کے خطوط کے لئے زیادہ گنجائش نہ نکل سکی۔ اگر کبھی ممکن ہوا تو 'نامے جو مرے نام آئے' کا دوسرا حصہ شائع کروں گا۔

میں ادھر چھ سات مہینے سے بیمار ہوں۔ پچھلے Thorough check up سے معلوم ہوا کہ کئی سال سے نمونیہ میں مبتلا ہوں۔ علاج شروع ہو چکا ہے۔ افاقہ بھی نظر آتا ہے۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔

ڈاک خانہ یہاں سے دور ہے۔ ایک شخص کے ہاتھ یہ خط پوسٹ کرنے کو دے رہا ہوں۔ بہت سی باتیں نہ لکھ سکا۔ پروفیسر ریاض سے فون پر کہئے کہ مجھے ان کا خط مل گیا ہے۔ جواب بعد میں دوں گا۔

خط و کتابت جاری رکھئے۔ میں نے آپ کی کتاب پر Columns میں جو کالم شامل کیا ہے یاد آتا ہے کہ وہ میں نے آپ کو بھیجا تھا۔ مگر ان دنوں آپ کہیں جا رہے تھے۔

آپ کا
نظیر صدیقی

---

(۱) بہار کے گورنر اور وہاں کی جامعات کے چانسلر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے مجھے تین سال کے لئے مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کا پہلا وائس چانسلر تقرر کیا تھا۔ خط میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اسلام آباد

۳۰ راگست ۱۹۹۹ء

برادر مکرم، السلام علیکم

عنایت نامہ مورخہ ۲۱/ اگست پرسوں ملا۔ چونکہ میرے بائیں کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اس لئے آپریشن کے سوا چارہ نہ تھا (۱)۔

اسپتال سے واپس آئے ہوئے پانچواں ہفتہ ہے۔ اگلے ہفتے سرجن سے مل کر معلوم کرنا ہے کہ میرے صحت یاب ہونے میں اور کتنا وقت لگے گا۔ بیان نہیں کر سکتا کہ کس کس طرح میں نے دن کو رات اور رات کو دن کیا ہے۔ آپریشن کے بعد کوئی ظاہری تکلیف تو نہیں رہی لیکن صرف لیٹے لیٹے وقت گزارنا بہت بڑی آزمائش رہی ہے۔

دو ہفتے سے زیادہ ہوئے میں نے آپ کے نام ایک خط لکھا۔ آپ کا پتا ڈھونڈھنا ممکن نہ تھا اس لئے خط میں نے ڈاکٹر فصیح کے نام بھیج دیا۔ امید ہے کہ انہیں مل گیا ہوگا۔ ڈاکٹر فصیح سال میں مشکل سے مجھے دو خط لکھتے ہیں۔

زیر جواب کے علاوہ آپ نے جو خط میرے نام بھیجا وہ مجھے نہیں ملا۔ جاوید وارثی شاعر ہیں اور ڈاکٹر محسن مزاح نگار۔ کتاب (۲) کی ترتیب زیادہ تر میری ہی ہے کیوں کہ سارا مواد تو میرے ہی پاس تھا۔ نئے لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا میرے ہی تعلقات کی بنا پر لکھا۔

مولانا عبدالماجد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطوط پر مشتمل کتاب ضرور بھیج دیجئے (۳)۔

میں ابن حسن سید سے واقف نہیں البتہ ایک ابن الحسن سید تھے۔ بہار کے رہنے والے۔ ۲۲ رگریڈ کے آفیسر۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ انہیں شعر و ادب سے دلچسپی تھی (۴)۔

عطاء الرحمٰن جمیل جو بنگلہ دیش میں آباد ہو گئے میرے دوستوں میں سے ہیں۔ انجینیر تھے۔ شعر بہت اچھے کہتے ہیں۔ کوئی مجموعۂ کلام اب تک شائع نہیں کیا۔ ان کا تعلق بھی بہار سے ہے (۵)۔

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے رشید صاحب پر مقالات کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ جس میں میرا مضمون بھی ہے۔ لیکن کتاب اب تک نہیں پہنچی۔ ڈاکٹر عبدالحق (دہلی یونیورسٹی) نے رشید صاحب پر منتخب مقالات کا جو مجموعہ شائع کیا ہے یقیناً آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اس میں ڈاکٹر محمد حسن کے مقالہ ''رشید صاحب کی سبک دوشی اور سرور صاحب'' کے بارے میں اپنی رائے لکھئے۔

اور سب بدستور۔ احباب اور پرسان حال سے سلام کہئے۔

ایک خط ڈاکٹر امام اعظم کے نام بھیج رہا ہوں۔ براہ کرم بھیج دیجئے گا۔

آپ کا

نظیر صدیقی

(۱) نظیر صدیقی کے صدیق مکرم پروفیسر سید معین الرحمٰن صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج، لاہور نے ان کی علالت پر ایک طبی بلیٹن شائع کر کے مشترک دوستوں کے پاس بھیجا تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ ۲۶ر جولائی ۱۹۹۹ء کو ایک حادثے کی زد میں آئے۔ قدیر خاں جنرل ہسپتال میں داخل کیے گئے۔ ۲۷ر کو ان کا خاصا بڑا آپریشن ہوا۔ وہ ۳۰ر جولائی کو گھر واپس آئے۔ شاید ایک مہینے میں چلنے پھرنے کے لائق ہو سکیں گے۔

(۲) ''نمو نظیر'' نظیر صدیقی کی شخصیت اور ادبی کارکردگی پر مبنی کتاب، مرتبہ جاوید وارثی، ڈاکٹر محمد محسن (کراچی، ۱۹۹۸ء)۔

(۳) ذاکر صاحب کے خط (حصہ سوم) شائع کردہ کتب خانہ خدا بخش (پٹنہ) اس میں مولانا عبدالماجد کے نہیں ذاکر صاحب کے خطوط بنام مولانا عبدالماجد دریابادی مرتب کر کے میں نے شائع کیے ہیں۔

(۴) محمد ابن الحسن سید سے اسلام آباد کے ایک جلسے میں جو فیض احمد فیض پر ایک ادبی ادارے نے منعقد کیا تھا، ملاقات ہوئی۔ حکومت کے صیغۂ مالیات سے منسلک تھے۔ شعر و شاعری میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک شب انھوں نے اپنے یہاں جب وہ شالیمار میں مقیم تھے، کھانے پر مدعو کیا۔ نظیر صدیقی اور رضا علی عابدی (بی بی سی) بھی جو اس زمانے میں وہاں موجود تھے مدعو تھے۔ بہت اچھی صحبت رہی۔ بعد کو انھوں نے اپنا مجموعۂ کلام بھی بھیجا تھا۔ اس وقت تلاش پر نہیں ملا۔

(۵) ۱۹۹۱ء میں میں پہلی (اور شاید آخری) مرتبہ ڈھاکا یونیورسٹی کے ایک کام سے وہاں گیا۔ میرے شاگرد ڈاکٹر محمد ابوبکر صدیق صدر شعبۂ عربی ڈھاکا یونیورسٹی نے وہاں کے متعدد عالموں، شاعروں اور ادیبوں سے مجھے ملایا۔ نوشاد نوری کے گھر کی صحبتیں رہیں۔ انھوں نے کہا عطاء الرحمٰن جمیل یہیں قریب رہتے ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں اور نظیر صدیقی کے دوستوں میں ہیں۔ کسی وقت آپ سے ملانے انھیں یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس لاؤں گا۔ میں نے کہا نہیں میں ان کے پاس جاؤں گا، بلکہ ابھی چلیے۔ ان سے مل کر خوشی ہوا۔ وہ انجینئر سے زیادہ یونیورسٹی کے استاد معلوم ہوئے۔ ان سے نظیر صدیقی کی تازہ خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ اسی ہفتے چین سے ان کا بہت مفصل خط آیا تھا اس کا ذکر کرتے رہے۔ جمیل صاحب کا کلام بعض رسالوں میں دیکھا تھا۔ اب ان کی زبان سے کئی غزلیں سنیں۔ ایک غزل انھوں نے مجھے لکھ کر دی بھی تھی۔ جو علی گڑھ آ کر میں نے نظیر صدیقی کو بھیج دی تھی۔

(26)

اسلام آباد

۱۲/ اکتوبر ۹۹ء

برادر مکرم، سلام و نیاز

آپ کا پوسٹ کارڈ مورخہ ۳۰ر ستمبر، ۴ر اکتوبر کو مل گیا تھا۔ پوسٹ کارڈ کی پشت پر خواجہ صاحب نے لکھا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطوط کا مجموعہ جونہی پہنچے گا بھیج دوں گا۔ ۱۰ر اکتوبر کو ڈاکٹر جمیل جالبی اور خواجہ صاحب ادبیات پاکستان اکیڈمی میں بحیثیت منصفین اکادمی ایوارڈز آئے ہوئے تھے۔ وہاں سے فارغ ہو کر دونوں سیدھے میرے ہاں پہنچے اور دیر تک بیٹھے۔ خواجہ صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین والی کتاب ساتھ لائے تھے۔ ان سے یہ کتاب پا کر بڑی خوشی ہوئی۔ کاش اس کتاب کی پہلی اور دوسری جلد بھی ملی ہوتی۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اب کی بار اکیڈمی جن لوگوں کو ایوارڈ دے رہی ہے (۲۳ر اکتوبر کو تقریب ہونے والی ہے جس میں وزیر اعظم ایوارڈ تقسیم کریں گے) ان میں خلاف توقع میں بھی ہوں۔ ۹۷ء میں پاکستان کے ایک ممتاز علمی ادارے مشعل پاکستان لاہور نے مجھ سے ایک

جاپانی ناول کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرایا تھا۔ اس پر مجھے ۵۰ ہزار کا ایوارڈ ملنے والا ہے۔ جاپانی زبان سے انگریزی میں ناول کا ترجمہ غالباً ۱۹۶۲ء میں یونیسکو نے کرایا تھا۔

ممکن ہے خواجہ صاحب ابھی اسلام آباد ہی میں ہوں لیکن اب مجھ سے مزید ملاقات غالباً ممکن نہ ہوگی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی امریکہ میں طویل قیام کے بعد حال میں پاکستان لوٹے ہیں۔ ان کی تاریخ ادب اردو کی تیسری جلد مکمل ہونے کے قریب ہے۔

آپ کے نام رشید صاحب کے جو خطوط ہیں انہیں آپ کب شائع کریں گے؟

میں نے ماجد دریابادی کے نام ذاکر صاحب کے بہت سے خطوط پڑھ ڈالے۔ ماجد صاحب کی طرف ڈاکٹر ذاکر حسین اور رشید احمد صدیقی (اور آل احمد سرورؔ کے) رویے میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ اس میں تو شک نہیں کہ ایک دینی عالم کی حیثیت سے ماجد دریابادی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ان سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلقات بڑے نیازمندانہ تھے۔ لیکن انہوں نے علی گڑھ کے اردو نصاب میں سجاد انصاری کی کتاب کی شمولیت کی جیسی مخالفت کی اور یگانہؔ کو اہل لکھنؤ کے ہاتھوں جس ذلت و خواری سے دوچار کرایا اس کی بنا پر اور کچھ ذاتی معاملات کی بنا پر بھی میرے ذہن میں ان کے متعلق اچھے تاثرات نہیں ہیں۔

مذہب بلکہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے میں یہ سوچنے پر مائل ہو رہا ہوں کہ اس باب میں جیسا انقلابی کام نیاز فتح پوری نے اپنی چھوٹی چھوٹی سی تصانیف میں کر دیا ہے بیسویں صدی میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ پاکستان میں تو ان کے نقطۂ نظر کی حمایت میں کام گوارا نہیں کیا جا سکتا لیکن ہندوستان میں اس کی لنگڑی لولی سیکولرزم میں بھی یہ کام ممکن ہے۔ کاش اسلامیات کا کوئی ماہر نیازؔ کے کام کو آگے بڑھاتا اور اسے Lime Light میں لاتا۔ اس کام پر پاکستان اور ہندوستان میں ہنگامہ تو برپا ہوگا لیکن پاکستان والے کچھ کر نہیں سکیں گے یعنی اسے روک نہیں سکتے اور ہندوستان میں شاید وہ ہنگامہ زیادہ زوردار نہ ہوگا۔ بہت ممکن ہے آپ کو میرے ان خیالات سے اختلاف ہو۔ بہرحال۔ میں بھی تو آپ جیسے مومن اور متقی کے نزدیک یکے از گمراہان عالم ہوں۔

ابن الحسن سید کی تاریخ وفات مجھے معلوم نہیں۔ آس پاس کوئی ایسا آدمی نہیں جس سے پوچھ سکوں۔ اگر اتفاقاً کبھی معلوم ہوگئی تو لکھ بھیجوں گا۔

عطاء الرحمن جمیلؔ کا خط آیا تھا۔ انہوں نے بھی وہ غزل بھیجی تھی جو آپ نے بھیجی۔ بیچارے بیمار تھے۔ شاید اب صحت یاب ہو چکے ہوں۔

میرے آپریشن کے زخم مندمل ہو چکے ہیں۔ اب میں گھر کے اندر چھڑی کے سہارے چل پھر لیتا ہوں۔ ابھی باہر جانے کی اجازت نہیں ہے کیوں کہ بایاں پاؤں کمزور بھی ہے اور ابھی چال بالکل normal نہیں ہے۔

اگر رشید صاحب کے روحانی وارثوں میں..... جیسے لوگ رہ گئے ہیں تو اسے رشید صاحب کی بدنصیبی کہا جا سکتا ہے..... جیسے لوگ سے میری مراد ایسے لوگ ہیں جو ان کی اقدار کو اپنی زندگی کا جز نہیں بناتے بلکہ اسے صرف publicity اور propaganda کا مال سمجھتے ہیں۔ مجھ بیمار کا حال تک نہیں پوچھا۔ افسوس اور کمال افسوس ہے۔ اچھا اب اجازت۔

آپ کا
نظیر صدیقی

(27)

اسلام آباد
۲۲ر اکتوبر ۱۹۹۰ء

برادر مکرم

آپ کے خط کا جواب اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام ماجد دریابادی کے خطوط کی رسید براہ راست آپ کے نام بھیج چکا ہوں۔ یہ خط ایک Urgent ضرورت کے تحت لکھ رہا ہوں۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دہلی) نے کوئی پندرہ سال پہلے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے اعزاز میں ایک کتاب شائع کی تھی جس میں میرا ایک مختصر مضمون 'کچھ مغربی ناولوں کے بارے میں' شامل کیا تھا۔ میرے پاس انہوں نے وہ کتاب بھیجی تھی جو یقین ہے کہ میری کتابوں کے انبار میں کہیں نہ کہیں ہے مگر ان دنوں مل نہیں رہی ہے۔ اصل مضمون کا بھی پتا نہیں چل رہا ہے۔

براہ کرم مولانا آزاد لائبریری سے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی کتاب (جس کا نام بھی یاد نہیں آ رہا ہے (۱)) نکلوا کر میرے مضمون کی فوٹو اسٹیٹ کروائیں اور اسے جلد سے جلد براہ راست میرے نام بھیج دیں۔ شدید انتظار رہے گا۔

امید ہے کہ آپ جملہ متعلقین کے ساتھ بخیریت ہوں گے۔ براہ کرم اپنے گھر کا پتا ایک مرتبہ انگریزی میں لکھ بھیجیے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی صحت کا حال کیا ہے، میرا اسلام پہنچائیے۔

آپ کو زحمت دے رہا ہوں اور بڑی امیدوں کے ساتھ۔

آپ کا
نظیر صدیقی

---

(۱) ارمغان فاروقی (دہلی ۱۹۸۷ء) کا ایک نسخہ میں نے انھیں بھیج دیا تھا۔

(28)

اسلام آباد
۷ر جون ۲۰۰۰ء

برادر مکرم ڈاکٹر مختار الدین صاحب، السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ مئی میں مل گیا تھا۔ ۳ر مئی کو میری دائیں آنکھ میں Cataract کا آپریشن ہوا۔ آنکھ ہنوز

زیرِ علاج ہے۔ ٹھیک سے لکھ پڑھ نہیں سکتا۔

اس دوران میں میری ایک انگریزی کتاب چھپ کر آ گئی ہے۔ پانچ جلدیں ڈاکٹر نذیر احمد کے پتے پر بھیج رہا ہوں۔ چار جلدوں کو آپ پہنچوا دیں گے۔ آپ کی خیریت طلبی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ڈاکٹر فصیح احمد کا خط کوئی ایک سال پہلے آیا تھا۔ نہ جانے آج کل وہ کہاں ہیں۔

اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیئے۔ آپ کا یہ تاثر غلط ہے کہ میں نے قریش پور کے ساتھ پاکستان ٹی وی کا کوئی پروگرام کیا (۱)۔ ویسے وہ بہت اچھے ٹی وی آرٹسٹ ہیں۔ صلاح الدین احمد غازی نے مجھے The News میں کالم نگاری کا کام دلوایا تھا جو مئی ۱۹۹۷ء سے ختم ہو گیا۔

پروفیسر آلِ احمد سرور سے میرا سلام کہیئے اور انہیں میری کتاب پڑھ کر سنائیے۔ آپ کی رائے کا شدید انتظار رہے گا۔

آپ کا
نظیر صدیقی

---

(۱) میں نے یہ نہیں لکھا تھا۔ نظیر صاحب کو کچھ غلط فہمی ہوئی۔ میں نے لکھا تھا کہ آپ کے یہاں ٹی-وی پر ایک پروگرام ہوتا ہے، ''کسوٹی'' اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بہت اچھا، دلچسپ اور معلومات افزا پروگرام ہے۔ میں قریش پور، صلاح الدین غازی اور عبید اللہ صاحبان سے اسی پروگرام کے ذریعہ واقف ہوا۔ میں ان اصحاب کے دوسرے مشاغل معلوم کرنا چاہتا تھا۔ قریش پور بہت اچھے براڈ کاسٹر ہیں۔ افسوس کہ میں ان کے بہت کم پروگرام دیکھ سکا۔ پروگرام ''کسوٹی'' میں ان کے دونوں رفقا سے بہت متاثر ہوا۔ اب قریش پور صاحب ضیا محی الدین صاحب کے پروگرام میں ہر پنجشنبہ کو رونق افروز ہوتے ہیں۔ کچھ دنوں تک عبید اللہ صاحب بھی شریک ہوتے رہے۔

(29)

اسلام آباد
۷؍جولائی ۲۰۰۰ء

برادر مکرم ڈاکٹر مختار الدین صاحب، السلام علیکم

آپ کا پوسٹ کارڈ مل گیا تھا۔ حال میں 'ذاکر صاحب کے نام خطوط' کی جلد چہارم بھی ملی۔ جلد سوم پہلے مل چکی تھی۔ ان عنایات کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں۔

میں آپ کے پوسٹ کارڈ کا جواب نہ بھیج سکا۔ میں گزشتہ سال سے تا حال مختلف النوع امراض میں مبتلا ہوں۔ گزشتہ سال گھر ہی میں گر جانے کی وجہ سے میرے بائیں کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کا خاصا بڑا آپریشن ہوا۔ اب کے اپریل کے اواخر میں پتا چلا کہ دائیں آنکھ میں موتیا اتر آیا ہے۔ ۳؍مئی کو اس کا آپریشن ہوا۔ دائیں آنکھ ہنوز زیرِ علاج ہے۔ ڈاکٹر کی طرف سے لکھنے پڑھنے پر پابندی اٹھ چکی ہے لیکن میں ابھی تک سہولت کے ساتھ لکھ پڑھ نہیں پاتا۔ دن رات بیکار بیٹھا رہتا ہوں۔ مشکل سے دو چار خط لکھ لیتا ہوں۔ مطالعہ نہیں کر پاتا۔

ذاکر صاحب کے نام خطوط کی پہلی اور دوسری جلد بھی مل جاتی تو بہتر ہوتا۔ چوتھی جلد میں آپ نے مختلف

لوگوں کے نام ذاکر صاحب کے خطوط جمع کر دیے ہیں۔ انہیں دیکھ کر خیال آیا کہ کاش میرے نام بھی ذاکر صاحب کا وہ خط شامل کر لیا گیا ہوتا جو انہوں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی پر میرا مضمون پڑھ کر لکھا تھا۔ اب یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں نے ان کا اصل خط کہاں رکھ چھوڑا ہے —— میں نے بہت سے خطوط مشفق خواجہ صاحب کو بھی دے دیے ہیں۔ ان سے واپس لینا امر محال ہے۔ میرے نزدیک ذاکر صاحب کے اس خط کی اہمیت صرف اس لیے نہیں ہے کہ وہ میری تعریف میں ہے بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ ذاکر صاحب جیسی بڑی شخصیت کی طرف سے ایسا خط ایک شاذ و نادر نعمت ہے۔ انہوں نے جس فراخ دلی کے ساتھ میرے مضمون کو یعنی ایک گمنام یا نیم گمنام نوجوان کے مضمون کو رشید صاحب پر بہترین مضمون قرار دیا جبکہ مجھ سے پہلے پروفیسر آلِ احمد سرور اور بعض دوسرے مشہور اہل قلم ان پر لکھ چکے تھے ایک ادبی واقعہ ہے۔

آپکے پاس مشفق خواجہ کی بھیجی ہوئی کتاب 'نذر نظیر' موجود ہے۔ اس کے شروع میں مجھ پر جاوید وارثی کا جو مضمون ہے اس میں ذاکر صاحب کا مضمون منقول ہے۔ صفحہ ۳۳ ملاحظہ ہو (۱)۔

میں نے ۷ر جون کو ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ) کے نام اپنی نئی انگریزی کتاب Dr. Radha Krishnan: The Greatest Indian of the 20th Century کی پانچ جلدیں رجسٹرڈ بک سے پوسٹ By Mail Sruface روانہ کی تھیں۔ نہ جانے وہ اب تک پہنچیں یا نہیں۔ آپ کا حصہ آپ کو ملا یا نہیں (۲)۔ آپ ایک جلد مولانا آزاد لائبریری کو پہنچانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے اور دوسری جلد شروانی صاحب کو۔ ڈاکٹر فصیح کو بھی ایک جلد آپ ہی کے ذریعے ملے گی۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے کتاب کے بارے میں آپ حضرات کی بے لاگ رائیں چاہئیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے اب کے غالبؔ سیمینار (دسمبر) میں مجھے بلانے کا وعدہ کر لیا ہے۔ خدا کرے وہ اس وعدے کو پورا کرنے میں کامیاب ہوں۔ براہ کرم آپ اپنے نام رشید صاحب کے خطوط مرتب کر کے چھپوا دیں۔

سب لوگوں کو درجہ بدرجہ سلام و دعا۔

آپ کا

نظیر صدیقی

---

(۱) مضمون مجھے پسند آیا۔ میری نظر سے رشید صاحب کی تحریروں پر ایسی اچھی تنقید نہیں گزری۔ ممکن ہے کسی نے کی ہو لیکن میں ذرا پڑھتا کم ہوں۔ اسلئے میرے علم میں نہیں ہے۔ تحسین ناشناس سے آپ کیا خوش ہوں گے۔ لیکن کتاب ہے اچھی۔ دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں (مکتوب ڈاکٹر ذاکر حسین بنام نظیر صدیقی)۔ یہ خط 'نذر نظیر' ص ۳۳ کے علاوہ 'سویہ ہے اپنی زندگی' میں بھی نقل ہوا ہے (ص ۱۱۳)۔

(۲) اس کتاب کی رسید اور اس پر اپنے تاثرات میں نے ۶/ جولائی کو بھیج دیے تھے۔

(30)

اسلام آباد

۱۱ر اگست ۲۰۰۰ء

برادر مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد، السلام علیکم

آپ کے دونوں خط مل گئے تھے۔ ایک مشفق خواجہ کے ذریعے۔ دوسرا اور کسی کے ذریعے۔ یہ میری کتاب 'رادھا کرشنن' کے بارے میں تھا۔ معلوم ہوا کہ آپ کو رادھا کرشنن کے مطالعے کا موقع بہت کم ملا۔ اس لئے آپ میری کتاب پر اظہار خیال نہیں کرنا چاہتے۔ بہر حال اطمینان یہ ہے کہ کتاب آپ تک پہنچ گئی۔ شاید مولانا آزاد لائبریری کے لئے بھی کتاب آپ ہی کو بھیج دی گئی تھی۔ شیروانی صاحب کو بھی کتاب آپ ہی کے ذریعے پہنچی۔ ان کی طرف سے رسید اور رائے دونوں مل گئیں۔

نہ جانے، آپ صلاح الدین غازی، قریش پور اور عبید اللہ کے معاملے میں اتنے Serious کیوں ہیں۔ ان حضرات کا ادب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اردو کے ادیبوں میں نہیں ہیں۔ صلاح الدین غازی کے بارے میں آپ کو میری کتاب 'سو یہ ہے اپنی زندگی' سے مغالطہ یہ ہوا ہے کہ میں نے صلاح الدین غازی کے بارے میں صفحہ ۱۰۰ پر کچھ لکھا ہے، وہ صلاح الدین محمد ہیں جو بہار ہی کے ہیں۔ میری طرح انہوں نے بھی ڈھاکا یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا۔ وہ میرے Juniors میں سے تھے۔ بعد میں صحافت (انگریزی) اختیار کی۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہ لاہور آ گئے۔ صلاح الدین غازی کے بارے میں لکھ چکا ہوں کہ ان کی کرم فرمائی سے پاکستان کے اہم انگریزی اخبار The News میں مجھے کالم لکھنے کا موقع ملا۔ میں نے چھ سال کالم لکھے۔ لیکن غازی صاحب سے میرا رابطہ نہیں رہتا۔ وہ بڑے مصروف صحافیوں میں سے ہیں۔ کبھی ملاقات تک نہیں ہوتی۔ میری آنکھ کی روشنی رفتہ رفتہ بحال ہو رہی ہے اب کچھ پڑھنے لگا ہوں۔ میری بیگم ان دنوں پٹنہ گئی ہوئی ہیں۔ آپ لوگ مجھے غالب سیمینار میں بلائیں تو آپ لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ غالباً آخری ملاقات۔

آپ کا

نظیر صدیقی

(31)

اسلام آباد

۳۰ر اگست ۲۰۰۰ء

برادر مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد، السلام علیکم

امید ہے کہ آپ کو میرے خطوط مل رہے ہوں گے۔ غالب سیمینار (۱۷ر نومبر تا ۱۹ر نومبر ۲۰۰۰ء) میں شرکت کے لئے کل ڈاکٹر نذیر احمد کا Official دعوت نامہ مل گیا۔ اس کے لئے آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس خط کے ساتھ ڈاکٹر نذیر احمد کے نام بھی دعوت نامے کی رسید اور خط بھیج رہا ہوں۔

میں نے ان سے دو باتوں کی گزارش کی ہے۔ کہ (۱) پاکستان میں ہندوستانی سفارت خانے کے متعلقہ آفیسر کو خط لکھ کر اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ مندوبین کو حسب معمول تین چار جگہوں کا تین مہینے کا ویزا دلوائیں اور (۲) انہیں حسب معمول پولیس رجسٹریشن سے exempt کیا جائے۔ براہ کرم آپ بھی ڈاکٹر نذیر احمد کو ان دو باتوں کی طرف متوجہ کریں۔ میں ان کے دعوت نامے کا جواب دلّی کے پتے پر بھیج رہا ہوں جب کہ ان کا قیام علی گڑھ میں ہے۔ جہاں تک مقالے کے موضوع کا تعلق ہے میں سودا کی غزلیات پر لکھوں گا۔

اس خط کے ساتھ اپنے نام ڈاکٹر ذاکر حسین کے دو خطوط کی فوٹو کو پیز بھیج رہا ہوں۔ نہ جانے آپ کے پاس میری کتاب 'نامے جو میرے نام آئے' ہے کہ نہیں۔ اس میں یہ دونوں خطوط شامل ہیں۔

قریش پور اور عبید اللہ ادیب یا شاعر نہیں ہیں۔ صلاح الدین غازی بھی افسانے لکھتے تھے۔ افتخار عارف نے اپنے کو شاعر کی حیثیت سے establish کر لیا ہے۔ آج کل اکیڈمی آف لٹرز اسلام آباد کے چیرمین بھی ہیں۔ شروانی صاحب کو میرے ہندوستان آنے کے امکان سے مطلع کر دیجئے گا۔

اور سب بدستور۔ جواب کا انتظار رہے گا۔ مخلص

نظیر صدیقی

(32)

اسلام آباد

۹ ستمبر ۲۰۰۰ء

برادر مکرم، السلام علیکم

امید ہے کہ میرا سابقہ خط آپ کو مل گیا ہوگا۔ ڈاکٹر نذیر احمد غالب انسٹی ٹیوٹ کے سیمینار میں میری شرکت کا قوی امکان ہے بشرطیکہ مجھے علی گڑھ کا ویزا مل گیا، دونوں ملکوں کے حالات مزید خراب نہ ہوئے اور میری صحت غنیمت رہی۔ آج کل ویزا کے ملنے میں سختی برتی جا رہی ہے۔ آپ سے ملاقات تو دلّی میں ہو جائے گی لیکن میں معمول کے مطابق تین جگہوں کا ویزا چاہتا ہوں —— (۱) دلّی (۲) علی گڑھ (۳) پٹنہ — علی گڑھ کے ویزا کے لئے آپ کی طرف سے ایک اس طرح کا خط معاون ہو سکتا ہے کہ سنا ہے آپ دلّی کے ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لئے نومبر میں دلّی آرہے ہیں۔ براہ کرم اس موقع پر علی گڑھ ضرور آیئے اور ایک ادبی انجمن .... کوئی بھی فرضی نام دے سکتے ہیں —— کے زیر اہتمام یہاں بھی آپ دو ایک لیکچر دے دیں۔ ایسا موقع پھر نہ جانے کب ملے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے پروفیسر ریاض کو بھی ایک خط لکھا ہے کہ وہ بھی اس طرح کا ایک خط بھیج دیں۔ یہ دنیا ایسی دنیا ہے جہاں نیک کام کے لئے بھی دروغ گوئی سے کام لینا پڑتا ہے۔

کاش ڈاکٹر فصیح نومبر میں (۷ار نومبر سے پہلے) علی گڑھ میں ہوتے۔ آپ انہیں خط لکھ کر بلائیے۔ پھر ہم دونوں کی ملاقات بڑی پُر لطف ہو جائے گی۔ سرور صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ جواب کا شدید انتظار رہے گا۔ امید ہے کہ آپ سب لوگ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا

نظیر صدیقی

(33)

اسلام آباد

۳/ اکتوبر ۲۰۰۰ء

محب مکرم، السلام علیکم

کل آپ کے عنایت نامے کے ساتھ پروفیسر ریاض الرحمٰن، ڈاکٹر اصغر عباس اور ڈاکٹر طارق چھتاری کے دعوت نامے بھی مل گئے۔ میں تینوں دعوت ناموں کے رسمی جواب الگ کاغذ پر آپ ہی کے پاس بھیج رہا ہوں۔ براہ کرم یہ جوابات متعلقہ حضرات کے پاس پہنچوادیں۔ اگر علی گڑھ کا ویزا مل گیا تو تینوں تقاریب میں میری شرکت اور آپ حضرات سے ملاقات یقینی ہے۔

امید ہے کہ آپ بمع اہل خانہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ آپ کی زحمتوں کے لئے بے حد شکر گزار ہوں (۱)۔

مزید: آپ کا ایروگرام مورخہ ۲۴/ ستمبر بھی مل گیا۔

ممنون کرم

نظیر صدیقی

---

(۱) یہ نظیر صدیقی صاحب کا میرے نام آخری خط ہے۔

گیان چند کے خطوط بنام سیّد محمد حسنین

پروفیسر سید محمد حسنین (۲؍اکتوبر ۱۹۲۰-۱۰؍اکتوبر ۱۹۹۹ء) ممتاز ادیب، خاکہ و انشائیہ نگار اور اردو کے پروفیسر تھے۔ ان کی کتاب 'انشائیہ اور انشائیے' بہت مشہور ہے۔ اُن کے نام پروفیسر گیان چند کے یہ خطوط بیگم حسنین سے ڈاکٹر ظفر کمالی نے حاصل کیے تھے۔ جنھیں پہلی بار اوراق کے صفحات کے ذریعے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس عنایت کے لئے ادارہ اپنے دونوں محسنین کا شکر گزار ہے۔

مدیر

(1)

کنال روڈ جموں (توی)

۳۱-۱۲-۶۹

''سفینہ نثر'' کے بارے میں رائے کے لیے چٹھی کئی روز پہلے ملی تھی لیکن میں پہلے سے جواب نہ دے سکا۔ میں نے ۱۲؍دسمبر کو ہرنیا کا آپریشن کرایا۔ ہرنیا آنت اترنے کی بیماری کو کہتے ہیں۔ آپریشن ٹھیک ہو گیا اور میں اب اچھا ہوں۔ آپ کی چٹھی اسپتال میں ملی تھی۔ گھر آنے کے بعد بھی عرصے تک نقاہت رہی اور میں خطوں کا جواب نہ دے سکا۔ آج بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ کل پرسوں آپ کے پاس سے تقاضے کا دوسرا خط موصول ہوا۔

میں نے دو ایک اور مزاحیہ مضمون لکھے ہیں۔ ایک ''غالب اور طاؤس'' کے عنوان سے ''کتاب'' لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ امید ہے نظر سے گزرا ہوگا۔ ایک ''غالب اور نامہ بر'' کے عنوان سے زیر طبع ہے۔ یاد نہیں آتا کس رسالے میں بھیجا ہے۔ ''سفینہ نثر'' کے بارے میں رائے دیر سے دینے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

گیان چند

(2)

جموں

۲۳-۷-۷۳

محترم! تسلیم

''سفینہ نثر'' کے لئے سوال نامہ بھر کر بھیج رہا ہوں۔ پاسپورٹ سائز کی تصویریں بعد میں بھیجوں گا کیوں کہ

ابھی میرے پاس ہیں نہیں۔

آپ کا یہ پروجیکٹ نہایت مفید اور دلچسپ ہے۔ مجھے اس کی تکمیل کا انتظار ہے۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص

گیان چند

(3)

شعبۂ اردو

جموں یونیورسٹی، جموں-۱۸۰۰۰۱

۳۱راگست ۸۷ء

محترم حسنین صاحب! تسلیم

کرم نامہ ملا۔ میں کلیم الدین احمد کی کتاب اردو زبان اور فنِ داستان گوئی پر مضمون لکھ کر ستمبر کے وسط تک آپ کو ضرور بھیج دوں گا۔ لائبریری سے کتاب لے آیا ہوں۔ چار پانچ دن بعد اس پر لکھنے کی نوبت آجائے گی۔

ارمغانی کتابوں میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھنا مالک رام کی وضع کردہ بدعت نہیں بلکہ یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ براؤن نے فارسی ادبیات کی تاریخ لکھی تھی۔ میں نے اسے پیش کردہ جلد دیکھی ہے جو تقریباً ۱۹۳۰ء کی تھی اور کیمبرج یونیورسٹی نے پیش کی تھی۔ اس میں ایک بھی مضمون براؤن سے متعلق نہ تھا۔ سب دوسرے موضوعات پر تھے۔ اسی طرح حال میں جنوب کے ایک شاعر Asan کو انگریزی مضامین کی ایک جلد پیش کی گئی اس میں ایک مضمون گوپی چند نارنگ کا بھی ہے یاد نہیں، اس جلد میں ایک دو مضمون اس 'آسن' کے بارے میں تھے یا نہیں۔ سب کے سب مختلف زبانوں کی شاعری کے بارے میں تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس شخص کو یادگاری جلد پیش کی جائے تمام مضامین اس موضوع یا اس علم و فن کے بارے میں ہونے چاہئیں جو صاحبِ ارمغان کی دلچسپی کا رہا ہو۔ مثلاً عرشی اور مالک رام کو تحقیق بالخصوص غالبیات کے مضامین کی جلد دینی چاہیے تھی اور ذاکر حسین کو تعلیم، سیاست، بچوں کی کہانیوں وغیرہ سے متعلق مضامین کی۔ اگر آپ کلیم الدین صاحب کو انھیں سے متعلق مضامین کی جلد پیش کر رہے ہیں تو معیاری شیوۂ عام سے ہٹ رہے ہیں۔ بہر حال میرے لیے ان کی کتاب پر لکھنا بہت آسان ہے اور لکھ کر بھیج دوں گا۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

(ہندی میں ہرشوم داس ٹنڈن (کذا) کا ارمغان دیکھا۔ کچھ مضامین ان کے بارے میں اور بقیہ ہندی لسانیات پر تھے)۔

مخلص

گیان چند

(4)

شعبۂ اردو
جموں یونیورسٹی، جموں-۱۸۰۰۰۱
۶/اکتوبر ۸۴ء

محترم تسلیم

''حیاتِ کلیم'' کے لیے مضمون میں دیر سے بھیج رہا ہوں۔ایک طرف کثرت کار دوسری طرف پریشانیاں، مل کر کام کے لیے بہت کم وقت چھوڑتی ہیں۔ میں نے ۲۱یا ۲۲ ستمبر کو اس مضمون کا مسودہ مکمل کرلیا۔صرف آخری صفحہ جو اسلوب سے متعلق ہے لکھنا رہ گیا تھا۔ادھر فون سے خبر ملی کہ میرے منجھلے بھائی (مجھ سے بڑے) بیمار ہیں اور انھیں دلّی میں میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخل کیا گیا ہے۔ مجھے فوراً دلّی بلایا گیا۔انھیں ڈیڑھ ماہ قبل فالج کا حملہ ہوا تھا۔میرٹھ میڈیکل کالج میں لے گئے۔وہاں دماغ میں پھوڑے کا شبہہ ہوا۔دلّی میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں لے گئے۔وہاں تشخیص ہوئی کہ جسم میں جگہ جگہ کینسر ہے یعنی پھیپھڑے، ریڑھ کی ہڈی اور مغز میں۔ جاں بری کی کوئی امید نہیں اس لیے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ہم انھیں وطن لے گئے جہاں میں چند روز رہ کر جموں آ گیا۔حیاتِ مستعار کا وہ ایک آدھ ماہ اور پورا کرسکیں گے۔ میں ۲/اکتوبر کو واپس آیا اس کے بعد مسودہ مکمل کیا اور آپ کو بھیج رہا ہوں۔

کلیم الدین صاحب علمی اختلافات کی اجازت دیتے ہیں اس لیے اس مضمون میں میں نے جگہ جگہ ان سے اختلاف کیا ہے۔درخواست ہے کہ آپ مضمون کو بے کم وکاست شامل کرلیجے۔اگر کہیں اعتراض ہو تو مجھے لکھیے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس میں قابلِ اعتراض کوئی مقام نہیں۔پورے مضمون کا لہجہ احترام آمیز ہے۔ میں نے پورے انصاف کے ساتھ لکھا ہے۔مضمون کی رسید سے مطلع کیجئے اور یہ بھی لکھئے کہ کیا یہ مجموعے میں شامل ہو سکے گا۔صرف جاننے کی خاطر دریافت کرتا ہوں کہ پٹنے میں پروفیسر کے تقرر کا کیا ہوا؟ وہاں کون کون امیدوار ہیں اور کب تک انتخاب ہوگا۔

یکم اکتوبر کو میں جامعہ ملیہ دلّی کے پروفیسر کے انتخاب میں گیا تھا۔میرے علاوہ سرور صاحب اور رفیعہ سلطانہ ماہرین تھے۔وہاں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو منتخب کیا گیا۔

ڈاکٹر شکیل الرحمن ایک دو ماہ کے لئے روس کے دورے پر گئے ہیں۔شاید وہ بھی پٹنہ میں امیدوار ہیں۔

بہار کی شورشوں کے بعد اب تو اُدھر امن ہونا چاہئے۔آپ کا مزاج بخیر ہونے کی دعا مانگتا ہوں۔

مخلص

گیان چند

(5)

۲۷۰ کرشنا نگر

جموں - ۱۸۰۰۰۱

۸ردسمبر ۷۴ء

محترم ڈاکٹر صاحب! تسلیم

''شاعر'' کے قومی یکجہتی نمبر میں آپ کا پتا دیکھا۔ میں نے ایک عرصہ ہوا کلیم الدین صاحب کی کتاب ''اردو اور فن داستان گوئی'' پر مضمون لکھ کر آپ کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ رجسٹری سے نہیں بھیجا تھا۔ رسید سے محروم ہوں۔ معلوم نہیں آپ کو ملا یا نہیں۔ اگر ملا تو کیا وہ مجموعے میں شامل ہو سکے گا یا بعد از وقت پہنچا۔

شاید ایک دو مہینہ قبل پٹنہ میں پروفیسر کی پوسٹ کا انٹرویو ہوا ہوگا۔ کون منتخب ہوئے؟ کون لوگ ماہرین تھے اور مسترد ہونے والے قابل ذکر امیدوار کون تھے؟ آپ کی صحت کیسی رہتی ہے۔

کیا مظفر پور میں اردو اساتذہ کی کانفرنس ہونے کی امید ہے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ جواب میرے گھر کے پتے پر دیجئے۔

خادم

گیان چند

(6)

۲۷۰ کرشنا نگر، جموں-۱۸۰۰۰۱

۱۱رجنوری ۷۵ء

محترم ڈاکٹر صاحب! تسلیم

نئے سال کا تہنیت نامہ ملا۔ تہ دل سے مشکور ہوں۔ خدا آپ کو بھی یہ سال گزشتہ برسوں سے بہتر ثابت کرے۔

آپ نے اپنے الفت نامے میں میرا پتا 544A گاندھی نگر لکھا ہے۔ یہ میرا پرانا پتا ہے۔ گزشتہ جولائی میں میں مکان بدل کر موجودہ مکان میں آ گیا۔

میں نے جناب کلیم الدین احمد کی 'اردو اور فن داستان گوئی' پر ایک مضمون لکھ کر بھیجا تھا۔ براہ کرم مطلع کیجئے کہ وہ ملا یا نہیں اور مجموعے میں شامل ہو سکا یا نہیں۔ اس سلسلے میں میں دو بار پہلے بھی استفسار کر چکا ہوں لیکن شاید میرا عریضہ آپ کو نہیں ملا۔

آپ کا تہنیت نامہ سارے کا سارا اردو زبان میں ہے لیکن رومن خط میں ہے۔ یہ اس بات کا غماز ہے کہ

آپ اردو کو عربی خط میں باقی نہیں رکھنا چاہتے اور صرف رومن میں لکھنے کے مبلغ ہیں۔ امید ہے مزاج عالی بخیر ہوگا۔
پٹنہ میں پروفیسر کے تقرر کا کیا ہوا؟

خادم

گیان چند

(7)

۲۷ کرشنا نگر، جموں-۱۸۰۰۰۱

۳۰رجنوری ۵۷ء

محترم حسنین صاحب! تسلیم

۳۰ر دسمبر کا کرم نامہ دو تین دن پہلے ملا۔ یہ آپ میرا پتا کہاں سے دیکھ کر لکھتے ہیں۔ آپ نے 544A گاندھی نگر پتا لکھا ہے۔ میں اس مکان کو وسط جولائی ۷۴ء میں چھوڑ آیا ہے (کذا)۔ میں نے آپ کو جو مضمون بھیجا اور اس کے بعد جتنے خطوط لکھے، سب میں موجودہ مکان کا پتا ۲۷ کرشنا نگر لکھا، لیکن آپ گاندھی نگر کا پتا لکھتے رہے۔ اسی وجہ سے کئی خطوط سے محروم رہا۔

یہ بہت بڑی بات ہے کہ ایف آر لیوس کا مقالہ مل گیا ہے۔ یہ کلیم صاحب کے شایانِ شان رہے گا۔

مجھے 'نوید' کا شمارہ نہیں ملا۔ میرے لیے یہ نام نیا ہے۔ آپ کو میرے گھر کا پتا یاد نہ رہے تو شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں کا پتا لکھ دیجئے۔ میرے موجودہ مکان اور جموں یونیورسٹی دونوں کا پن کوڈ نمبر ۱۸۰۰۰۱ ہے۔

حیرت ہے کہ پٹنہ میں شیخ فرید (فریدی نہیں) کو ماہر بنا کر بلایا گیا۔ وہ جبلپور کے سرکاری کالج میں پروفیسر ہیں۔ جبلپور یونیورسٹی کا اپنا شعبۂ اردو نہیں۔ شیخ فرید کا اسکیل 1100-700 ہے۔ ریڈر سے کچھ کم۔ انھیں پروفیسر کے لیے ماہر بنا کر نہ بلانا چاہئے تھا۔ اردو ادب میں بھی ان کا نام نہیں۔ کوئی کتاب انھوں نے شائع نہیں کی۔ وہ دسمبر ۷۴ء میں ریٹائر ہونے والے تھے۔ ۶ ماہ کی توسیع مل گئی ہے اور اب غالباً مئی میں ریٹائر ہوں گے۔ پٹنہ میں دوسرے ماہر غالباً آل احمد سرور صاحب تھے۔ معلوم نہیں وہ کیوں نہیں پہنچے۔ یا آپ کا مطلب ہے کہ سرور صاحب اور شیخ فرید پہنچے۔ مجھے علم نہیں کہ شیخ فرید ڈاکٹر ہو گئے ہیں، غالباً نہیں۔ جب تک میں بھوپال میں تھا تب تک ڈاکٹر نہیں ہوئے تھے۔ آپ نے یہ واضح نہیں کیا کہ کمیٹی کا فیصلہ کس کے حق میں ہوا تھا۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ میرے بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ کیا آپ نے اپنے دولت خانے کا نام زینت اماں کی یاد میں رکھا ہے؟

خادم

گیان چند

(8)

۲/۷۰ کرشنا نگر، جموں-۱۸۰۰۰۱

۱۰ر فروری ۷۵ء

محبی، ڈاکٹر صاحب! تسلیم

۳ر فروری کا کرم نامہ ملا۔ آپ نے اسے سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ کے ساتھ خواہ مخواہ بھیجا۔ اب کی بار آپ نے موجودہ مکان کا پتا لکھا ہے اس لیے مل گیا۔

تہنیت نامے کے بارے میں میں نے مذاق میں آپ کو لکھ دیا تھا کہ آپ اردو کے لئے رومن خط کے حامی ہیں۔ ایک چھیڑ مراد تھی اور بس۔ جس طرح پچھلے خط میں میں نے لکھا تھا کہ آپ نے اپنے دولت خانے کا نام 'امان' 'زینت امان' کی یاد میں رکھا ہے۔

نوید کا کوئی شمارہ مجھے نہیں ملا۔ نہ شمارہ ۱، نہ شمارہ ۲۔ آپ انھیں میرے گھر کے پتے پر یا گیان چند شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی کے پتے پر بھیج دیجئے۔

میرے بڑے بھائی کی طبیعت رو بہ زوال ہے۔ کسی دن بھی بری خبر آسکتی ہے۔ یہ ماہ پورا نہ کرسکیں گے۔

معلوم ہوا پٹنہ یونیورسٹی کا انٹرویو ۱۳ر فروری کو ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن بھی انٹرویو دینے گئے تھے۔ مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سنا ہے سرور صاحب اور خواجہ احمد فاروقی ماہرین میں ہیں۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ ابھی نوید شمارہ ۲ مل گیا۔ تفصیل سے پھر لکھوں گا لیکن پہلا تاثر یہ ہے کہ آپ نے یہ بہت بڑا کام کیا ہے۔

مخلص

گیان چند

(9)

۲/۷۰ کرشنا نگر، جموں-۱۸۰۰۰۱

۲ر دسمبر ۷۵ء

محبِ محترم! تسلیم

۲۰ر نومبر کا گرامی نامہ ملا۔ میں نے آپ کے پچھلے خط کا جواب گھر کے پتے پر دیا تھا۔ شاید نہ پہنچا ہو۔ میں نے آپ کو اپنے یہاں کے تحقیقی موضوعات یونیورسٹی کے پتے پر بھیجے تھے۔ امید ہے مل گئے ہوں گے۔

میرے مجھلے بھائی جو کینسر میں مبتلا تھے ۱۱/ مارچ کو جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ زندگی کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اب میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس گلے کا آپریشن کرانے جے پور گئے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ آپریشن کے بعد کینسر

دریافت نہ ہوجائے۔ زیادہ وتر تو یہی خیال ہے کہ خدشے کی کوئی بات نہیں۔

یہ جان کر اطمینان ہوا کہ 'حیات کلیم' کے مضامین شائع ہورہے ہیں ڈاکٹر نرمدیشور پرشاد کی موت یقیناً دردناک ہے۔ کل کے اخبار میں پڑھا کہ اردو تحقیق کا ستون اعظم (یعنی قبلہ مسعود حسن رضوی ادیب) گر گیا۔ افسوس صد افسوس!

مخلص

گیان چند

(10)

۷-۲ کرشانگر، جموں-۱۸۰۰۰۱

۲۵ر مارچ ۷۶ء

محبی! تسلیم

۱۹ر مارچ کا کرم نامہ دو تین دن قبل ملا تھا۔ شکریہ۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس اب ٹھیک ہیں اور کچہری جانے لگے ہیں۔

آج کل میں معاصر کے قاضی عبدالودود نمبر کے لئے مضمون مکمل کر رہا ہوں۔ افسوس کہ میرے پاس ان کے جملہ مضامین نہیں۔

انشاءاللہ جموں یونیورسٹی انجمن اساتذہ کی آئندہ کانفرنس کی میزبان ہوگی۔ اکتوبر ۷۶ء میں اجلاس کی تجویز رکھوں گا۔ ابھی ضابطے کی کچھ کاروائی باقی ہے اس کے بعد اعلان کر دیا جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب 'حیاتِ کلیم' شائع ہونے والی ہوگی۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

گیان چند

(11)

۸۴۶ یونیورسٹی روڈ

الہ آباد-۲۱۱۰۰۲، ۱۳ر ستمبر ۷۸ء صبح

محب محترم

کل شام آپ کے کنٹرولر امتحانات کا ضروری تار ملا کہ آپ کے موڈریشن بورڈ کی میٹنگ ۱۸ر ستمبر کو ہوگی۔ یہ تار ۸ر ستمبر کو دیا گیا تھا اور کل بارہ ستمبر کی شام کو ملا۔

ریڈیو نے کہا ہے کہ اس ہفتے کے آخر تک بہار میں سیلاب کی صورتِ حال تشویشناک رہے گی۔ ایسے میں

کیوں سفر کروں اور مشکل میں مبتلا ہوں۔ بہار کی طرف کی بڑی لائن کی گاڑیاں شاید آج سے چلیں گی۔ راستے درہم برہم ہیں۔ گاڑیاں کافی Late ہو سکتی ہیں۔

میں آپ سے ایک بار پھر معذرت چاہتا ہوں اور میرا یہ رویہ آپ سے مخصوص نہیں۔ بھارتیہ گیان پیٹھ کی ایک اردو کمیٹی ہے جس کے صدر آل احمد سرور ہیں اور ارکان گوپی چند نارنگ اور میں ہوں۔ انھوں نے ۸رستمبر کی تاریخ رکھی تھی۔ اب سے پہلے ہی میں نے سرور صاحب کو معذرت کا خط لکھ دیا۔ یہ میٹنگ دلّی میں ہوتی ہے۔ اب پھر نئی تاریخ کے لیے دریافت کیا ہے اور میں نہ جاؤں گا خواہ کوئی بھی تاریخ رکھی جائے۔

باہر جانے سے اہلیہ کو کم از کم دو رات اور ایک دن کے لیے تنہا چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ چونکہ میں اپنی کم توفیقی کے باعث آپ کے یہاں نہیں آسکتا اس لیے مجھے اجازت دیجیے کہ میں رکنیت سے اپنا نام واپس لے لوں۔

آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ درگانند سنہا کی معرفت دستی رقعہ ملا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میٹنگ تو ۲۸ر اگست کو ہو چکی ہوگی۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ شاید ۸رستمبر کو پٹنہ میں پروفیسر کا سلکشن ہوا ہو پٹنہ یونیورسٹی کے لیے۔

مخلص

گیان چند

(12)

شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی-الہ آباد

۲۴رجنوری ۷۹ء

مکرمی! تسلیم

''سفینۂ نثر'' کے سلسلے میں جن صاحب نے چٹھی لکھی ہے ان کا نام نہ پڑھا جا سکا اس لئے متعلقہ معلومات آپ ہی کو فراہم کر رہا ہوں۔ الہ آباد یونیورسٹی کے اردو اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ڈاکٹر گیان چند - پروفیسر

ڈاکٹر سید محمد عقیل - ریڈر

ڈاکٹر سید ظل حسنین عابدی - لکچرر

ڈاکٹر جعفر رضا - لکچرر

ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی - لکچرر

ڈاکٹر احمد حسین - لکچرر

جناب عبدالحامد - لکچرر

ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد - لکچرر

ڈاکٹر عطیہ نشاط خاں - لکچرر

یہاں کے اردو ناشرین کے پتے یہ ہیں :

۱۔ کتابستان۔ نمبر ۳۰ چک الہ آباد-۳

۲۔ شاہین پبلی کیشنز۔ حسن منزل، الہ آباد-۳

۳۔ شبستان۔ ۲۱۸ر شاہ گنج، الہ آباد-۳

۴۔ رام نرائن لال بنی مادھو۔ کٹرہ، الہ آباد-۲

۵۔ رام دیال اگروال۔ کٹرہ، الہ آباد-۲

۶۔ نکہت پبلی کیشنز۔ رانی منڈی، الہ آباد-۳

۷۔ شب خون کتاب گھر۔ رانی منڈی، الہ آباد-۳

۸۔ رائٹرز گلڈ ۲۸ ٹرز ہوسٹل۔ ایونگ کرسچین کالج،، الہ آباد

۹۔ انجمن تہذیب نو۔ ۲۷ چک، الہ آباد

۱۰۔ ادارۂ انیس اردو۔ قومی لائبریری، چوک الہ آباد

۱۱۔ ایوان پبلشر۔ نخاس کہنہ، الہ آباد

نیاز مند

گیان چند

(13)

شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

۱۹ر مارچ ۱۹۸۱ء

مخمی! تسلیم

رسالہ 'مشام' ملا۔ شکریہ۔ اب آپ نوید سے ہٹ کر مشام جاں کو معطر کرنے لگے۔ آپ نے یہ رسالہ میرے سابق الہ آباد کے پتے پر بھیجا ہے۔ اللہ رے بے خبری۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں کوچہ گرد الہ آباد چھوڑ کر حیدرآباد آ گیا

ہوں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

رسالے کے کئی مضامین میں نے دلچسپی سے پڑھے، خصوصاً ڈاکٹر چند انند سنہا پر۔

مخلص

گیان چند

(14)

شعبۂ اردو،

یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱،

۴رمئی ۱۹۸۱ء، سوموار

مجی! تسلیم

۲۴راپریل کا تو اُم پوسٹ کارڈ پرسوں ۲رمئی سنیچر کو ملا۔ معلوم ہوتا ہے میں نے آپ کے کرم نامے کا جواب اس لیے نہیں دیا کہ کتاب حاصل ہو جائے تو لکھوں۔

دیکھئے صاحب دو یونیورسٹیاں ہیں۔ ایک ریاستی حکومت کی عثمانیہ یونیورسٹی، دوسرے مرکزی حکومت کی یونیورسٹی آف حیدرآباد جہاں یہ روسیاہ ہے۔ آپ کے کتاب دار عثمانیہ یونیورسٹی میں گئے ہوں گے۔ وہاں فیکلٹی کلب نام کی کوئی عمارت نہیں۔ یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں ہر طرف ریڈی ہی ریڈی ہیں۔ معلوم نہیں آپ کے حامل کتاب نے یہ پارسل کس ریڈی کو دے دیا۔ میں نے مغنی تبسم اور سیدہ جعفر سے کہا تھا کہ معلوم کر سکیں تو کر دیں۔ ابھی تک ان میں سے کوئی خبر نہیں لایا۔ اگر کبھی کتاب مل گئی تو آپ کو خبر کردوں گا۔

میں گرمیوں بھر حیدرآباد رہوں گا۔ کتاب کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مخلص

گیان چند

(15)

شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱

۶رجنوری ۱۹۸۳ء

مخی! تسلیم

نئے سال کی خواہشات کا تہنیت نامہ ملا۔ تہہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ کو بھی یہ سال مبارک ہو۔

آپ نے لکھا ہے 'مشتاقِ دید'۔ لوگ کہتے ہیں کہ انجمن ترقیِ اردو کی مارچ ۸۲ء کی حیدرآباد کانفرنس میں

آپ تشریف لائے تھے۔ اس کے بعض اجلاسوں میں میں بھی تھا۔ میں نے آپ کو نہیں دیکھا۔ آپ حیدرآباد آئے ہوتے تو مجھ سے ضرور ملتے۔

مجھے اس سال اردو کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا ہے۔ میری کتاب "ذکر وفکر" ہرگز اس کی مستحق نہ تھی۔ ممکن ہے آپ اس کی بھی مبارک باد بھیجیں اس لیے پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کیونکہ روزانہ اس سلسلے کے آٹھ دس جواب لکھنے ہوتے ہیں۔ بہار میں پروفیسروں کی ایک کھیپ کی کھیپ آگئی ہے لیکن آپ ہنوز محروم ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بیش تر آپ کے مقابلے میں کم معروف ہیں۔ گیا میں بھی پروفیسر کا تقرر ہونا چاہیے۔

معاصر کے حالیہ شمارے میں قاضی عبدالودود نے میرے اور آپ کے بارے میں نازیبا الفاظ میں لکھا۔ مختار الدین آرزو کے بارے میں بھی جو لکھا، اس انداز سے لکھنا مناسب نہ تھا۔

مخلص

گیان چند

(16)

شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد— ۵۰۰۰۰۱

۵ر فروری ۱۹۸۳ء

مخی! تسلیم

آپ کا ۱۸ر جنوری کا کرم نامہ کل ملا۔ شکریہ۔ آپ بھی خوب چیز ہیں کہ حیدرآباد آئے۔ جلسہ گاہ میں دونوں موجود تھے اور آپ بغیر علیک سلیک کے چلے گئے۔ دوسروں کے پروفیسر ہو جانے اور آپ کے ہنوز نہ ہونے پر حافظ کا شعر یاد آتا ہے

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالان

طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم

واقعی یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ قاضی صاحب جو دوسروں پر فراخ دلی سے اعتراضات کرتے ہیں خود پرستائش مضمون نگاروں کے بھی دو ایک اعتراضات کی تاب نہیں لا سکتے۔

'نمود ہستی' نہیں ملی۔ اسے تلاش کرنا لا حاصل ہے۔ یکم جولائی ۸۲ء کو ہرنیا کا آپریشن کرایا تھا، دوبارہ ہو گیا۔ ۱۹ر جنوری ۸۳ء کو پھر اسی طرف آپریشن کرایا۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔

مخلص

گیان چند

(17)

گھر کا پتا- A15 اسٹاف کوارٹرس

سنٹرل یونیورسٹی پوسٹ آفس، حیدرآباد-۵۰۰۱۳۴

دفتر کا پتا- شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد-۵۰۰۰۰۱

۲؍اپریل ۸۳ء

مخی! تسلیم

کرم نامہ ملا۔ آپ نے گھر کا پتا لکھا اور شعبے کی پن کوڈ لکھ دی۔ بہر حال خط مل گیا مشکور ہوں۔

میں نے آٹھ دس سال سے امتحان کے پرچے بنانا اور کاپیاں جانچنا یک قلم ترک کر دیا ہے۔ اگر آپ کی یونیورسٹی سے کوئی پرچہ آیا ہوگا تو میں نے بواپسی ڈاک انکار کر دیا ہوگا۔ اس لیے ضروری کارروائی کیجیے۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص

گیان چند

(18)

شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۱

۲۲؍نومبر ۱۹۸۳ء

مجی! تسلیم

تراشہ ملا۔ یونیورسٹی پروفیسر ہونا مبارک ہو۔ بہت دیر سے حق ملا۔ دیر آید درست آید۔

میرے گھر کا پن کوڈ آپ نے ۵۰۰۰۰۱ لکھا ہے۔ دراصل گھر کا پتا یہ ہے:

A15 سنٹرل یونیورسٹی پوسٹ آفس، حیدرآباد-۵۰۰۱۳۴

مخلص

گیان چند

(19)

شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۱

۸؍جنوری ۱۹۸۴ء

مجی! تسلیم

پروفیسری مبارک ہو۔ نیا سال مبارک ہو۔ نئے سال کی تہنیت کا شکریہ۔ کارڈ بہت چھوٹا ہے اور اس میں کوئی

نقش ونگار نہیں۔ مزا نہیں آیا۔

مخلص

گیان چند

(20)

شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۱

۲-۷-۸۴ء

محبی! تسلیم

'مشام' مئی میں ملا تھا۔ اس کے بعد میں ایک ماہ کے لیے وطن چلا گیا۔ آپ کو رسید نہ بھیج سکا۔ کبھی آپ اپنے پرچے کا نام 'نوید' رکھتے ہیں کبھی 'مشام'۔ اس میں حسین الحق شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی کا مضمون "فقۂ ہندی" اور "محشر نامہ" ہے۔ اب یہ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ یہ مختلف کتابیں ہیں۔ ان کو ایک ثابت کرنے کی کوشش تحصیل حاصل ہے۔ واضح ہو کہ محبوب عالم اور شیخ جیون دو مختلف شخصیتیں ہیں۔ جیون کی فرمائش پر محبوب عالم نے محشر نامہ لکھی۔ محبوب عالم کی ایک کتاب مسائلِ ہندی ہے۔ مضمون نگار صاحب سے کہیے کہ وہ مقالاتِ شیرانی جلد دوم میں شیرانی کا مضمون "اردو کی شاخ ہریانی زبان میں تالیفات" ضرور پڑھ لیں۔ اس میں شیرانی نے 'پنجاب میں اردو' کی غلط بیانیوں سے رجوع کیا ہے۔

آپ کا طویل مضمون سید کاظم حسین جمیل مظہری پڑھا۔ معلومات افروز اور مفید ہے۔ ص ۱۶۲ پر آپ نے یہ 'جلابیاں' کیا لفظ لکھا ہے۔ اسے عام طور پر 'جلیبیاں' کہا جاتا ہے۔ کیا بہار میں جلیبی کو جلابی کہتے ہیں۔

مشام اچھا رسالہ ہے لیکن مستقل اور مسلسل نہیں نکلے گا۔ اگلے سال کسی اور نام سے ظاہر ہوگا۔

کسی دوسرے رسالے "مریخ" یا "آہنگ" میں آپ کی اہلیہ کا مضمون قاضی عبدالودود کے بارے میں پڑھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب آپ سے خاصے نزدیک تھے۔ آزردگی شاید آخر آخر میں ہوئی ہوگی۔

امید کرتا ہوں کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

گیان چند

(21)

شعبۂ اردو

سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد- ۵۰۰۱۳۴

۷راگست ۱۹۸۷ء

محبی! تسلیم

عزیزی امتیاز حسنین کی شادی خانہ آبادی ہو چکی۔ مجھے دعوت نامہ آج ملا۔ بہر حال مشکور ہوں، مسرور ہوں۔

آپ کو مبارکباد بھیجتا ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ یہ رشتۂ مناکحت فریقین کے لیے دائمی شادمانی کا موجب ثابت ہو۔

میں فروری ۸۷ء کے آخر میں رٹائر ہوا۔ اپریل ۸۹ء کے آخر تک کے لیے توسیع مل گئی ہے لیکن اب میں صدر شعبہ نہیں ہوں۔ اب آپ پٹنہ منتقل ہو گئے ہیں۔ وہاں بھی مکان کا نام الامن رکھا ہے۔

آپ نے ''سہیل'' میں میرا مضمون ''قاضی عبدالودود اور میں'' پڑھا؟ کیا تاثر ہے؟

مخلص

گیان چند

(22)

شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی

حیدرآباد-۵۰۰۱۳۴

۳۰ رمارچ ۱۹۸۹ء

محبی! تسلیم

آپ کی دو تصانیف ''نشاطِ خاطر'' اور ''خطوط شبلی بنام آزاد'' بقلم شبلی کئی دن پہلے ملیں۔ میں ایک کتاب کی تکمیل میں اتنا مصروف تھا کہ دو ہفتے سے ڈاک کو ہاتھ نہ لگا (کذا)۔ آپ کی عنایات کا برابر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خطوط شبلی بیش بہا کتاب ہے۔ انھیں کے خط میں لکھا ہونے کے سبب اس کی قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔

میں اپریل کے آخر میں رٹائر ہو رہا ہوں۔ ابھی یہ مکان چند مہینے تک رکھوں گا۔ مئی رجون میں لکھنؤ جا کر وہاں کسی مکان کا بندوبست کروں گا۔ بعد میں یہاں آ کر سامان لے جاؤں گا۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

گیان چند

(23)

۹/۲۵- اندرا نگر

لکھنؤ-۲۲۶۰۱۶

۲۶ ردسمبر ۱۹۹۰ء شام

محبی! تسلیم

آپ کی گراں قدر تالیف انشائیہ اور انشائیے کا پانچواں ایڈیشن دو تین دن پہلے ملا۔ اس کے لیے تہہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ نے اس بار انشائیے پر پاکستان اور دوسری کتابوں سے جو اقتباسات دیے ہیں وہ بطور خاص مفید ہیں۔ ان میں سے کئی کتابیں میری نظر سے نہیں گزریں۔

بک پوسٹ پارسل میں چٹھی نہیں رکھی جا سکتی۔ آپ نے اس قدغن کا احترام کرتے ہوئے الگ سے چٹھی تو

نہیں رکھی خود کتاب کے اندر کے ورق ہی پر چٹھی لکھ دی۔ کسی بھی کتاب کا پانچواں ایڈیشن نکلنا واقعی بڑا کسب ہے۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

گیان چند

(24)

۹/۲۵ - اندرا نگر

لکھنؤ-۲۲۶۰۱۶

۲۳ر فروری ۱۹۹۱ء

محبی! تسلیم

آپ کا ۱۸ر فروری کا کرم نامہ پرسوں ملا۔ شکریہ۔ افسوس کہ میرے پاس "تحقیق کا فن" کی محض ایک جلد ہے جو میرے استعمال کے لیے ہے۔ میں آپ کی خدمت میں پیش نہیں کر سکتا۔ ۹۸۳ صفحوں کی اس کتاب کی قیمت محض ۵۰ روپے ہے۔ اگر آپ کا اشتیاق شدید ہو تو پٹنہ کے کسی کتب فروش سے خرید لیجیے۔

آپ نے یہ نہیں لکھا کہ انشائیہ اور انشایئے کی ۵ جلدیں آپ نے کس سلسلے میں اکادمی میں داخل کی تھیں؟ انعام کے لیے یا بک ڈپو میں فروخت کے لیے؟ اگر انعام کے لیے داخل کی ہیں تو ان کی رسید کیوں ملے گی؟ جن عزیز سے داخل کی تھی انھوں نے رسید لی ہوگی۔ بہر حال میں جب اکادمی جاؤں گا، معلوم کروں گا۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

گیان چند

توجہ :

۱۔ قلمکار حضرات سے گذارش ہے کہ تحریریں صاف و خوشخط بھیجیں۔ زیراکس کاپی بھیجنے کے بجائے اصل بھیجیں اور زیراکس اپنے پاس محفوظ رکھیں۔

۲۔ جب تک مضامین کی عدم اشاعت کی اطلاع نہ دی جائے اُس وقت تک کسی اور جگہ اشاعت کے لئے نہ بھیجیں۔

۳۔ نمونے کی کاپی اور جواب طلب امور کے لئے مناسب ڈاک ٹکٹ بھیجیں۔ (ادراک)

پروفیسر نثار احمد فاروقی

امیر خسروؔ کی مثنوی نگاری

امیر خسروؔ کے بارے میں مولانا شبلی نے لکھا تھا:

"ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجے کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کیے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو تو اُن کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری، بے شبہ اقلیم سخن کے جم و کے ہیں مگر ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی۔ حافظ، عرفی نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے اور انوری غزل کو چھو نہیں سکتا لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع وبدائع کا تو شمار نہیں"۔

اس وقت ہم صرف امیر خسرو کی مثنوی نگاری سے بحث کریں گے۔ مثنوی ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں واقعہ نگاری ہوتی ہے۔ اگر کسی واقعے کو نثر یا نظم میں سپاٹ طور پر بیان کر دیا جائے تو وہ دائرہ ادب سے خارج ہو جاتا ہے، اس لیے اُس میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مضمون آفرینی کا سہارا لینا پڑتا ہے کہ ان سے ہی ادبی لطافت اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔

واقعہ نگاری بھی کئی قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک مثنوی رزمیہ ہوتی ہے جس میں کسی قوم کے مفاخر بیان ہوتے ہیں یا کسی عظیم تاریخی حادثے کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ اس کا سب سے اعلیٰ و ارفع نمونہ فردوسی طوسی کا شاہنامہ ہے جسے فارسی ادب میں بقائے دوام کا مرتبہ حاصل ہے۔ دوسری قسم عشقیہ داستانوں پر مشتمل مثنویات کی ہے جن میں کوئی معروف و مشہور داستان محبت نظم کی گئی ہو۔ یہ اپنے رنگ و آہنگ میں غزل کے مزاج سے قریب ہو کر بھی منفرد رہتی ہے۔ عشقیہ مثنویوں میں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، وامق عذرا وغیرہ داستانیں اردو اور فارسی کے بہت سے شاعروں نے نظم کی ہیں۔ ان میں بعض غیر معمولی ادبی اہمیت کی حامل ہیں۔ مثنوی کی تیسری قسم وہ ہے جس میں اخلاقی حکایات، تصوف کے نظریات، صوفیہ کی تعلیمات، دینی قصے یا فقہی مسائل وغیرہ بیان ہوتے ہیں۔ اس شعبے

میں مولانا روم کی مثنوی اور مولانا عبد الرحمٰن جامی یا حکیم سنائی کی منظومات کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ مثنوی نگاری کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل آذربائیجان کے شہر گنجہ میں ۵۳۳ھ کو پیدا ہونے والے فارسی زبان کے مشہور شاعر نظامی گنجوی نے قائم کیا۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے پانچ مثنویاں لکھیں جو پنج گنج نظامی یا خمسہ نظامی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ادبی اور فنی کمالات کی وجہ سے ان مثنویوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خمسہ نظامی میں یہ پانچ مثنویاں ہیں:

مخزن الاسرار جو تقریباً ۵۶۰ھ میں لکھی گئی۔ اس میں بہرام شاہ اور دل آرام کی داستان محبت بے حد لطیف پیرائے میں بیان ہوئی ہے۔ دوسری مثنوی شیرین خسرو ہے جس میں شیریں و فرہاد کی مشہور داستان نظم کی ہے۔ خمسے کی تیسری مثنوی لیلیٰ مجنوں اور چوتھی ہفت پیکر ہے۔ پانچویں سکندر نامہ جس میں دارا و سکندر کا قصہ بیان ہوا ہے۔

خمسہ نظامی کی مقبولیت نے بعد کے زمانے میں دوسرے بہت سے شاعروں کو اس کا جواب لکھنے پر اکسایا مگر سب سے زیادہ کامیابی امیر خسرو کو نصیب ہوئی۔ اُنھوں نے نظامی گنجوی کی پانچوں مثنویوں کا جواب اُسی آن، بان اور ادبی حسن و لطافت کے ساتھ لکھا۔ یوں تو امیر خسرو کی کم و بیش ۱۵ مثنویاں ہمیں معلوم ہیں اور ان میں بعض تاریخی نوعیت کی ہیں، مگر یہاں ہم خمسہ نظامی کے جواب میں لکھی ہوئی مثنویات کا تذکرہ کریں گے۔ مخزن الاسرار نظامی کے جواب میں امیر خسرو نے ۶۹۸ھ میں مثنوی مطلع الانوار تصنیف کی جس میں تین ہزار تین سو دس اشعار ہیں۔ ان میں صوفیانہ نظریات اور عرفانی مباحث بیان ہوئے ہیں اور یہ مثنوی امیر خسرو نے صرف دو ہفتے میں لکھ ڈالی تھی۔ اسی سال ۶۹۸ھ میں اُنھوں نے خمسہ نظامی کی دوسری مثنوی کے جواب میں شیریں خسرو کا قصہ نظم کیا جس میں چار ہزار ایک سو چوبیس اشعار ہیں۔ اور ۶۹۸ھ ہی میں تیسری مثنوی دو ہزار چھ سو ساٹھ اشعار پر مشتمل لیلیٰ مجنوں بھی لکھ لی تھی اس طرح ایک ہی سال میں انھوں نے غزلیات و قصائد وغیرہ کے علاوہ یہ تین مثنویاں تصنیف کیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد دس ہزار سے زائد ہے۔

اگلے برس ۶۹۹ھ میں نظامی کے سکندر نامے کے جواب میں آئینِ سکندری لکھی گئی جو چار ہزار چار سو پچاس شعروں پر مشتمل ہے۔ نظامی کی پانچویں مثنوی ہفت پیکر کا جواب ہشت بہشت ہے اس میں وہی بہرام و دل آرام کا افسانہ محبت بیان ہوا ہے اور یہ ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی تھی۔ خمسۂ خسرو کے اشعار کی مجموعی تعداد سترہ ہزار نو سو چھبیس (۱۷۹۲۶) ہوتی ہے اور ان کا زمانہ تصنیف ۶۹۸ھ سے ۷۰۱ھ تک صرف تین سال کی مدت ہے، ظاہر ہے کہ اس عرصے میں ان کے دوسرے معمولات و مشاغل بھی رہے ہوں گے پھر بھی اتنے اشعار کہہ لینا ان کی زود گوئی اور قادر الکلامی پر گواہ ہے۔

امیر خسرو کی دوسری اہم مثنویوں میں قران السعدین ۶۸۸ھ میں تصنیف ہوئی جس میں سلطان معز

اور اک

الدین کیقباد (۱۲۸۷ء-۱۲۹۰ء) اور اس کے باغی بیٹے بغرا خان کے درمیان صلح، صفائی اور ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مفتاح الفتوح ۶۹۱ھ میں لکھی گئی اس میں عہد جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ء-۱۲۹۵ء) کے حالات منظوم ہوئے ہیں۔ علاء الدین خلجی سلطان دہلی (۱۲۹۵ء-۱۳۱۵ء) کے بیٹے خضر خان اور دیول رانی کی حیات معاشقہ ۷۱۵ھ میں مثنوی عشقیہ یا دیول رانی خضر خان کے نام سے قلمبند کی گئی تھی اس میں چار ہزار پانچ سو انیس (۴۵۱۹) اشعار ہیں، آخری تقریباً تین سو اشعار جن میں خضر خان کا مرثیہ ہے بعد میں لکھ کر اضافہ کیے گئے تھے۔ امیر خسرو کی مثنویوں میں نہ سپہر بہت اہم ہے۔ یہ ۷۱۸ھ میں لکھی گئی تھی اس میں پورا ایک سپہر (باب) ہندوستان کے بارے میں ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب، مذہب، ثقافت، رسوم و رواج، زبان، لباس، پھل، پھول، میلے ٹھیلے، ہر شے سے امیر خسرو کو کیسا جذباتی لگاؤ تھا، کیسی محبت اور عقیدت تھی۔ اس زمانے میں تو کیا بعد میں بھی کسی نے ہندوستان کی تعریف و توصیف کا ایسا شاندار اور پُر اثر نمونہ پیش نہیں کیا۔

ان کی آخری مثنوی تغلق نامہ ۷۲۴ھ میں سلطان غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء-۱۳۲۴ء) کی فرمائش سے لکھی گئی تھی۔ یہ مختصر مثنوی ہے اور تقریباً ناپید ہو چکی تھی۔ شہنشاہ نور الدین جہانگیر (۱۶۰۵ء-۱۶۲۸ء) کو اس کا ایک قلمی نسخہ ملا جو اول و آخر سے ناقص تھا۔ جہانگیر کی علم دوستی اور معارف پروری نے یہ گوارا نہ کیا کہ امیر خسرو کی یہ آخری تصنیف ناقص رہ جائے یا ناپید ہو جائے۔ اس نے اپنے درباری شاعر حیاتی گیلانی کو حکم دیا کہ وہ تغلق نامہ کے ضائع شدہ اشعار کو امیر خسرو ہی کے اُسلوب و انداز میں لکھ کر اس ناقص نسخے کو مکمل کرے۔ حیاتی نے نہایت مہارت کے ساتھ یہ رفوگری کا کام کیا اور تغلق نامہ کے ضائع شدہ اشعار کی جگہ نئے اشعار اس طرح اضافہ کر دیے کہ پیوند کاری کا پتا بھی نہیں چلتا۔ جہانگیر نے اس کا انعام یوں دیا کہ حیاتی کو سونے میں تلوایا اور اس کے ہم وزن سونا اُسے بخش دیا۔

امیر خسرو کی مثنوی نگاری کے سلسلے میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ابتدائی دور میں فارسی مثنویاں صرف تین بحروں میں لکھی جا رہی تھی، نظامی گنجوی نے ان میں دو اور بحروں کا اضافہ کیا اور مثنوی کی بحریں پانچ ہو گئیں۔ امیر خسرو نے ان پر چار مزید بحروں کا اضافہ کیا اور اب مثنوی کے اوزان نو ہو گئے۔ امیر خسرو کا اسلوب غزل کی طرح مثنویوں میں بھی واضح اور دلنشین ہے۔ وہ جزئیات کا بیان بھی حسن و لطافت کے ساتھ کرتے ہیں۔ صنائع لفظی اور بدائع معنوی کے برمحل استعمال کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انھیں کردار نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔ رزم کا نقشہ ہو یا بزم کا، وہ نکتہ آفرینی، لطافت اور نُدرتِ اظہار سے اُسے جاذب و دلکش بنا دیتے ہیں۔ فارسی زبان پر ان کی حاکمانہ قدرت تو بے نظیر ہے جس کا ثبوت رسائل اعجاز خسروی کے علاوہ ان مثنویوں سے بھی ملتا ہے۔

آج سے اسّی پچاسی سال قبل نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ کے پوتے اور اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ کے سکریٹری نواب محمد اسحٰق خان کی کوشش اور دوسرے حضرات کے تعاون سے نیز اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان آصف سابع

اوراک

قام دکن کی مالی اور سرپرستی کی بدولت امیر خسرو کی مثنویاں خصوصاً خمسہ نظامی کا جواب علی گڑھ سے کئی جلدوں میں شائع
ہو اتھا ان میں سے بعض کے ری پرنٹ بھی بعد میں تیار کیے گئے، لیکن آج بھی اس کی سخت ضرورت ہے کہ امیر خسرو
کی تمام تصانیف کے یونیفارم ایڈیشن پوری صحت اور اہتمام سے شائع کیے جائیں اس لیے کہ یہ ہماری ثقافت اور
ہندوستانی فارسی ادب کا نہایت گراں قدر سرمایہ ہیں۔

P.O. Box No.- 9723

New Delhi- 25

فارم نمبر ۴ - زیر دفعہ نمبر ۸

سہ ماہی ادراک گوپال پور

۱۔	مقام اشاعت	:	گوپال پور، باقر گنج، سیوان (بہار)
۲۔	وقفہ اشاعت	:	سہ ماہی
۳۔	پرنٹر کا نام	:	سید حسن عباس
۴۔	قومیت	:	ہندوستانی
۵۔	پتا	:	گوپال پور، باقر گنج، سیوان (بہار) ۸۴۱۲۸۶
۶۔	پبلیشر کا نام	:	سید حسن عباس
۷۔	ایڈیٹر کا نام	:	سید حسن عباس
۸۔	قومیت	:	ہندوستانی
۹۔	پتا	:	گوپال پور، باقر گنج، سیوان (بہار) ۸۴۱۲۸۶
۱۰۔	مالک کا نام	:	سید حسن عباس
۱۱۔	قومیت	:	ہندوستانی
۱۲۔	پتا	:	گوپال پور، باقر گنج، سیوان (بہار) ۸۴۱۲۸۶

میں پورے علم و یقین کے ساتھ تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجات بالا درست ہیں۔

سید حسن عباس

پروفیسر شریف حسین قاسمی

فوائد الفواد میں منقول

دو اشعار کے بارے میں ایک گزارش

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے ایک مجلس میں یہ دو بیت نقل فرمائے تھے۔

ہر کہ ما را یار نبود، ایزد او را یار باد	وانکہ ما را رنجہ دارد، راحتش بسیار باد
ہر کہ او خاری نہد در راہ ما از دشمنی	ہر گلی کز باغ عرش بشگفد بی خار باد

[جو ہمارا دوست نہیں، اللہ اس کا دوست رہے، جو ہمیں تکلیف پہنچائے، اسے خوب آسائش نصیب ہو۔
جو بھی دشمنی میں ہمارے راستے میں کانٹے بچھائے، اس کی زندگی کے باغ میں جو پھول بھی کھلے اس میں کانٹے نہ ہوں]۔

یہ دونوں شعر تصوف کی تعلیمات کے ایک ایسے پہلو کی ترجمانی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے تصوف اور صوفیا کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ یہ دوستی کرنے کا عام جذبہ اور نامساعد حالات میں صبر و تحمل ہی تھا جس نے دعوت و عزیمت سے وابستہ ہمارے بزرگوں کو کام کرنے، ترقی کرنے، اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے اور ایک بہتر اور مثبت سماج کی تشکیل میں وہ تمام امکانات فراہم کیے، جن کی انہیں ضرورت تھی۔

ان اشعار کی تشریح اور خود ان اشعار کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات فوائد الفواد کو خود تاریخ تصوف میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہ چشتی اور صوفیا کے دیگر مختلف سلسلوں کے بزرگوں کے اقوال، عقاید اور نظریات کا ایک سدابہار گلدستہ ہے۔ چشتی سلسلۂ تصوف میں اسے لایحۂ عمل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا فارسی متن ایک سے زیادہ مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے اردو تراجم بھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ محترم جناب خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے بھی اس کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کے باوجود فوائد الفواد کی حیثیت کے مطابق اس کا فارسی متن باقاعدہ علمی وفنی اعتبار سے مرتب ہو کر ابھی شائع ہونا باقی ہے۔ فوائد الفواد میں متعدد مقامات ایسے ہیں، جن پر مفصل تعلیقات لکھے جانے ضروری ہیں کہ اس طرح حضرت محبوب الٰہی کے وسعتِ مطالعہ اور دیگر صوفی سلسلوں کی تصنیفات و تعلیمات سے آپ کے اخذ و اقتباس، مختلف سلسلوں میں افکار و عقاید میں یگانگت اور آپسی راہ و رسم کا علم ہو گا۔

حضرت محبوب الٰہی نے اپنی مجالس میں بیسیوں قدیم عرفا کا ذکر کیا ہے۔ اس کے اقوال نقل کیے ہیں۔ ان کا

ماٴخذ تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ ایک صاحب ذوق شخصیت کے مالک تھے۔ سماع سے خاص دلچسپی رکھتے تھے اور خود آپ کے بقول رات کے آخری حصے میں، عالم غیب سے آپ پر شعر القا ہوتے تھے، جس پر آپ خوش ہوتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر اچھا شعر سنا جائے تو ہر لمحہ اس سے ذوق حاصل ہوتا ہے۔ جو چیز نثر میں کہی جائے اگر اسے نظم کے پیرائے میں ادا کیا جائے تو ذوق میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے شعر و شاعری سے آپ کو قدرتی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ آپ اپنی مجالس میں حسب حال اشعار نقل فرماتے تھے۔ ان اشعار کا استخراج کیا جانا چاہیے، یعنی پتا لگانا چاہیے کہ یہ اشعار کن شعرا کے ہیں۔

حضرت محبوب الٰہی نے بعض دیگر صاحب ذوق عرفا کے مانند کوئی دیوانِ شعر تو نہیں چھوڑا، لیکن یہ بہر حال مصدقہ امر ہے کہ آپ کو شعر کہنے پر قدرت حاصل تھی اور حضرت امیر خسرو کے بارے میں آپ کے یہ اشعار اس حقیقت کے ترجمان ہیں:

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست　　ملکیت ملک سخن آن خسرو راست

آن خسرو ماست، ناصر خسرو نیست　　زیرا کہ خدای ناصر خسرو ماست

امیر خسرو کے بارے میں محبوب الٰہی کے یہ اشعار خسرو سے آپ کے تعلق خاطر، خود خسرو کی زندگی اور شعر و شاعری میں ان کے مقام کے تعین کے لئے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت امیر خسرو کے اسلوب شاعری کو ایک خاص رنگ و آہنگ سے متعارف کرانے کے لیے حضرت محبوب الٰہی نے خسرو سے فرمایا تھا کہ وہ صفاہانی طرز پر شعر کہیں جو عشق انگیز بھی ہوں اور زلف و خال آمیز بھی۔ فارسی شعرا کے بعض تذکرہ نگاروں نے حضرت محبوب الٰہی کو اپنے اپنے تذکروں میں ایک شاعر کی حیثیت سے بھی متعارف کرایا ہے۔ لیکن جو متعدد اشعار آپ سے منسوب کیے ہیں، ان سب ابیات کا آپ سے انتساب تحقیق طلب مسئلہ ہے۔

بعض عرفا نے تصوف کو محبت کا دوسرا نام قرار دیا ہے۔ محبت خالق حقیقی سے، اس کے پیغمبر سے اور اس کی مخلوق سے۔ ایک صوفیِ حقیقی کا دل محبت سے کچھ اس طرح سرشار ہوتا ہے کہ اس میں کسی اور احساس کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ نفرت، دشمنی، مخالفت یہ محبت کے منافی الفاظ و احساسات ہیں۔ ایک صوفی عملاً ان احساسات سے بالکل واقف نہیں ہوتا۔ وہ اس سے بری ہوتا ہے جذبہ محبت، تحمل و بردباری سے پروان چڑھتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت محبوب الٰہی نے بارہا تحمل و بردباری پر بے پناہ زور دیا اور فرمایا:

ھر کہ جفا را تحمل کند بہتر، از ھر کہ ھست فرو باید خورد و در بند مکافات نباید بوُد۔

[یعنی جو بھی جفا کو برداشت کرے گا، بہتر ہے، جفا کسی کی طرف سے بھی ہو، اسے پی لینا چاہئے۔ بدلے کے چکر میں

نہیں پڑنا چاہیے]۔

حضرت محبوب الٰہی نے ایک دوسری مجلس میں بھی تحمل پر زور دیا اور دشمنی ومخاصمت سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ آپ نے اس ضمن میں ایک دلچسپ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ ایک نفس ہے اور ایک قلب۔ نفس، دشمنی، ہنگامے بازی اور فتنہ گری کی جگہ ہے اور قلب، سکون، رضا اور مہربانی کا سرچشمہ ہے۔ اگر کوئی نفس سے پیش آئے تو دوسرے کو قلب سے جواب دینا چاہیے، اس طرح نفس پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر نفس کا جواب نفس سے دیا جائے گا تو دشمنی اور فتنہ انگیزی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ اس تقریر کے بعد آپ نے تحمل وحلم کی فضیلت میں یہ شعر پڑھا :

زھر بادی چو کاھی گر بلرزی　　　اگر کوھی بہ کاھی ھم نیرزی

(یعنی اگر ہوا کے ہر جھونکے سے تنکے کے مانند لرزو گے تو پہاڑ جیسے ہونے کے باوجود، ایک تنکے سے زیادہ تمہاری وقعت نہیں ہوگی)۔

ایک دوسری مجلس میں بھی آپ نے اپنے اس نظریے کی مزید صراحت وتصدیق کے لیے یہ اشعار پڑھے:

ھر کہ مارا یار نبود، ایزد اورا یار باد　　　وانکہ مارا رنجہ دارد، راحتش بسیار باد

(جو ہمارا دوست نہیں، اللہ اس کا دوست رہے، جو ہمیں تکلیف پہنچائے اُسے خوب آسائش نصیب ہو)۔

ھر کہ او خاری نہد در راہ ما از دشمنی　　　ھر گلی کز باغ عمرش بشگفد بی خار باد

[جو بھی دشمنی میں ہمارے راستے میں کانٹے بچھائے، اس کی زندگی کے باغ میں جو پھول بھی کھلے اس میں کانٹے نہ ہوں]۔

آپ نے محبت کے اس بے لاگ احساس اور صادق جذبے کی جن کا اظہار ان اشعار میں ہوا ہے، اس طرح مزید وضاحت فرمائی کہ اگر کوئی کانٹے بچھائے اور تم بھی جوابا کانٹے بچھاؤ تو ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔ عام دستور یہی ہے کہ اچھوں کے ساتھ اچھائی اور بروں کے ساتھ برائی، لیکن درویشوں میں یہ معمول ہے کہ اچھوں کے ساتھ اچھے اور بروں کے ساتھ بھی اچھے۔

حضرت محبوب الٰہی نے اپنی اس گفتگو میں اسلام اور اس کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے تصوف کا ایک بنیادی اصول واضح فرمایا۔ یہ محض زبانی جمع خرچ نہیں تھا، حضرت محبوب الٰہی نے اسی اصول پر اپنی زندگی گزاری۔ آپ بارہا عداوت ومخاصمت کا نشانہ بنے۔ اس مخالفت اور مخاصمت کی کئی وجوہات تھیں جیسے سیاسی مصالح، طور طریق میں اختلاف اور حسد، لیکن آپ نے ہر قسم کی مخالفت کا تحمل وبردباری سے مقابلہ کیا۔

ایک بار آپ سے کچھ لوگوں نے آپ کے مخالفین کی شکایت کی۔ آپ نے اپنے ان متوسلین سے فرمایا: جو بھی کہتے ہیں مجھے برا کہتے ہیں، میں نے انہیں معاف کیا، تمہیں بھی ان کو معاف کر دینا چاہیے۔ ان سے دشمنی نہ رکھنا۔

خود حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے اپنے ایک مخالف اور اس کی مخالفت کا ذکر کیا۔ آپ نے بتایا کہ ایک شخص چھجو تھا۔ اندر پت میں رہتا تھا۔ مجھے ہمیشہ برا بھلا کہتا اور میرا برا چاہتا تھا۔ برا چاہنا، برا کہنے سے بدتر ہے۔ جب یہ شخص مر گیا تو تیسرے دن میں اس کی قبر پر گیا اور دعا مانگی کہ الہی اس نے جو کچھ بھی مجھے برا بھلا کہا اور میرا برا چاہا، میں نے اسے معاف کر دیا۔ میری وجہ سے اسے سزا نہ دیجو۔

حضرت محبوب الٰہی سے مخالفت اور ان سے مخاصمت کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک بار سلطان قطب الدین خلجی آپ کو ایذا پہنچانے کے درپے ہوا۔ اس نے اپنی تعمیر کردہ "جامع مسجد میری" میں تمام علماء و مشائخ کو نمازِ جمعہ ادا کرنے کی دعوت دی۔ محبوب الٰہی وہاں تشریف نہیں لے گئے اور فرمایا کہ ہمارے قریب جو مسجد ہے، اس کا حق ہم پر زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ حضرت محبوب الٰہی شاہی رسم کے مطابق چاند کی پہلی تاریخ کو دیگر مشائخ، صدور اور اکابرِ شاہی کی طرح تہنیت و مبارکباد پیش کرنے دربار شاہی نہیں گئے۔ معاندین نے سلطان قطب الدین کی توجہ ان دونوں واقعات کی طرف مبذول کرائی۔ حضرت محبوب الٰہی کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے۔ بادشاہ آپے سے باہر ہو گیا اور کہا اگر وہ چاند کی آئندہ پہلی تاریخ کو مبارکباد پیش کرنے نہیں آئے تو میں زبردستی انھیں بلواؤں گا۔ حضرت محبوب الٰہی کو اس کا علم ہو گیا۔ آپ خاموش رہے۔ کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ جیسے جیسے پہلی تاریخ قریب آتی جاتی وابستگان کی بے چینی اور اضطراب بڑھتا جاتا۔ وہ روحانی استمداد کے لئے دہلی میں مدفون اپنے سلسلے کے بزرگوں سے بھی رجوع کر سکتے تھے۔ یہاں ان کے پیر کے مرشد خواجہ قطب الدین بختیاری دفن ہیں لیکن وہ اپنی والدہ محترمہ کی قبر پر تشریف لے گئے اور وہاں عرض مدعا کیا۔ کسی دوسرے سے کوئی گفتگو نہیں کی۔ نہ بادشاہ کی زیادتی کا شکوہ اور نہ اپنے ذہنی و دلی کرب کا اظہار۔ دعوت و عزیمت سے وابستہ ہمارے بزرگوں کا یہی طریقہ کار رہا ہے۔

حضرت محبوب الٰہی کے صبر و تحمل نے یہ رنگ دکھایا کہ معینہ تاریخ آنے سے پہلے ہی قطب الدین کو خسرو خان نے قتل کر دیا۔ اس کے جسد کو محل کے اوپر سے نیچے پھینک دیا گیا اور اس کے سر کو نیزے پر چڑھا کر عوام میں اس کی بے آبروئی کی گئی۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ دو شعر جو اس مضمون کے شروع میں پیش کئے گئے ہیں، کس شاعر کے ہیں۔ کیا یہ شعر خود حضرت محبوب الٰہی نے کہے ہیں۔ غالباً ایسا نہیں ہے:

شیخ نجم الدین کبری اپنے دور کے معروف، با اثر اور بابرکت شیخ تھے۔ یہ کبروی سلسلے کے بانی بھی ہیں۔ خوارزم میں مقیم تھے۔ منگولوں نے انہیں ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں شہید کر دیا تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے اپنی مجالس میں ان کے حوالے سے بعض امور پر اظہار خیال کیا ہے۔ فارسی شعرا کے بعض تذکروں میں درج ذیل شعر ان سے منسوب کیا گیا ہے:

ھر کہ مارا یار شد، ایزد مر او را یار باد   وانکہ مارا خار دید، از عمر برخوردار باد

یہ شعر کچھ تبدیلی کے ساتھ، فواید الفواد میں منقول اس شعر ہی کی ایک قرأت ہے:

ھر کہ مارا یار نبود، ایزد او را یار باد   وانکہ مارا رنجہ دارد، راحتش بسیار باد

ممکن ہے کہ فوائد الفواد کا یہ دوسرا شعر بھی شیخ نجم الدین کبریٰ ہی کا ہو:

ھر کہ او خاری نہد در راہ ما از دشمنی   ھر گلی کز باغ عمرش بشگفد بی خار باد

ایک بزرگ گزرے ہیں، نجم الدین زرکوب۔ ان کی یہ غزل فارسی تذکروں میں نقل ہوئی ہے:

دشمن مارا سعادت یار باد   روز و شب با عز و نازش کار باد

ھر کہ خاری می نہد در راہِ ما   خار ما در راہ او گلزار باد

ھر کہ چاھی می کند در راہ ما   چاہ ما در راہ او ھموار باد

ھر کہ ملک و مال ما را دشمن است   ملک و مالش در جہان بسیار باد

ھر کہ کافر خواند ما را، گو بخوان   او میانِ مومنان دیندار باد

ھر کرا مستی ز زرکوب آرزوست   نجم خود مست است، او ھشیار باد

اس غزل میں بھی فوائد الفواد کے متذکرہ بالا اشعار کی گونج سنائی دیتی ہے۔

آخر میں عرض کرنا چاہوں گا کہ مشائخ کرام نے وہ کسی بھی خطے سے اور کسی بھی سلسلے سے وابستہ ہوں، بنی نوع انسان سے دوستی پر زور دیا ہے اور اس عقیدے پر پوری دیانت داری اور خلوص نیت سے عمل بھی کیا ہے کہ یہی روح تصوف ہے۔

Deptt. of Persian
Delhi University

○○○

ڈاکٹر رضوان اللہ آروی

فارسی شاعری

انقلاب اسلامی سے آج تک

عالمی ادب وشاعری کی طرح فارسی شعروادب میں بھی تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ موضوعات ومضامین کے اعتبار سے بھی اور زبان واسلوب کے لحاظ سے بھی۔ تاہم یہ تبدیلی گذشتہ صدیوں میں اس قدر سرعت بہ داماں نہیں تھی، جتنی کہ آج ہے۔ سامانی دور سے لے کر قاچاری دور تک دیکھئے تو بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے، موضوعات ومضامین میں تبدیلی تو آئی، اسلوب بھی کسی حد تک بدلتا رہا، لیکن بنیادی طور پر فکروفن کے اعتبار سے، ہر دور کی شاعری ایک دوسرے سے مربوط نظر آتی ہے بلکہ ہم کہیں کہ ربط کا یہ سلسلہ آج تک دراز ہے تو غلط نہ ہوگا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ چند لسانی تبدیلیوں کو نظر انداز کردیا جائے تو کسی بھی دور کی شاعری آج بھی اجنبی محسوس ہوگی۔ فارسی شاعری کی اس تاریخ میں حافظؔ وسعدیؔ جیسے شعرا بھی پیدا ہوئے کہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ آج تک فارسی شعر، ان کے اثر سے کلیۃً باہر نہیں آسکا ہے۔

فارسی شاعری میں تبدیلی کا نسبتاً یہ سُست عمل برسوں بلکہ صدیوں جاری رہا لیکن انیسویں صدی کے وسط میں، جب ایران میں ناصر الدین شاہ قاچار کا ابتدائی زمانہ تھا، تبدیلی کا یہ عمل اچانک تیز ہوگیا کہ، اب ایران پر بیرونی افکار وخیالات کے دروازے کھلنے لگے تھے۔ ان افکار ونظریات کو ایران میں عام کرنے میں مرزا تقی امیر کبیر کے دار الفنون نے اہم کردار ادا کیا ہے، جس کے زیر اہتمام مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اس کے علاوہ اخبارات کے اجرا نے بھی اس زمانے میں لوگوں کے ذہنوں میں نہ صرف وسعت پیدا کی بلکہ ادبا وشعرا کو عوام سے قریب کرنے کا موقع بھی فراہم کیا۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں عشق وعاشقی اور روایتی گل وبلبل کی شاعری سے بیزاری بڑھنے لگی اور نیا ذہن یہ محسوس کرنے لگا کہ اب وقت آگیا ہے کہ شاعری میں عوامی جذبات اور ان کے مسائل کی ترجمانی کی جائے۔ فن میں مقصدیت کا یہ احساس جیسے جیسے بڑھتا گیا، وقت کے دانشور اور ناقدین روایتی شاعری، خاص طور پر درباری شاعری پر کھل کر تنقید کرنے لگے۔ فارسی شاعری کی تاریخ میں یہ ایک اہم ترین جست تھی جو ذہن وقلب سے گذر کر بالآخر کاغذ کے صفحات پر نمودار ہوئی۔ ملک الشعرا بہار، عارف قزوینیؔ اور ابوالقاسم لاہوتی وغیرہ اسی پس منظر کی پیداوار ہیں۔ ان کی شاعری میں وطن دوستی اور میہن پرستی کا جو پُر جوش جذبہ ملتا ہے تو اس جذبے

کی تحریک، در اصل وہ عوامی تحریک تھی، جسے ایران کی سیاسی تاریخ میں نہضت مشروطہ کا نام دیا گیا ہے۔ ایران میں یہ ملک گیر تحریک شروع نہیں ہوتی تو ایرانی ادیبوں اور شاعروں کا جذبہ میہن پرستی شاید اتنی شدت اختیار نہ کرتا۔ ایران کے ساتھ یہ عجیب و غریب بات رہی ہے کہ یہاں جب بھی انقلاب آیا ہے تو وہ صرف سیاسی حد تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ لوگوں کے ذہن و قلب بھی بدل گئے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کل تک جو شعرا درباری قصیدہ گوئی اور مداحی کے عادی تھے، اب اس لبادے کو پھینک کر یوں شعر کہہ رہے تھے۔

گر ہوای سخن بود بہ سرت

از وطن بعد ازین سخن گو باز

یہ مرزا محمد صادق امیری، ادیب الممالک فراہانی تھے جن کی اس اپیل پر وطن دوست شعرا نے لبیک کہا اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر ایسے شاہکار پیش کیے کہ ان کا صرف نمونہ پیش کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ بہر حال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری کا پورا سرمایہ بدل گیا اور اب اس میں سطحی اور عامیانہ جذبات کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ عوامی مسائل کی ترجمان یہ شاعری، اب لوگوں کو ایک پاکیزہ اور طاقتور پیغام دے رہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کی شاعری میں نیشنلزم، سیکولرزم، اشتراکیت کی جھلکیاں بھی نظر آ رہی تھیں کہ اب تک ایران کے افق پر انقلاب اسلامی کا آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا۔ لیکن.......... جب ایران میں حضرت امام خمینیؒ کے ہاتھوں اسلام کا پرچم بلند ہوا تو نیشنلزم کو اسلام کا مخالف قرار دیا گیا اور تب، فارسی شاعری کا رُخ، نام نہاد سیکولرزم 'لادینیت اور اشتراکیت سے مڑ کر' ان اسلامی عقائد کی طرف ہو گیا جن کی بنیاد قرآن و حدیث اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی نگارشات پر رکھی گئی تھی، اگرچہ تب بھی غالب جذبہ وطن دوستی ہی رہا۔ انقلاب اسلامی کی شاعرہ۔ سپیدہ کاشانی کہتی ہیں ۔

تنم گر بسوزی بہ تیرم بدوزی — جدا سازی ای خصم سر از تنِ من

کجا میتوانی ز قلبم ربائی — تو عشقِ میانِ من و میہنِ من

حالانکہ انقلاب سے قبل ہی میہن پرستی کا یہ جذبہ پروان چڑھتا رہا تھا، لیکن شاہ کی حکمرانی کے زیر اثر، خالص قومیت کی یہ شاعری اسلامی امتیازات سے محروم تھی۔ بہر حال یہ دور بہت زیادہ طویل نہیں رہا اور ایسے شعرا عوام کے درمیان مقبولیت بھی حاصل نہ کر سکے کہ ان کی شاعری ایک فیشن زدہ وطنیت کی ترجمان بن کر رہ گئی تھی۔ فارسی شاعری کو انقلاب اسلامی کی یہ بہت بڑی دین ہے کہ اس نے شاعری سے اس فیشن زدگی کا خاتمہ کیا اور اس طرح حب الوطنی کے جذبات کو طہارت اور پاکیزگی نصیب ہوئی۔ انقلاب اسلامی کے ابتدائی دور میں ایران کے عوام جو بے ساختہ نعرے لگا رہے تھے تو اس کے ساتھ وہ لاشعوری طور پر ایک پاکیزہ وطنی شاعری کی بنیاد بھی رکھ رہے تھے۔

از جان خود گذشتیم۔ با خون خود نوشتیم۔ یا مرگ یا خمینی۔

یہ محض نعرہ نہیں تھا بلکہ جذبات کا وہ وفور تھا جو آگے چل کر ایک منظم اسلامی تہذیب کے سانچے میں ڈھلتا چلا گیا۔

ایران میں انقلاب اسلامی کے ظہور کے بعد سب سے پہلے خود حضرت امام خمینیؒ شعرا کی توجہ کا مرکز بنے۔ تاہم ان کی ذات گرامی قرآن و اسلام کا حوالہ بن کر سامنے آئی۔ قرآن اور اسلام ایرانی شعرا کو عزیز تر تھا اور اس لیے حضرت امامؒ انہیں عزیز تھے کہ وہ حق و صداقت کا پیغام لے کر آئے تھے۔ موسیٰ گرمارودی کہتا ہے:

می ستایم می ستایم با تو دین خویش را تا بدان یابم بروز حشر از آتش مفر
در تو من قرآن و حق را می ستایم نی تو را و اندران از حد قرآنی نرفتم را ستر

حضرت امامؒ کی ذات گرامی مایوسیوں کی تاریکی میں امید کی ایک کرن بن کر آئی تھی، لہٰذا ایرانی خوش تھے اور جذبہ اسلامی سے سرشار ہو کر نغمہ سرا تھے۔ لیکن سرشاری کی اس کیفیت میں بھی وہ شاہ کے تاریک دور کو نہیں بھولے تھے۔ اور جب وہ اس تاریکی کے ساتھ اس روشنی کا ذکر کرتے تھے تو انقلاب اسلامی کی معنویت مزید نمایاں ہو کر سامنے آتی تھی۔ علی معلم کی ایک طویل نظم ہے۔

" این فصل را با من خوان"۔ اس نظم کو انقلاب اسلامی کی مختصر تاریخ بھی کہا گیا ہے۔ اس میں شاعر انقلاب اسلامی کے ذکر سے قبل، شاہ کے استبدادی نظام کا ذکر کرتا ہے جب ایران میں، عرفان و نورانیت ختم ہو چکی تھی۔ وہ کہتا ہے:

خاموش شد عرفان و نورانیت ما فراموش شد ایمان و روحانیت ما
جز سایہ ای زان ملت دانا نبودیم بودیم ما در خانۂ اسما نبودیم

ایک طرف یہ مایوس کن تصویر ہے لیکن دوسری طرف جب انقلاب اسلامی کا ظہور ہوا تو حیرت انگیز طور پر یاس بھرا لب و لہجہ یک لخت غائب ہو گیا اور مسرت و سُرور میں ڈوبی ہوئی یہ آواز اُبھر کر سامنے آئی:

سپہر بستہ بہ تن دانہ ھای نور امشب ز آسمان ولایت شگفتہ حور امشب
زبانگ روشن تکبیر ای مؤذن صبح بزن بہ وادیٔ غم پرچم سُرور امشب
سلاح کاری ایمان و رمز نام حسین کشید لشکر دشمن بہ کام گور امشب
بیا بہ محفل گل گون عاشقان سیمین ببین تو جاذبۂ دولت حضور امشب

یہ سیمین وخت وحیدی ہیں۔ نظم ہے: "بہ سوی قدس"۔

اس میں شک نہیں کہ انقلاب نے فارسی شاعری کو اعتماد بخشا، جذبے کی صداقت عطا کی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے شاعری کو ہر آلودگی سے پاک کر کے اس تقدیس سے نوازا جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ آپ، انقلاب کی ابتدا سے لے کر عراق کے ساتھ جنگ تک بلکہ اس کے بعد تک کی شاعری کو پڑھ جائیے، ہر طرف اسلام

اور قرآن وحدیث کی بہار نظر آئے گی، تلمیحات میں اسلامی تاریخ کے حوالے نظر آئیں گے اور ترکیبات میں اسلامی لفظیات مصطلحات کی جھلک نمایاں دکھائی دے گی۔ اور یہ تمام چیزیں انقلاب اسلامی کی فارسی شاعری کی ادبیات ہیں۔ فارسی شعر وادب کی تاریخ میں شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ شعرا اپنے پیش روؤں کے اثر سے بالکل آزاد ہو کر شعر کہہ رہے تھے۔ اب انکی فکر بھی اپنی تھی اور ان کا فن بھی اپنا۔ مثال کے طور پر اشعار انقلاب کی یہ چند تراکیب دیکھئے جن کی مثال فارسی کی پوری شعری روایت میں ناپید ہے۔ "ردای امامت"، "جام اکملت لکم"، "سجادۂ گلبرگ"، "صحیفۂ نور" وغیرہ۔

انقلاب اسلامی کے اشعار میں یہ فارسی روح جاری ہی تھی کہ عراق کے ساتھ جنگ کا افسوسناک واقعہ پیش آگیا۔ اس واقعہ کا ظہور پذیر ہونا تھا کہ ایسا محسوس ہوا جیسے، فارسی شاعری میں شاہنامہ کی حماسی روح بیدار ہو گئی ہو۔ فرق یہ تھا کہ وہاں صرف تخیل ہی تخیل تھا جب کہ یہاں حقیقت کی انتہا یہ تھی کہ جو لوگ دن کی روشنی میں میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے تھے، وہی لوگ راتوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ پرویز بیگی حبیب آبادی ایک ایسا ہی مجاہد شاعر ہے جس نے جنگ میں اپنے عزیز کو کھو دیا ہے اور حسرت بھرے لہجہ میں کہتا ہے:-

و من ماندم و در قفا مانده داغِ عزیزاں   و من ماندم و پیش رویم تب بر گریزاں

و من ماندم و لالہ ہا فرش تابی کرانہ   و من ماندم و خون و خاکستر آشیانہ

تاہم یہ انفرادی حسرت بھرا لہجہ ہے مجموعی طور پر اس دور کی شاعری کو دیکھیں تو پوری شاعری خود حضرتِ امام خمینیؒ کے ان اقوال کی متحرک تصویر نظر آتی ہے:

"امروز خمینی آغوش و سینہ فرش را برای تیر ھای بلا و حوادثِ سخت در برابر توپھا و موشکھای و من باز کردہ است و ہمچوں ہمۂ عاشقانِ شہادت، برای درکِ شہادت روز شماری می کند"۔

غور سے دیکھئے تو یہ نثر میں رزمیہ ہے۔ لہذا اس دور کے شعرا نے بھی فارسی کی رزمیہ روایت سے خوب فائدہ اٹھایا اور چونکہ وہ ان کا اپنا مشاہدہ تھا اور ان کے جذبات بھی سادق تھے، لہذا اُن کی شاعری شدت تاثر سے بھرپور نظر آتی ہے۔ نصر اللہ مردانی کہتا ہے:-

شدہ تمام وطن کربلا بہ پا خیزید   دلاوران ستم آشنا بہ پا خیزید

یہ کربلا کا عجیب و غریب استعارہ ہے جو افسردہ جذبات کو حوصلہ بھی بخشتا ہے اور مظلوم و محروم انسانیت کو تسکین کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ فارسی کے اثر سے اردو شاعری میں بھی کربلا اور اس کے تلازمات کا خاصا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ اردو میں کربلائی شاعری کے موضوع پر گوپی چند نارنگ نے خاصا کام کیا ہے، اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ فی الحال محمد رضا سرانی کے یہ اشعار دیکھئے جس میں ایران، عراق جنگ کے لیے کربلا ہی کو بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

پیکار علیہ ظالمان پیشہ ماست   اندر رہِ دوست مُردن اندیشۂ ماست

هر گز نه حیم تن به ذلت هر گز
در خون زلال کربلا، ریشهٔ ماست

یہاں تک کہ اس جنگ میں مرنے والوں کا جب ماتم بھی کیا گیا تو اس میں بھی "دامنِ زہرا" کے نیم کربلائی استعارے ہی کو بروئے کار لایا گیا۔ ماں سے مخاطب ہو کر ایک مجاہد اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہتا ہے :۔

طنین نعره ام برپاست مادر — تفنگم بر زمین تنها است مادر
غریبانه نمردم در بیابان — سرم بر دامنِ زهرا است مادر

لیکن ایران، عراق جنگ کے تناظر میں دیکھیے تو ایسے ماتمی اشعار کم نظر آئیں گے۔ بیشتر شعرا نے اس جنگ کے حوالے سے پُر جوش رزمیہ شاعری کی ہے۔ مثلاً قیصر امین پور کہتا ہے ۔

کس رازِ حیات او نداند گفتن — باید کہ زبان به کام خود نهفتن
هر چند میان خون خود خفت ولی — سوگند که خون او نخواهد خفتن

یا پھر فرید اصفہانی کے یہ اشعار دیکھیے :۔

بیار مرکب ما زین و جوشن ما پشت — که مرد نیست که از کارزار بر گردد
ازین مدافعهٔ ما فتح بر نمی گردیم — اگر چه مرکب ما بی سوار بر گردد

یہ جنگ دراصل مسلط شدہ تھی اور جس نے مسلط کی تھی، اسے ہم سب جانتے ہیں۔ لہٰذا ایرانی قوم میں اس کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہونا فطری تھا۔ انھوں نے جنگ مسلط کرنے والے کی نہ صرف مذمت کی بلکہ اس کے خلاف نفرت آمیز نظمیں تخلیق کیں۔ غور سے دیکھیے تو یہ بھی دراصل حماسی شاعری ہی کا ایک Part نظر آتا ہے۔
جعفر حمیدی کی ایک نظم ہے..... صدام صدام..... وہ کہتا ہے :

صدام صدام / خون آشام / ای وارث قبایل بد نام / در سرزمین شیر دلان می تازی : / این بیشهٔ خوابگاه شغالان نیست / ما / خواب ناز شیطانهارا / دیری است، در سراسر گیتی آشفته ایم۔

یہ نثر کے چند ٹکڑے ہیں جنھیں میں نے نظم کا نام اس لیے دیا ہے کہ اس صنف شاعری کو "نثری نظم" کہا جا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پاکستان کے ادبی حلقوں میں ابھی یہ نام پوری طرح Adopt نہیں کیا گیا ہے اور وہاں اسے "نثر لطیف" کہا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر وزیر آغا کا رسالہ "اوراق" دیکھا جا سکتا ہے۔ خود ایرانی حوالے بھی اس صنف یا قالب کو

" شعر منثور" کہتے ہیں جو دراصل شعر سپید ہی کی ایک صورت ہے۔
اسلوب شعر کی بات چل نکلی ہے تو اس کا بھی جائزہ لیتے چلیں کہ انقلاب اسلامی کی شاعری کسی ایک سبک کے ساتھ مخصوص کبھی نہیں رہی۔ سبک خراسانی سے لے کر وہ تمام اسالیب انقلاب اسلامی کی شاعری کا حصہ بنتے رہے ہیں جو نام کی تبدیلی کے ساتھ مختلف ادوار میں رائج رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشعار انقلاب کے اسلوب کو

"سبک در سبک" یا "سبک مزاج" بھی کہا گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس، عالمی ادبیات میں جدیدیت کا جو رجحان ابھر کر سامنے آیا تھا، فارسی شاعری بھی اس سے متاثر ہوگئی تھی اور اس کے زیر اثر ایسی معمائی تخلیقات پیش کی گئیں جیسے، مثال کے طور پر اردو میں رسالہ "شب خون" پیش کیا کرتا تھا۔ مثلاً ایک مہمل نظم کی چار لائنیں دیکھیے:

حیا حورالی

گیلی دیگولی

نیمون غیون

غار، کبورو میدار

انقلاب اسلامی کے ادب نے اس ابہام و اہمال کو دور کیا اور ایسی واضح شاعری وجود میں آئی کہ قاری تک جس کی ترسیل میں کبھی ناکامی کا مسئلہ سامنے نہیں آیا۔ یہ اور بات ہے کہ ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ تاہم آزاد اور نثری نظموں کے ساتھ، پابند شاعری کے نمونے بھی سامنے آتے رہے۔ قافیہ کی پابندی یا مساوی مصرعوں کی پابندی ہو نہ ہو، لیکن اوزان کی پابندی ضرور ہوتی رہی۔ جس کی وجہ سے موزونیت میں فرق نہیں آیا۔ فریدون مشیری نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس ایک نظم لکھی تھی "کوچہ"۔ والہانہ جذبۂ عشق سے بھرپور اس نظم کا انداز دیکھیے:

بی تو مہتاب شبی، باز از آن کوچہ گذشتم

ھمہ تن چشمہ شدم، خیرہ بدنبال تو گشتم

شوق دیدار تو لبریز شد از جام وجودم

شدم آن عاشق دیوانہ کہ بودم

در نہانخانۂ جانم، گل یاد تو درخشید

باغ صد خاطرہ خندید

عطر صد خاطرہ پیچید

یادم آمد کہ شبی باہم از آن کوچہ گذشتیم

پر گشودیم و در آن خلوت دلخواستہ گشتیم

ساعتی بر لب آن جوی نشستیم

تو ہمہ راز جہان ریختہ در چشم سیاہت

من ھمہ محو تماشائی نگاہت

عام طور پر ہم اس قسم کے اسلوب شعر کو نیما سے منسوب کرتے ہیں۔ جب ۱۹۲۳ء کے آس پاس اس کی نظم "افسانہ" شائع ہوئی تو لوگوں نے اسے "شعر نو" قرار دیا اور اسی لیے نیما کو "شعر نو" کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیما سے قبل فارسی شاعری میں اس قسم کے نمونے پیش کیے جا چکے تھے۔ اگر یہ یورپ کی تقلید میں کیے گئے تھے تو بھی ہم اسے کلیۃً رد نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر خانم شمس کسمائی کی بغیر وزن و قافیہ کی ایک نظم دیکھیے جو نیما سے برسوں قبل کہی گئی تھی:

ز بسیاری آتش مہر و نازو نوازش

ازین شدت گرمی و روشنائی و تابش

گلستان فکرم

خراب و پریشان شد افسوس

چو گلہائی افسردہ افکار بکرم

صفا و طراوت ز کف دادہ گشتند مایوس

تاریخ نیما کی ایک خصوصیت یہ ضرور ہے کہ اس نے پہلی بار "شعر نو" کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا اور اس کو لازمی قرار دیا۔ البتہ اتنی رعایت ضرور کی کہ قدیم اسلوب کو قربان بھی کیا جا سکتا ہے اگر مقصد اور پیغام کی ترسیل پیش نظر ہے۔ جس طرح قدیم فارسی شاعری میں حافظؔ و سعدیؔ سے استفادہ کی حدیں نہایت وسیع ہیں، اسی طرح عصر حاضر میں نیما کی پیروی اور اس سے استفادہ کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ انقلاب اسلامی کے شعرا نے بھی بہت حد تک اس کے اسلوب شعر کو اپنایا ہے۔ تاہم نیما کے جو فوری مقلد اور پیروکار تھے، وہ بہت پختہ کار تھے۔ مثلاً مہدی اخوان ثالث، احمد شاملو، منوچہر آتشی اور فروغ فرخزاد وغیرہ۔ اس کے برعکس انقلاب اسلامی کے شعرا میں اتنی پختگی نہیں تھی اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب نوجوان تھے۔ وفور جذبات سے مغلوب تھے اور علم و اسلوب شعر سے انھیں اتنی مناسبت بھی نہیں تھی۔ لہٰذا وہ فن کی اس بلندی کو تو نہ پہنچ سکے، جو ان کے پیش رووں کا طرۂ امتیاز تھی، تاہم فکری نہج پر وہ ان سے نبرد آزما ضرور رہے۔ انقلاب اسلامی کے قبل کے شعرا نے اگر عوام دشمنی یا مردم بیزاری کا مظاہرہ کیا تو انھوں نے فوراً انھیں خبردار کیا اور اگر انھوں نے مذہب بیزاری کی بات کی تو انقلاب اسلامی کے شعرا نے اس پر بھی ان کی گرفت کی۔ احمد شاملو نے، اپنی ایک نظم میں اس قسم کی باتیں کی تھیں تو نعمت مرزازادہ نے اسے محتاط انداز میں یوں جواب دیا تھا:

"ھرگز مباد نفرت ازین مردم / این مردمی کی دوستتان داری / این مردمی کہ دوست تو
را دارند"۔

غالباً اسی لیے انقلاب اسلامی کے ادب کو "انسان نواز" کہا گیا ہے، "انسان مدار" نہیں۔ اور انسان نوازی کے جذبہ کو تحریک دینے والی سب سے بڑی چیز 'مذہب' ہے جو انقلاب اسلامی کی شاعری کی بنیادی صفت ہے۔ خواہ وہ ظاہر

صفارزادہ ہوں، حسن حسینی ہوں یا پھر عبدالملکیان۔ یہ سب کے سب 'مذہبیات اور اسلامی تاریخ' کے حوالے سے ہی شاعری کرتے ہیں۔ مثلاً :-

در حضور رمضان / روزہ را دریافتم / واگر غم نخوریم / صبحدم در سحری / و شفق را افطار۔

یہ حسن حسینی ہیں۔ نظم ہے "با حلق اسماعیل"...... غرض کہ انقلاب اسلامی کے بعد فارسی کا شعری رجحان یکسر بدل گیا اور اس رجحان پر مذہب کا رنگ اس قدر غالب تھا کہ قاری کو یک رنگی کا احساس ہونے لگا، یہ اور بات ہے کہ عزم و ہمت کو جلا بھی ملی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آج، جب انقلاب اسلامی کو کئی دہائیاں گذر چکی ہیں اور ایران - عراق جنگ کے شعلے بھی سرد پڑ چکے ہیں تو آج کے شعری افق پر مذہب کا رنگ کچھ ہلکا ہونے لگا ہے اور شعرا ایک بار پھر شعر میں "احساس لطیف" کو اولین ترجیح دیتے نظر آ رہے ہیں۔

ایران کی موجودہ شاعری، انقلاب اسلامی کے برعکس ہفت رنگ شاعری ہے۔ اور یہ اس لیے کہ Past- Modernism کے رجحان کو وہاں شعوری یا لاشعوری طور پر Adopt کر لیا گیا ہے۔ اردو میں اسے مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا ہے۔ ایران والے اسے "پس جدید" کہتے ہیں۔ اس رجحان کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی ازم کی ترجمانی نہیں کرتے اور نہ کسی کے ساتھ ہم پابند عہد یا Committed ہیں، خواہ وہ اسلام ہی کیوں نہ ہو۔ آج کی شاعری اسی کی ترجمانی ہے۔ کاروس حسن لی، موجودہ فارسی شاعری کا ایک اہم نام ہے وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو نہایت خوبصورت اور مؤثر طریقہ سے مختصر نظموں کا جامہ پہناتے ہیں اور قاری کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مثلاً جب بیٹی جوان ہوتی ہے تو ماں اس اندیشہ میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ کہیں یہ بے راہ نہ ہو جائے اور یہ اندیشہ اس وقت دوچند ہو جاتا ہے جب وہ جوان بیٹی آئینہ میں مختلف زاویوں سے اپنی دلکشی کو نہارتی ہے۔ اس تاثر سے بھرپور حسن لی کی ایک نظم دیکھیے جس کا عنوان ہے :

"آئینہ آہ" ــ

پشت دریچہ

دختر

در آئینہ تبختر

بلوغ خود را بہ تماشا نشستہ است

در گوشۂ اتاق

مادر بزرگ

زیر چشمی

در آئینہ یادو آہ

موہائی جوانی اش راشانہ می کند

یہ صرف ایک منظر ہے اور ایک تاثر۔ اس کو دیکھئے اور انقلاب اسلامی کی شاعری کو دیکھئے تو آسمان زمین کا فرق نظر آئے گا۔ پس جدید یا مابعد جدید شاعری کا دراصل یہی نشان امتیاز ہے کہ کمٹ منٹ سے بے نیاز ہو کر پوری صداقت کے ساتھ اپنے مشاہداتی تاثرات کو پیش کر دیا جائے۔ اردو والوں نے اسے "خود انکاریت" کا نام دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایران والوں نے اسے کوئی نام دیا ہے یا نہیں، لیکن عصر حاضر کی فارسی شاعری در حقیقت اس خود انکاریت کا دوسرا نام ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی طرح انقلاب اسلامی کی شاعری بھی ایک ہیجانی اور ہنگامی شاعری تھی جس کی شدت، وقت گذر جانے کے ساتھ کم ہوتی گئی۔ آج کے شعرا کی فکر اور ان کے طریقہ اظہار کو دیکھئے تو ان کا رشتہ قبل از انقلاب کے جدیدیت شعرا سے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔ وہی منظر کشی، وہی عبارت آرائی اور وہی اسلوب و انداز۔ آج کی فارسی شاعری خاص طور پر نیما اور مہدی اخوان کی نسل سے زیادہ متاثر نظر آتی ہے۔ تاہم ایسا بھی نہیں کہ دور حاضر کے شعرا صرف جدت پسند ہیں۔ انہوں نے حافظ و سعدی جیسے کلاسیکی شعرا سے بھی استفادہ کیا ہے اور فارسی کی روایتی شاعری یا شعر سنتی کا بھی یکساں احترام کیا ہے۔ چنانچہ وہی حسن لی، جن کی نثری نظم اوپر پیش کی گئی۔ حافظ کو انہیں کے غزلیہ انداز میں یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

زان معجزہ ای کہ از تو سر خاست	افلاک ھنوز در تماشاست
در ھر سخنت ھزار گوہر	در ھر غزلت ھزار دریاست
تو جام جہان نمای عشقی	عکس رُخ یار در تو پیداست
ہر کس بہ طریقتی تو را گفت	ہر کس بہ شریعتی تو را خاست
اما چو حقیقت شب قدر	کز گم شدگان مین شب حاست

مارا بسرای سفینۂ شوق

جائیکہ طلوع شعر از آنجاست

موضوعات و مضامین کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دور حاضر کی فارسی شاعری میں وہی احساس جاری و ساری ہے جو اردو اور انگریزی شاعری میں رواں دواں ہے۔ یعنی احساس تنہائی اور خلوص و محبت کا فقدان۔ مثلاً:

سلام صمیمانہ آیا کجاست ؟	سر آغاز الفت خدایا کجاست ؟
خدایا سرای محبت کجاست ؟	من آوارہ ام شہر الفت کجاست ؟

آج کا شاعر قدیم محبت کو پانے کا بے حد آرزومند ہے۔ جواب کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی:

عشق لب خند مردم زندہ است　　زندگی ہا با تبسم زندہ است

کاشکی می شد صمیمی تر شویم　　در محبت ہا قدیمی تر شویم

اور حیرت تو تب ہوتی ہے جب آج کا فارسی شاعر Nostelgic بھی دکھائی دیتا ہے۔ گانو کو ویران کر کے، شہروں کو آباد کرنے کا رجحان شاید گلوبل فینومینا بن گیا ہے۔ ہجرت کا یہ کرب، اب عالمی مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ اردو شعرا کے درمیان یہ کرب عام ہے کہ وہ ہجرت در ہجرت کی اذیت برداشت کر رہے ہیں۔ افتخار عارف کا معروف شعر ہے:

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا　　کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

اور بشیر بدر کہتے ہیں:-

دالانوں کی دھوپ، چھتوں کی شام کہاں　　گھر سے باہر گھر جیسا آرام کہاں

ناسٹلجیا کا یہی احساس دور حاضر کے فارسی شاعر کے یہاں دیکھئے...... حسن لی کہتے ہیں:-

روزھائی روستایادش بخیر　　خندہ ہائی سبز و آبادش بخیر

کاش می شد باز گرایم آہ　　عشق را با خود نیاوردیم' آہ

اب چونکہ جدیدیت کا طلسم ٹوٹ چکا ہے، لہذا آج کی شاعری بھی فکری سطح پر پراگندگی سے اور اسلوبیاتی سطح پر ایہام و اہمال سے اپنا دامن چھڑا چکی ہے۔ فارسی شاعری میں نثری نظم کا تجربہ کامیاب ضرور رہا، لیکن اسے وہ اعتبار حاصل نہ ہو سکا، جیسی امیدیں کی گئی تھیں۔ تاہم اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ غیر موزوں طبع شعرا رفتہ رفتہ شاعری ترک کرنے لگے اور ان کی جگہ کو نئی نسل کے جن شعرا نے پُر کیا، وہ نہایت موزوں طبع تھے۔ اور اپنے فکر و خیال کے شاعرانہ اظہار پر قدرت رکھتے تھے۔ اب تک نئی فارسی شاعری کے جو نمونے سامنے آئے ہیں، ان میں یہ خصوصیت قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً عبدالجبار کاکائی، محمود اکرامی، حسین اسرافیلی، عباس مہدی آتیہ، عزیز اللہ زیادی، حسین لاہوتی صفا، مہدی رستگار اور ایرج قنبری وغیرہ۔ اردو میں جس طرح فیض کا احساس جمال ان کی ہر قسم کی شاعری پر ہمیشہ غالب رہا، اسی طرح آج کی ایرانی شاعری کا غالب رجحان بھی جمالیات ہی ہے۔ مثلاً:-

طلوع کردی و باد دیدنت زبان گم شد　　دلم شگفتہ ترین زخم ناگہان گم شد

ہزار مرتبہ روئید بر لبت خورشید　　ہزار مرتبہ در چشمت آسمان گم شد

آج کی فارسی شاعری اب وطن یا مسائل کی شاعری نہیں رہی ہے۔ اگر جنگ کی بات ہوتی بھی ہے تو اس کا مقصد جنگ سے اظہار نفرت ہے جو ایران- عراق طویل جنگ کو دیکھتے ہوئے فطری محسوس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مہدی رستگار کی نظمیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ کہتے ہوئے عجیب لگتا ہے کہ موجودہ فارسی شاعری ایک بار پھر شعر سنتی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

موضوعات و مضامین کے اعتبار سے بھی اور مزاج و منہاج کے لحاظ سے بھی۔ جذبۂ عشق کا احیا ہو رہا ہے اور وہ نفاست و لطافت ایک بار پھر فارسی شاعری کا حصہ بننے لگی ہے جو انقلاب کی سرگرمیوں میں اور پھر جنگ کے شعلوں میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ موجودہ فارسی شاعری میں بہترین منظر نگاری کا جو عمومی رجحان ابھر کر سامنے آیا ہے وہ اسی نفیس و لطیف رویہ کا غماز ہے۔ البتہ اسلوب یکسر بدل گیا ہے۔ تخلیقی فنکار اب مختصر ترین ہیئت میں اپنی بات کہنے کے قائل نظر آتے ہیں۔ مثلاً :-

سرودم ترا با تمام وجودم	ترا با تمام وجودم سرودم
تو آئینہ بودی برای دلِ من	برای دلِ تو من آئینہ بودم

(غلام حسین عمرانی)

اس سلسلے میں پُر سوز جذبۂ عشق سے بھرپور ایرج قنبری کی وہ نظم بھی دیکھی جا سکتی ہے جس کا عنوان ہے "انتظار" "یک شب دری بہ خلوتِ ما وانمی کنی ......

اس طرح دیکھئے تو دورِ حاضر کی فارسی شاعری مسائل سے کم بحث کرتی ہے۔ حالانکہ یہ دور مسائل ہی کا دور ہے اور موضوعات بکھرے پڑے ہیں۔ یہ کہا جائے تو سخت بات ہوگی کہ فارسی شعرا شاید کو یہ تلخی کے شکار ہیں۔ تاہم کسی بھی ادب کے لیے یہ اچھی علامت نہیں کہ وہ اپنے آس پاس کے مسائل کو نظر انداز کر کے عشق و عاشقی اور بہاریہ منظر نگاری پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دے۔ مثلاً :-

باغ و بستان بہاری می آید	فصل سبز بہاری آید
می شگوفد لبانِ گل در باغ	در گلستان ھزاری آید

یہ اشعار آج کے فارسی شاعر عزیز اللہ زیاری کے ہیں جو مناجات کے مختصص معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعہ میں قدیم صوفی شعرا کی طرح کئی مناجات ملتے ہیں۔ مثلاً :-

ھمدمِ من مونسِ من ماہِ من	ھم شب و ھم روز تو ھمراہِ من
بندۂ فرمانِ توام یا امیر	لطف کن و دستِ دلم را بگیر

مناجات، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قدیم متصوفانہ شاعری کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ درمیانی مدت میں یہ چیز کہیں گم ہو گئی تھی تو یہ ایران کے سیاسی انتشار کا نتیجہ تھا۔ حالات پُرسکون ہوئے تو فارسی شاعری ایک بار پھر صوفیانہ یا اخلاقی مضامین کی طرف مائل نظر آنے لگی :

مال و منال دھر کہ غیر از وبال نیست	ھرگز پسندِ خاطرِ صاحب کمال نیست
این چند روز در گذرِ عمر بی ثبات	در راکہ جز فسانۂ خواب و خیال نیست

اگر ان اشعار سے آج کے فارسی شاعر حسین لاہوتی صفا کا نام ہٹا دیا جائے تو اسے عمر خیام کی رباعی تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا ...... تاہم ان سب باتوں کے باوجود یہ کہنا بھی بعید از انصاف ہوگا کہ آج کی فارسی شاعری شعر سنتی کی کورانہ تقلید ہے۔ بعض شعرا اس انداز و اسلوب اور رجحان سے نمایاں طور پر منحرف نظر آتے ہیں۔ وہ تلخ مسائل کا سامنا ہی نہیں کرتے بلکہ اسے بطور آئینہ پیش کرنے کی جرأت بھی رکھتے ہیں۔ اس قسم کے جرأتمند شعرا میں ایرج قنبری کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شاعری میں ایک تہی دست بچہ، غربت و افلاس کا علامیہ بن کر سامنے آیا ہے۔ یہ بچہ حسرت و اندوہ کے جذبات سے پُر ہے کہ اس کی تمام خواہشات نا آسودہ اور اس کی تمام آرزوئیں تشنہ تکمیل ہیں۔ ایرج قنبری کی نثری نظم ہے:-

دنبال چشم ھای تو می گردم
مثل پرندہ ای
کہ آشیانہ خود را
گم می کند
شب تور بستہ است
بر چشم ھای من
اما چگونہ پلک فرو بندم
وقتی
کہ دست ھای کوچک من
باز ہم تہی است

دراصل ایسے ہی شعرا ہمیں مایوسی سے بچاتے ہیں اور اس قسم کی نظموں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ فارسی کا موجودہ شعری منظر نامہ، فکری تہی دامنی کا شکار ہرگز نہیں ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی اس عکس میں کتنے ہی خانے خالی ہیں جن میں رنگ بھرنے کی ضرورت ہے۔

Deptt. of Persian, M.S. College,
Motihari (Bihar)- 845 401

احمد جمال پاشا مرحوم

انشائیہ کی پہچان

عملی تنقید اور تجزیے کی صلاحیت کی کمی کے باعث وہ لوگ تک جو انشائیہ کی تعریف اور اس کی خصوصیات کو سلیقے سے بیان کر دیتے ہیں مگر جب انشائیہ کی پہچان کی منزل آتی ہے تو بہک جاتے ہیں۔ سنجیدہ مضامین، طنزیہ و مزاحیہ مضامین کو انشائیہ کہنے لگتے ہیں۔ ہمارے نقادوں کا یہ رویہ غیر علمی، غیر تجزیاتی، غیر اسلوبیاتی اور غیر سائنسی ہے جو جذباتی بیانات اور عبارت آرائی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اگر آپ کو غزل اور نظم میں صنفی اور ہیئتی فرق کا احساس ہے تو پھر انشائیہ، مضمون اور طنزیہ مزاحیہ مضمون میں فرق کا امتیاز ہونا چاہیے۔ اردو انشائیہ اور انشائیہ کی تحریک کے بانی، باوا آدم اور موجد ڈاکٹر وزیر آغا اس ضمن میں فرماتے ہیں :

> ''ہم میں سے اکثر لوگ غزل کے شعر کو قصیدہ کے شعر سے الگ کر کے پہچان لینے پر قادر ہیں (حالانکہ ہیئت کے اعتبار سے غزل اور قصیدہ کے شعر میں کوئی فرق نہیں ہوتا) تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم انشائیہ کو ان مضامین سے الگ نہ کر سکیں جو ہیئت کے اعتبار سے انشائیہ سے مشابہ ہیں لیکن مزاج اور نوعیت سے یکسر مختلف ہیں''۔ [1]

جس طرح شاعری میں ہم غزل کے شعر کو پہچان لیتے ہیں اسی طرح مضمون، طنزیہ مزاحیہ مضمون اور انشائیہ کے درمیان بہ آسانی شناخت کر سکتے ہیں۔ اس میں جو تخلیقی آب و رنگ کی چمک دمک ہوتی ہے۔ غزل کے پیکر مصرعوں اور اشعار میں مختلف کیفیات، احساسات اور جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ طبیعت اور موڈ میں تخلیقی فکر کی آمیزش ہوتی ہے۔ مضمون پن، افسانویت، شگفتگی و سنجیدگی ہوتی ہے داخلیت اور تازگی ہوتی ہے۔ فکر کا نیا زاویہ اور انوکھا پن ہوتا ہے۔ اس سے ہم مضمون، طنزیہ مزاحیہ مضمون اور انشائیہ کے ڈھیر میں بہ آسانی انشائیہ کی شناخت کر سکتے ہیں۔ کیا پطرس کے مضامین، مضامین رشید احمد صدیقی اور وزیر آغا کے انشائیوں میں اسلوب، طرز ادا، انداز فکر اور بیان کی سطح پر فرق نہیں ہے؟ کیا شفیق الرحمن کے مزاحیہ افسانوں، مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین اور انور سدید کے انشائیوں میں فرق محسوس نہیں کر سکتے؟ کیا فرحت اللہ بیگ کے مزاحیہ مضامین، کرنل محمد خاں کے مزاحیہ مضامین اور غلام جیلانی اصغر و شمس آغا کے انشائیوں میں فرق کا احساس نہیں ہوتا؟ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو اس سے تو آپ کی عملی تنقید، تجزیے اور

---

[1] وزیر آغا۔ دوسرا کنارہ (پیش لفظ) ص ۱۰، مطبوعہ مکتبہ اردو زبان ریلوے روڈ سرگودھا، جون ۱۹۸۲ء۔

موازنے کی فکری صلاحیت پر آنچ آتی ہے۔ جب آپ شاعری میں دلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کا موازنہ کرتے ہیں تو سارا زور داخلیت اور خارجیت میں فرق کے اظہار پر ہوتا ہے۔ نثر میں جب Essay اور Personal Essay میں فرق، انشائیہ کے دبستان سرگودھا کے غیر دبستانی ایسے اور طنزیہ مزاحیہ مضمون میں موازنے کا سوال آتا ہے تو پھر آپ پرسنل ایسے کی داخلیت اور طنزیہ مزاحیہ مضامین کی خارجیت پر زور کیوں نہیں دیتے ؟

انشائیہ مواد اور تکنیک کے لحاظ سے ایک جداگانہ کیفیت کا حامل ہے۔ Personal Essay کی متنوع کیفیات، ابلاغ اور اظہار کے سانچے میں Essay یا طنزیہ مزاحیہ مضامین اور اخباری کالموں سے مختلف ایک علاحدہ نثری صنف کے نقوش واضح اور نمایاں ہیں۔ تھوڑی سی کوشش سے انشائیہ کے حدود اور محاسن کا تعین کر سکتے ہیں۔ اس کا غیر رسمی طریقہ کار، شخصی ردعمل اور زندگی کے کسی پہلو کو نئے زاویہ سے پیش کرنا، سامع یا قاری کو مسرت بخشنا، خیال و اسلوب کی تازگی، انکشافِ ذات۔

طنزیہ مزاحیہ مضامین میں ظرافت نگار زندگی کی ناہمواریوں کی گرفت کے لیے عام ذہنی روش سے اوپر اٹھ کر متوجہ ہوتا ہے۔ طنز نگار آپ کو فراز سے مخاطب کرتا ہے۔ اس میں جذبۂ افتخار اور احساسِ برتری ہوتا ہے۔ مزاح نگار ناہمواریوں سے ہم آہنگ ہے۔ وہ نشیب سے خطاب کرتا ہے اس کا ردعمل ہمدردی اور محبت کا ہوتا ہے۔ مگر انشائیہ نگار نہ آپ کو فراز سے مخاطب کرتا ہے نہ نشیب سے۔ وہ آپ سے ہموار سطح پر ہم کلام ہوتا ہے۔ وہ آزاد ہے، وہ دونوں طرف آ جا سکتا ہے۔ مزاح نگار نشیب سے فراز تک نہیں جاتا۔ نہ طنز نگار فراز سے نشیب میں جا سکتا ہے۔ نشیب، فراز اور ہموار سطح کا فرق ان تینوں کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ آپ اندازِ تخاطب سے آسانی کے ساتھ انشائیہ کو پہچان سکتے ہیں :

> ''طنزیہ مزاحیہ مضمون کا جزو لاینفک تکمیل ہے جب کہ انشائیہ کی .... امتیازی خصوصیت اس کی عدمِ تکمیل ہے''۔ [1]

ایسے کی خوبی ہی اس کی عدمِ تکمیل ہے۔ وہ تو قاری کی فکر کو بیدار کر کے اسے فکر و نظر کے نئے در وا کر کے تکمیل کی منزل سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا ہے۔

> ''انشائیہ نگار کسی بلند مقام پر کھڑا ہو کر اپنے قاری کو اصلاح کی غرض سے نہ تو نصیحت کرتا ہے اور نہ اسے طنز و تعریض کے تیروں سے چھلنی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نچلی سطح پر اتر کر قاری کو ہنسانے کی .... کوشش بھی نہیں کرتا .... انشائیہ نگار اپنے قاری کو ایک بااعتماد دوست تصور کرتا ہے۔ (اس کا) .... دوستانہ رویہ (ہوتا ہے) ....'' [2]

---

[1] وزیر آغا۔ تنقید اور احتساب (انشائیہ کیا ہے؟) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ص ۲۰۳۔
[2] انور سدید۔ ذکر اس پری وش کا (تکمیل آرزو) انور سدید کے انشائیے: مکتبہ اردو زبان سرگودھا ص ۱۱۔

"جب ہاتھ حُسنِ اتفاق سے "مخفی رشتے" کے تار کو مَس کرتے ہیں تو لحظہ بھر کے لیے روشنی کا ایک جھماکہ ہوتا ہے جس سے اس بنیادی حقیقت یا سچائی کے چند ٹوٹے ہوئے سرے ہمارے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور پھر جب ہم کسی نہ کسی طرح ان کی آپس میں گرہ لگاتے ہیں تو نئے معنی از خود نمودار ہونے لگتے ہیں۔ اس عمل میں سارے فن کا کمال بھی پنہاں ہے"۔[1]

یہاں پر سلیم آغا قزلباش نے انشائیہ کے عمل پر روشنی ڈال کر انشائیہ کی پہچان کے اس اہم پہلو کی جانب اشارہ کیا ہے کہ اس میں مخفی رشتے اور نئی سچائیاں سامنے آتی ہیں۔ مضمون میں خواہ وہ طنزیہ مزاحیہ کیوں نہ ہو، جانی پہچانی حقیقتوں کا بیان ہوتا ہے جب کہ انشائیہ میں فکر وحقیقت کا نیا پہلو سامنے لایا جاتا ہے۔

لوگ سنجیدہ یا طنزیہ مزاحیہ مضمون پر انشائیہ کا لیبل لگا دیتے ہیں جب کہ Personal Essay کا Essay سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ دراصل مختلف اصناف کو Essay میں داخل کرنے کا رجحان مغرب سے چلا ہے مگر وہاں بھی Essay اور Personal Essay میں فرق کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی مضمون کی وسعت میں بہت کچھ سما جاتا ہے جب کہ انشائیہ انشائیہ ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی ایسا کرے تو اس کی قوت شناخت، تجزیہ و تفہیم مشکوک سمجھی جاسکتی ہے۔

انشائیہ کی پہچان ذہنی ریاضت اور تربیت کا عمل ہے۔ مضمون اور انشائیہ میں وہی فرق ہے جو گانے اور پکے گانے میں۔ گا تو کوئی بھی لے گا، مگر جب تک موسیقی کی تربیت اور اس پر ریاض نہ کیا جائے اس وقت تک پکے گانے کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لیے ہمارے اچھے ناقد بھی انشائیہ کی پہچان کے مرحلے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

جس طرح ہم غزل اور نظم میں پہچان رکھتے ہیں، اچھی نظم اور اچھی غزل کی شناخت کر کے دونوں کو ایک دوسرے سے مختلف تسلیم کرتے ہیں تو کوئی سبب نہیں کہ Essay اور Personal Essay مضمون اور انشائیہ کی علاحدہ شناخت نہ کر سکیں۔

انشائیہ کی پہچان یہ ہے کہ اس میں اختصار ہوتا ہے، اس کا طریقہ کار رمزی ہوا کرتا ہے۔ ایک قسم کی ذہنی ترنگ ہوتی ہے۔ داخلیت ہوتی ہے۔ اظہار ذات اس کا مقصد ہوتا ہے۔ ان سب کی مدد سے ہم انشائیہ کو پہچان سکتے ہیں۔ انشائیہ اپنے وصف سے پہچانا جاتا ہے۔ اسے سمجھایا نہیں جاسکتا۔ ایسے بہت سے علوم ہیں جن میں "موسیقی" کے فن کی طرح ذہنی تربیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی زمرے میں انشائیہ بھی شامل ہے۔

اگر پتنگ بازی پر آپ سے لکھنے کو کہا جائے تو آپ کے سامنے مختلف پیرایہ بیان ہوں گے۔ ایک تو آپ ناصحانہ

---

[1] سلیم آغا قزلباش۔ منتخب انشائیے۔ مکتبہ اردو زبان سرگودھا مطبوعہ مئی ۱۹۸۲ء (پیش لفظ) ص ۶،۷۔

اور خطیبانہ رنگ اختیار کر کے اس شغل سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے یا پتنگ کی ایجاد، اس کے عہد بہ عہد ارتقا، ممتاز پتنگ بازوں اور پتنگ کی قسموں اور پتنگ بازوں کے داؤں پیچ کے فن پر روشنی ڈالیں گے اور ایک مضمون لکھ دیں گے۔ دوسرے آپ پتنگ اور پتنگ بازوں کا مذاق اڑا کر اور طنز کر کے ایک طنزیہ مضمون لکھ ڈالیں گے۔ تیسرے آپ پتنگ اور پتنگ بازی کے ردِ عمل میں مسکرائیں پتنگ بازی سے لطف اندوز ہوں تو آپ کا مضمون مزاحیہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر آپ پتنگ بازی کے تجربے سے اس کا نظارہ کر کے لطف اندوز ہوں اور پتنگ باز آپ کو پتنگ اڑانے کی دعوت دیں اور آپ کے ہاتھ میں پتنگ کا سرا آتے ہی لمحہ بھر میں آپ کی پتنگ آسمان کا تارہ بن جائے اور آپ محسوس کریں کہ آپ کی ذات آسمان کی بلندی پر جا کر تحلیل ہو گئی اور آپ خود فراموشی کے لمحات سے گزرنے لگے اور رفتہ رفتہ پھر وہی پتنگ سمٹ کر آپ کے نزدیک آنے لگتی ہے اور اس کے ساتھ آپ کی بھی زمین پر واپسی ہو جاتی ہے تو اس پتنگ اڑانے کے عمل سے آپ نے جو حظ کشید کیا تھا اسے قاری تک پہنچانے کا اہتمام کریں تو آپ کا یہ Personal Essay انشائیہ میں شمار ہوگا۔ اس میں اسلوب کی تازگی، شگفتگی اور لچک سے آپ پہچان لیں گے کہ یہ انشائیہ ہے۔

> ''(انشائیہ) میں ایک نیا اور تازہ زاویہ ابھرے جیسے آپ کسی شے کو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے ہیں مگر یہ زاویۂ نگاہ کسی نظریے یا فلسفے کی تبلیغ کا روپ نہ دھارے .... انشائیہ دیکھنے کا ایک تیکھا زاویہ ہے۔ مسرّت کشید کرنے کا انوکھا عمل! جو تحریر اس خاص مزاج کی حامل ہوگی، انشائیہ کے تحت شمار ہوگی''۔ [1]

ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کی پہچان کو آسان کرتے ہوئے فکر کے نئے اور تازہ زاویہ پر زور دیا ہے۔ گویا کسی چیز کو آپ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ بچے یا سیاح کی نگاہ سے دیکھنے کا عمل اور دیکھنے کے اس تیکھے زاویہ سے مسرّت کشید کرنے کا انوکھا عمل اگر تحریر میں پایا جائے تو ہم اسے انشائیہ کہیں گے۔ جس کی ایک نادر مثال ڈاکٹر وزیر آغا نے دی ہے:

> ''اگر آپ......... ایک نئے زاویہ سے سمندر کو دیکھنے کے متمنی ہیں تو آپ سمندر کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو جائیں اور پھر جھک کر اپنی ٹانگوں میں سے سمندر کو دیکھیں تو آپ کو ایک ایسا منظر دکھائی دے گا جو آپ سے پہلے شاید ہی کسی کو نظر آیا تھا۔ ٹانگوں میں سے سمندر کو دیکھنے کی یہ روش دراصل آپ کو دیکھنے کا ایک نیا زاویہ عطا کرے گی جو دیکھنے کے مروّج انداز سے آپ کو آزاد کر دے گا۔ اس نئے مقام کی تسخیر کے بعد آپ کے ہاں جو عجیب و غریب ردِ عمل مرتب ہوگا وہی انشائیے کی جان ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ''مرکز'' سے

---

[1] ڈاکٹر وزیر آغا (انشائیہ کی پہچان) اردو کے بہترین انشائیے: جمیل آذر مکتبہ اردو زبان ریلوے روڈ سرگودھا اکتوبر ۱۹۷۹ء ص ۱۷-۲۱

بندھا ہوا ہے۔ انشائیہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب آپ اس مرکز سے خود کو منقطع کر کے اپنے لیے ایک اور "مرکز دریافت کر لیتے ہیں اور آپ کو اپنا ماحول ایک بالکل نئے روپ میں نظر آنے لگتا ہے"۔ [1]

انشائیہ کی پہچان بے حد آسان ہے۔ بشرطیکہ اشیا، کو نئے زاویے سے دیکھنے کو سمجھ لیا جائے۔ مروجہ انداز فکر سے ہٹ کر، عمومی خیالات کے مرکز سے ہٹ کر نئے مرکز کو دریافت کرنا اور نئے مدار میں، نئے ماحول، نئے روپ اور نئے طرز کو پہچان لینا۔ اس کے بعد ہی نہ صرف انشائیہ کی پہچان ممکن ہے بلکہ اس نئے تجربے سے گزرنے سے حاصل ہونے والی لطف اندوزی میں بھی شریک ہوا جا سکتا ہے۔ انشائیہ شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے۔ انشائیہ تو :

"خوابوں سے آگے نکل جانے کا خواب .... ہے۔ تخلیق کار یہ خواب دیکھتا ہے اور بلا جھجک اور بلا خوف و خطر ایک سطح خیال سے دوسری جانب سفر کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کا کام بھی اسی نوع کا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے ساتھ منسلک عمومیت کی گرد جھاڑتا ہے اور اس کی بنیاد کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تاوقتیکہ زنجیر کے ٹوٹے ہوئے دوسرے سرے کا سراغ مل جائے (وہ) ایک ماہر نفسیات کی طرح زنجیر کے ٹوٹے ہوئے سروں کو جوڑ کر نئے رشتوں کو جوڑتا ہے اور اپنے نجی منطقے کے نرالے تجربے کے حوالے سے ان کا احوال رقم کرتا ہے"۔ [2]

یہی وہ مقام ہے جہاں Personal Essay، Impresonal Essay سے علاحدہ ہو جاتا ہے۔ یہ فرق داخلیت اور خارجیت کے پہلو سے بھی نمایاں ہے۔ انشائیہ کی پہچان یہی ہے کہ یہ داخل کا سفر ہے۔ اس میں داخلیت ہوتی ہے اور Impersonal Essay کا حسن اس کی خارجی بوقلمونیوں میں پنہاں ہے۔ Personal Ess?y (انشائیہ) اور Impersonal Essay (مضمون) میں بہت ہی آسان پہچان یہ بھی ہے کہ انشائیہ میں عمل انشاء، ذہنی سفر، تخلیقی نثر، داخلیت، انوکھا پن، مسرت بخش شگفتہ موڈ، انبساط ذہنی اور فکر کے نئے مرکز کی بازیافت وغیرہ وہ تمام عناصر Impersonal Essay (مضمون) میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ خواہ وہ سنجیدہ مضمون ہو یا طنزیہ مزاحیہ۔ مختصراً ہم عرض کر سکتے ہیں کہ انشائیہ کے بارے میں جو کچھ بھی اردو انشائیہ اور انشائیہ کی تحریک کے موجد، بانی اور خالق ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں۔ وہ مضمون میں خواہ وہ کسی بھی کسی قسم کا کیوں نہ ہو نہیں پایا جاتا اور جو کچھ بھی مضمون میں پایا

---

[1] ڈاکٹر وزیر آغا (انشائیہ کی پہچان) اردو کے بہترین انشائیے: جمیل آذر، مکتبہ اردو زبان ریلوے روڈ سرگودھا اکتوبر ۱۹۷۶ء، ص ۱۷۳۔

[2] مرزا حامد بیگ: (انشائیہ پر ایک نوٹ ص ۱۵): اردو زبان، انشائیہ نمبر مارچ، اپریل ۱۹۸۳ء سرگودھا

جاتا ہے وہ انشائیہ میں نہیں پایا جاتا۔ انشائیہ اور مضمون کی علاحدہ علاحدہ خودمختار صنفی حیثیت اور خصوصیات ہیں جو ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ یہ دو مختلف ذہنی رویے ہیں جن میں خلط مبحث سے انشائیہ کی پہچان ممکن نہیں۔ انشائیہ کی شناخت جب بھی کی جائے گی تو اس کی حدود میں دیگر اصناف کی حدود میں نہیں۔ جب کہ ہر صنف کا اپنا علاحدہ وجود اور اہمیت ہے۔

انشائیے میں گریز کی سی کیفیت ہوتی ہے، خود کلامی ہوتی ہے۔ مرکز گریز، غیر روایتی انداز فکر، گفتگو کا سا شگفتہ انداز جیسا کہ وزیر آغا کے انشائیے ''سیاح'' میں آپ پائیں گے:۔

> ''یوں بھی تقسیم کا وصف شاید عورتوں کی فطرت میں شامل ہے۔ جس طرح دھرتی ایک بیج کو سیکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے اور درخت خود کو لاکھوں شاخوں اور پتوں میں بانٹ دیتا ہے بعینہ عورت ازل سے اپنے گھر کو کوٹھریوں اور سامانوں کو پوٹلیوں میں تقسیم کرتی آئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ عورت تو اپنے جسم کو بھی ٹکڑوں میں بانٹ دیتی ہے اور یہ ٹکڑے جو مہذب زبان میں ''جگر کے ٹکڑے'' کہلاتے ہیں۔ عورت کے جسم، دامن اور ہینڈ بیگ سے چمٹے ''اہرام مصر'' کے سائے میں دور دور تک بکھرے نظر آتے ہیں''۔ [1]

غزل کی طرح انشائیہ کو بھی جذبے اور زبان سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایک تحلیلی کیفیت میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انشائیہ نگار کس طرح تخلیقی عمل کے لمحے میں انکشاف ذات کے پراسرار عمل سے گزر کر ایک طربیہ فلسفی کی طرح سامنے آجاتا ہے جس کی شخصیت میں بقول غلام جیلانی اصغر ایک قسم کی ''سماجی معقولیت'' ہوتی ہے۔

---

[1] وزیر آغا: عارف عبدالمتین ''اوراق'' ''۔ افسانہ انشائیہ نمبر لاہور، دور ثانی، پہلا شمارہ (انشائیہ کیا ہے؟ غلام جیلانی اصغر) ص ۲۳۰، ۲۳۱

◆◆◆

دکنی ادب کے فروغ میں
ڈاکٹر زور کا حصہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی شخصیت اردو دنیا میں تعارف کی محتاج نہیں۔ دکنیات اور لسانیات کے حوالے سے وہ بر صغیر ہند و پاک میں مشہور و معروف ہیں۔ یوں تو ڈاکٹر زورؔ کے خامۂ پُر زور نے بیک وقت تنقید، تحقیق، تدوین متن، لسانیات، صوتیات، افسانہ نگاری، تاریخ، سوانح نگاری، آثار قدیمہ اور شاعری، غرض زبان و ادب کے مختلف شعبوں میں داد نگارش دی ہے لیکن زیر نظر مضمون میں ڈاکٹر زورؔ کی صرف ان خدمات اور کارناموں کو معرض بحث بنایا جائے گا جو "دکنی ادب" کے فروغ سے متعلق ہیں۔ یہاں یہ جاننا ضروری اور مناسب محسوس ہوتا ہے کہ دکنی ادب سے ڈاکٹر زورؔ کی اس قدر دلچسپی اور تعلق خاطر کے کیا اسباب تھے کہ دکنیات کا فروغ ان کی زندگی کا مشن بن گیا تھا۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ تھی کہ ڈاکٹر زورؔ دکنی الاصل تھے۔ ان کی سیرت و شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں دکنی ماحول، دکنی روایات اور دکنی تہذیب کا زبردست اثر رہا۔ اس کی وجہ سے انھیں سرزمین دکن اور اس کے ایک ایک ذرّے سے محبت اور شیفتگی تھی جو اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ "حیدر آباد کے دیوانوں میں محمد قلی کے بعد زورؔ صاحب کا نام سب سے روشن نظر آتا ہے[1]"۔ دکن سے ڈاکٹر زورؔ کے گہرے شغف کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جب انھوں نے شعور کی آنکھ کھولی تو دیکھا کہ سلطنت آصفیہ کی فراخدلانہ سرپرستی کے سبب شمالی ہند کے جو لوگ حیدر آباد میں مختلف عہدوں اور ملازمتوں پر فائز تھے وہ دکنی زبان اور دکنی تہذیب کو بہ نظر حقارت دیکھتے اور خانگی مجلسوں میں اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ انھیں اپنے اہل زبان ہونے کا بڑا غرہ تھا۔ وہ اپنی زبان اور تہذیب کو برتر و اعلیٰ سمجھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں حیدر آبادی ایک طرح سے احساس کمتری کا شکار تھے۔ شمال کے لوگ جب ان کی زبان پر اعتراض کرتے تو ان کی زبان گُنگ ہو جاتی تھی۔ اس فضا میں ڈاکٹر زورؔ نے طالب علمی کے مراحل طے کیے لیکن اس کا نفسیاتی رد عمل یہ ہوا کہ ان کے دل میں دکنی زبان اور دکنی تہذیب سے بے پناہ ہمدردی اور محبت کے جذبات نشو و نما پاتے گئے۔ دکنی ادب کی تحقیق میں انھوں نے جو کارنامے انجام دیئے ان کے پیچھے لاشعوری طور پر یہی جذبہ کار فرما تھا کہ شمالی ہند کے بے جا لسانی فخر و مباہات کے طلسم کو توڑا جائے اور دکنی زبان اور ادب کے سرمایے کی قدر و قیمت تسلیم کروائی جائے۔ دکنی تہذیب سے وابستگی کا جذبہ ان میں اس قدر شدید تھا کہ انھوں نے کسی احساس کمتری کے بغیر دانستہ اور شعوری طور پر اپنی گفتگو، لب و لہجے، نشست و برخاست، عادات و اطوار،

وضع قطع، کھانے پینے اور لباس وغیرہ ہر چیز پر دکنی اور حیدر آبادی تہذیب جاری و ساری اور طاری کی ہوئی تھی۔ انھوں نے دکنی کلچر، دکنی ادب اور دکنی روایات کی جو تعریف و تحسین کی اس کا محرک یہ جذبہ تھا کہ دکن کی عظمت کا احساس دلایا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ زبان و ادب کی خدمت کے باب میں دکن کو شمالی ہند پر تفوق حاصل ہے۔

دکنی ادب سے ڈاکٹر زور کے لگاؤ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لندن یونیورسٹی میں ان کا پی-ایچ-ڈی کا مقالہ اردو زبان کے آغاز و ابتداء سے متعلق لسانی تحقیق پر مبنی تھا۔ یہ موضوع ایسا تھا کہ جس کو سر کرنے کے لئے دکن کے قدیم ادبی سرمایہ سے مفر ممکن نہیں۔ اس تحقیق کے دوران دکنی ادب کے شہ پاروں پر ان کی نظر پڑی۔ ان کی ادبی و لسانی قدر و قیمت نے ڈاکٹر زور کو دکن کا عاشق صادق بنا دیا۔ دکنی سے ڈاکٹر زور کی انسیت اور دلچسپی کا ایک پہلو تصوف بھی تھا۔ صوفی خانوادے کے چشم و چراغ ہونے کے ناطے ڈاکٹر زور بنیادی طور پر متصوفانہ مزاج کے مالک تھے۔ رواداری، اخلاص اور مروت ان کے گھرانے کی تعلیمات تھیں۔ دکنی تہذیب میں قطب شاہی خاندان کے دور حکومت میں رواداری اور قومی یکجہتی کی روایات کو جو فروغ اور نشو و نما حاصل ہوا دکنی ادب اس کی صحت مند روایات کا امین و پاسبان ہے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر زور کو دکنی ادب سے ذہنی ہم آہنگی اور وابستگی تھی۔

اب ڈاکٹر زور کے تحقیقی و تصنیفی کاموں کا جائزہ لیا جاتا ہے جو نہ صرف دکنی تہذیب و ادب کی دریافت و باز آفرینی کرتے ہیں بلکہ اس کی تفسیر و تفہیم اور تعبیر و ترجمانی بھی۔

اردو شہ پارے جس زمانے میں ڈاکٹر زور اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تکمیل نیز اردو زبان کے لسانی اور صوتیاتی مسائل پر تحقیقی کام کے سلسلے میں لندن اور پیرس میں قیام پذیر تھے اسی دوران انھیں آکسفورڈ، کیمبرج، پیرس اور اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانوں میں قدیم اردو کی نایاب قلمی کتابوں کے مطالعہ و مشاہدے کا موقع ملا۔ ان میں بعض ایسی بھی تھیں جن کے نسخے ہندوستان میں بھی موجود نہیں تھے۔ ڈاکٹر زور نے محسوس کیا کہ ان نادر مخطوطات کو علمی دنیا میں متعارف کرانا ضروری ہے۔ چنانچہ ہندوستان واپس ہونے کے بعد انھوں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا اور "اردو شہ پارے" لکھی جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ "اردو شہ پارے" دکنی ادب کی تحقیق کی تاریخ میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس قدر گراں مایہ کتاب اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں چھپی۔ یہ وہ کتاب ہے جس نے دکنیات کے میدان میں محققین کیلئے نئی راہیں ہموار کیں۔

اردو میں ولی اورنگ آبادی سے ماقبل کی ادبی تاریخ لاعلمی کے دھندلکوں میں مخفی تھی ڈاکٹر زور نے اپنی اس تصنیف میں قدیم شہ پاروں کی روشنی میں ولی سے پہلے کی ادبی تاریخ کو مربوط و مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ہندوستان میں موجود مخطوطات نیز یوروپ کے کتب خانوں میں مخزونہ قدیم اردو کے نادر قلمی نسخوں سے مواد اکٹھا کیا اور اردو ادب کے ان قدیم شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں سے روشناس کرایا جن کی

تحقیقات اور ادبی خدمات دور ایام کے زیر اثر محو و فراموش ہو چکی تھیں۔ اردو شہ پارے چار ابواب اور آٹھ ضمیموں پر مشتمل ہے۔ باب اول میں گجرات اور دکن کے اولین شعرا اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب دوم میں عادل شاہی حکمرانوں کے عہد حکومت سے تعلق رکھنے والے بیجاپور کے ادیبوں اور شاعروں کے حالات لکھے ہیں۔ باب سوم میں گولکنڈہ کے قدیم شعرا کے حالات اور ان کے ادبی کارناموں کا ذکر قلم بند کیا ہے۔ باب چہارم میں مغل دور کے شعرا اور ادیبوں کے حالات اور ان کی تصانیف سے متعارف کروایا ہے۔

اردو شہ پارے کے دوسرے حصے میں نظم اور نثر کے قدیم شہ پاروں کے نمونے درج کیے ہیں۔ اس کتاب نے دکنی زبان کی ادبی تاریخ کو طوالت بخشنے اور اس کی قدامت و بزرگی منوانے میں بڑا حصہ لیا۔ ہر چند کہ جدید تحقیقی مواد اور بعض نئے انکشافات نے اس کتاب کے بعض بیانات کی تردید و تغلیط کی ہے لیکن اس کے باوجود دکنی ادب کا کوئی محقق یا طالب علم اس کے مطالعہ سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔

کلیاتِ محمد قلی دکنیات کے سلسلے میں ڈاکٹر زور کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان قلی قطب کے کلیات سے ادبی دنیا کو روشناس کرایا جس کے نتیجے میں اردو ادب خاص طور پر اردو شاعری کی عمر میں ڈیڑھ سو سال کا اضافہ ہوا ورنہ ولی اورنگ آبادی کو اردو شاعری کا باوا آدم اور پہلا صاحب دیوان شاعر سمجھا جاتا تھا۔

کلیات قلی کی تدوین ڈاکٹر زور کا ایسا کارنامہ ہے جس سے اردو کی تاریخ ان کی ممنون احسان رہے گی۔ بڑی سائز کی ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کلیات خاص اہتمام سے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی جانب سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر زور کے قلم سے تین سو پچیس صفحات پر مشتمل ایک طویل، جامع اور پر مغز مقدمہ بھی شامل ہے جس میں قلی قطب شاہ کے حالات اور اس کے عہد کی تہذیب و ثقافت اور طرز معاشرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ انھوں نے اس کلیات کے آخر میں دکنی الفاظ کی فرہنگ بھی دی ہے۔ ہر چند کہ اس کام میں کلیات محمد قلی کا وہ قدیم نسخہ جو کتب خانہ آصفیہ سے آصف سابع کے کتب خانے کی زینت بنا ڈاکٹر زور کے پیش نظر نہیں تھا اور انھوں نے کتب خانہ آصفیہ کے باقی دو نسخوں کی مدد سے کلیات قلی مرتب کی لیکن اس کے باوجود بحیثیت مرتب متن ان کی محنت، توجہ اور ژرف نگاہی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ محمد قلی قطب شاہ کی اس ضخیم کلیات میں غزلیات کے علاوہ قصائد، مراثی، مثنویاں، رباعیات اور نظمیں بھی شامل ہیں جنھیں ڈاکٹر زور نے سرخیوں سے مزین کر کے موضوعات کا تعین کیا ہے۔ اپنے تحقیقی مقدمے میں انھوں نے محمد قلی کی شاعری کی اہم خصوصیات پر بھی تبصرہ کیا ہے اور اس کی شاعری میں ہندوستانی مقام و ماحول، دکنی تہذیب اور مقامی مزاج اور آب و رنگ کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے محمد قلی کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ثابت کیا ہے۔ مقدمے کے بعض مشمولات سے مؤرخین کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن قطب

شاہی عہد کے تمدنی پس منظر، اُس دور کے تاریخی و سیاسی واقعات کی تفصیل اور محمد قلی کی سوانح کی تحقیق میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ تواریخ سے مواد اکٹھا کرنے اور اس کا تحلیل و تجزیہ کرنے میں ڈاکٹر زورؔ نے گہرے تاریخی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے جب کلیات محمد قلی کی تدوین کی تو اس کے تتبع میں پروفیسر عبدالمجید صدیقی کے بقول "بے شمار اہل قلم اس میدان میں اُتر آئے اور دیکھتے دیکھتے کئی دواوین اور مثنویاں منظر عام پر آ گئیں اور اس کے طفیل میں دکن کی تاریخ و ثقافت بھی بے نقاب ہو گئی۔ اگر یہ کلام منظر عام پر نہ آتا تو نہ صرف دکنی ادب چھپا رہتا بلکہ تاریخ دکن بھی آنکھوں سے اوجھل رہتی ۲"۔

حیات محمد قلی ڈاکٹر زورؔ کا یہ تحقیقی کارنامہ جو پانچ سو صفحات پر مشتمل اور تصاویر سے مزین ہے ۱۹۴۰ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس میں قطب شاہی خاندان کے پانچویں بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے سوانحی حالات تفصیل سے قلم بند کیے گئے ہیں۔ اور تاریخی حوالوں کے ساتھ اس دور کی تاریخ، تہذیب، رسوم و رواج، عید اور تہوار، طرز معاشرت، شہر کی زیبائش و آرائش، عمارات، کھیل کود، تفریحات و تقریبات اور دیگر ثقافتی سرگرمیوں کو ادب کے صفحات پر زندہ و پائندہ کر دیا ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی کے بقول "یہ کتاب ایک بادشاہ کی سوانح عمری ہے مگر ایسی سوانح عمری ہے کہ جس میں سلطان کے ذاتی حالات، پیدائش، تعلیم و تربیت، آغاز شباب، شباب کی بدمستیاں، رندی اور مستی، جوانی و رعنائی، مذہبی پابندی، عقائد کی پختگی، فتوحات، جنگ و جدل، تدبر، سیاست، بیرونی تعلقات کے ساتھ اس زمانے کے رسم و رواج پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۳"۔

حیات میر محمد مومن میر محمد مومن قطب شاہی سلطنت کے پیشوا اور سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم تھے۔ گولکنڈے کی تاریخ اور دکنی تہذیب و ثقافت کی تعمیر میں انھوں نے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے۔ بدیں وجہ ڈاکٹر زورؔ نے بڑی تلاش و تحقیق سے ان کی سوانح حیات مرتب کی جو ۱۹۴۱ء میں شایع ہوئی۔ یہ کتاب تین سو دس صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں دس ابواب کے تحت میر مومن کے خاندانی حالات، ولادت، تعلیم و تربیت، دکن میں آمد، عروج و اقتدار کا حصول، مذہب امامیہ کی ترویج، فن تعمیر میں مہارت، ان کی تعمیر کردہ عمارات، آباد کردہ مواضعات، شہر حیدرآباد کی تعمیر، وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کے کارنامے اور ادبی تصانیف وغیرہ کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میر مومن کے حالات زندگی منتشر اور فراموش ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر زورؔ نے تحقیقی بصیرت اور عالمانہ تحقیق و جستجو کے ذریعہ قدیم تواریخی تذکروں اور آثار قدیمہ کی مدد سے ان کے حالات جمع کیے اور ان کی سوانح حیات کو تاریخی دستاویز کا روپ دیا۔

دکنی ادب کی تاریخ دکنیات میں ڈاکٹر زورؔ کا ایک اور وقیع کارنامہ "دکنی ادب کی تاریخ" کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ دکن میں اردو ادب کے نشو و نما کا جائزہ لیا ہے۔ اس مختصر تاریخ میں

چھ ابواب ہیں جن میں ۱۳۵۰ء سے ۱۷۵۰ء تک چار صد سالہ دور میں بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین کی سرپرستی میں پروان چڑھنے والے ادب کا اختصاصی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس میں کمال اختصار و جامعیت کے ساتھ ہر دور کے اہم شعرا اور مصنفین کے حالات زندگی اور ان کی ادبی تخلیقات پر روشنی ڈالی ہے اور عالمگیر کی فتح دکن کے بعد حیدر آباد میں ادب اور فنون لطیفہ کے زوال کی کیفیت بیان کی ہے۔ یہ کتاب اردو ادب کی علاقہ داری تواریخ میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بارے میں خود مصنف کا خیال تھا کہ ''گو یہ کتاب دکنی ادب کی تاریخ پر حرف آخر نہیں لیکن دکن کی علمی و ادبی کاوشوں کو عام اردو دانوں، طلبا و عوام میں متعارف کروانے کا ایک ذریعہ ہے ۴''۔

داستانِ ادبِ حیدر آباد دکنیات سے متعلق ڈاکٹر زور کی یہ تصنیف ۱۹۵۱ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں ۱۶۰۰ء سے ۱۹۰۷ء تک یعنی تین سو سال کے عرصے میں شہر حیدر آباد کے ارباب علم و دانش اور اصحاب کمال کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کا اجمالی مطالعہ قلم بند کیا گیا ہے۔ ''داستان ادب حیدر آباد'' دس ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں ڈاکٹر زور نے بڑی تفتیش و جستجو سے قطب شاہی و آصف جاہی عہد کی ادبی شخصیتوں کے واقعات اور ان کے ادبی اکتسابات کو احاطہ تحریر میں لایا ہے۔ اور ان کی تخلیقات کی قدر و قیمت اور ادبی مرتبہ کا بھی تعین کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مذکورہ عہد کے حکمرانوں اور امراء کی ادب نوازی اور شعرا و اہل کمال کی سرپرستی کا حال بھی لکھا ہے۔ مختصر یہ کہ زور صاحب کی یہ تصنیف علامہ ابن خاتون (قطب شاہی عہد) سے لے کر فرزندان جامعہ عثمانیہ کے ادبی کارناموں، علمی خدمات اور ادبی تحریرات کا بے نظیر مرقع ہے۔

تذکرہ اردو مخطوطات ڈاکٹر زور کا ایک نا قابل فراموش کارنامہ جو دکنی کے فروغ کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انھوں نے دوڑ دھوپ کر کے نہ صرف ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے میں نادر و نایاب قلمی نسخے اکٹھا کیے بلکہ ایک ایک مخطوطہ کا نہایت باریک بینی اور نکتہ سنجی سے مطالعہ کیا اور ان کے متعلق تفصیلی مواد ''تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو'' کے نام سے پانچ جلدوں میں شایع کیا جن میں گیارہ سو پچاس مخطوطات کا تذکرہ رقم کیا ہے۔ دکنی ادب کا کوئی محقق ان وضاحتی فہرستوں سے اعراض نہیں کر سکتا۔ ان فہرستوں کی تیاری میں ڈاکٹر زور نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے مخطوطات کی فہرستوں کو نمونہ بنایا جو ڈاکٹر ایتھے ریو اور بلوم ہارٹ نے بنائی ہیں۔ اپنے بیش قیمت اور معلومات آفریں مندرجات کے لحاظ سے یہ فہرستیں نہایت وقیع اور ممتاز ہیں کیوں کہ ان میں ڈاکٹر زور نے صرف مخطوطے کی وضاحت پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ شاعر یا مصنف کے نام، وطن، حالات زندگی، ہم عصر شعرا اور ادارہ میں اس کی تصانیف کے دیگر نسخوں کی تفصیلات بھی بہم پہنچائی ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے ہم نام یا ہم تخلص شاعروں اور ادیبوں کی نشاندہی بھی کی ہے تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔ ذیل میں ان فہرستوں کا اجمالی تعارف حوالۂ قلم کیا جاتا ہے۔

تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطات کے تذکرے کی یہ پہلی جلد ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی اس میں دو سو پچھتر (۲۷۵) قلمی نسخوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں پچھتر مخطوطات ایسے ہیں جن کے نسخے دیگر کتب خانوں میں نہیں ہیں۔ پچاس ایسے ہیں جو مصنفوں کے دستخطی یا ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ بعض مخطوطات مختلف حکمرانوں کی تخلیقات پر مبنی ہیں ان میں محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، علی عادل شاہ اور واجد علی شاہ کی تصانیف شامل ہیں۔ اس جلد میں بلحاظ زمانہ مخطوطات کی فہرست کے علاوہ قلمی نسخوں کے عطیہ دہندگان کی فہرست نیز اشخاص، کتب اور ناموں کا اشاریہ بھی شامل ہے۔ جس سے اسکی وقعت اور افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

تذکرہ مخطوطات جلد دوم یہ جلد ۱۹۵۱ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں ہندو مصنفوں یا مؤلفوں کی چودہ، ہندو کاتبوں کی تئیس، ہندو اہل ذوق کی فرمائش پر لکھی ہوئی دس، ہندوؤں کی مملوکہ یا مطالعہ کردہ پانچ اور سنسکرت اور ہندی کی چودہ کتابوں کے قلمی نسخوں کا تذکرہ درج کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس جلد میں پانچ سو چوّن (۵۵۴) مخطوطات کا تعارف ملتا ہے۔ جس میں عربی کے اڑتالیس، فارسی کے دو سو پچاس، اردو کے اکیاون اور ہندی کے پانچ قلمی نسخے شامل ہیں۔ اس جلد میں مخطوطات کی موضوع واری فہرست کے علاوہ آخر میں اشاریہ بھی موجود ہے۔

تذکرہ مخطوطات جلد سوم تذکرہ مخطوطات کی تیسری جلد ۱۹۵۷ء میں اشاعت پذیر ہوئی جو دو سو مخطوطات کے تذکرے پر محیط ہے۔ اس جلد میں بہت سے ایسے قلمی نسخوں کا ذکر بھی ہے جن کے شاعروں کے نام اور تخلص مخفی تھے۔ بعض شعرا کے نام تو تذکروں میں تھے لیکن ان کے مجموعے نا معلوم تھے۔ ڈاکٹر زورؔ نے ان شعراء کے حالات اور مجموعوں کا تعارف و تبصرہ قلم بند کیا ہے۔ اس جلد میں اردو نثر کی بعض ایسی کتابوں کے مخطوطات کا تعارف بھی ہے جو اردو نثر کی تاریخ میں اضافہ کا باعث ہوئیں اور بعض ایسے مخطوطات کا ذکر بھی ہے جن کے نسخے صرف یوروپ کے کتب خانوں میں ملتے ہیں۔

تذکرہ مخطوطات جلد چہارم تذکرہ مخطوطات کی چوتھی جلد ۱۹۵۸ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اس میں ادارہ ادبیات اردو کے دو سو مخطوطات کا تذکرہ ہے۔ اس میں چاروں جلدوں میں مشمولہ مخطوطات کی اجمالی فہرست بھی دی گئی ہے علاوہ ازیں مخطوطات کے معطیین کی فہرست، مخطوطات کی موضوع واری فہرست اور آخر میں اشاریہ بھی شامل ہے۔

تذکرہ مخطوطات جلد پنجم تذکرہ مخطوطات کی پانچویں جلد ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں دو سو پچاس مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ جلد چہارم کی طرح اس میں بھی ذیل کی فہرستیں شامل ہیں۔

(۱) مخطوطات کے عطیہ دہندگان کی فہرست (۲) پانچوں جلدوں میں مذکورہ مخطوطات کی اجمالی فہرست (۳) پانچویں جلد میں مشمولہ مخطوطات کی موضوع واری فہرست (۴) اشاریہ۔

تذکرہ نوادر ایوانِ اردو دو سو بیس (۲۲۰) صفحات پر مشتمل ڈاکٹر زور کی یہ تصنیف ادارہ ادبیات اردو کے نوادرات کا باتصویر تذکرہ ہے جو ۱۹۶۰ء میں شایع ہوا۔ اس میں انھوں نے ادارہ میں مخزونہ تاریخی و تہذیبی آثار و نوادرات کا تعارف کرایا ہے اور ان کے بارے میں ٹھوس معلومات فراہم کی ہیں۔

فرخندہ بنیاد حیدر آباد ڈاکٹر زور کی تصنیف "فرخندہ بنیاد حیدر آباد" ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ بھی دکنیات کے فروغ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں شہر حیدر آباد کی تعمیر، قطب شاہی و آصفیہ عہد کی عمارات، محلوں، باغات اور نہروں کا حال بیان کیا ہے۔ دوسرے حصے میں ڈاکٹر زور کے نیم تاریخی افسانے ہیں جو قبل ازیں دو مجموعوں "سیر گولکنڈہ" اور "گولکنڈہ کے ہیرے" کی شکل میں شایع ہو چکے تھے۔

"فرخندہ بنیاد حیدر آباد" اس شہر کی تاریخ و تہذیب کا پس منظر اور یہاں کے تمدنی جلوؤں کی دلکش تصویر پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے حیدر آباد کے قدیم کلچر اور ماضی کے نقوش و ارتسامات کو اس کتاب کے دامن میں سمیٹ کر اس شاندار ورثے کو نہ صرف دستبرد زمانہ سے محفوظ کر دیا ہے بلکہ اس عظیم اور قابل فخر میراث کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی سعی بلیغ بھی کی ہے۔ اس میں جو افسانے شامل ہیں ان کی نوعیت نیم تاریخی اور نیم افسانوی ہے۔ ڈاکٹر زور نے ان افسانوں کا مواد دکن کی قدیم تواریخ، غیر ملکی سفیروں کے سفر ناموں اور مقامی روایات سے اخذ کیا ہے۔

"سیر گولکنڈہ" کے دیباچے میں ڈاکٹر زور ان افسانوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "اس مجموعے میں گولکنڈے کی عظمت کو وہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر ایک حد تک بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس سرزمین کے قطب شاہی حکمرانوں کی ان لازوال خدمات کی جھلکیں دکھائی گئی ہیں جن کی وجہ سے اس ملک کی تاریخی، ادبی، تمدنی، معاشرتی اور عمرانی نقطۂ نظر سے دنیا کی بہتر سے بہتر اور ترقی یافتہ ممالک کی تاریخوں کے پہلو بہ پہلو رکھی جا سکے ۵"۔

"گولکنڈہ کے ہیرے" میں مشمولہ افسانوں کے بارے میں مولوی عبدالحق کی رائے یہ ہے:

> "اس میں تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی تاریخوں سے وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو اس چھوٹی سی کتاب میں ہیں ۶"۔

ڈاکٹر زور نے گولکنڈے کی تاریخ کے پس منظر میں جو افسانے لکھے ان کا مقصد یہ تھا کہ دکنی ادب اور تہذیب اور قطب شاہی سلاطین کی عظمت رفتہ اور ان کے علمی و تہذیبی کارناموں سے نئی نسل کو متعارف کروایا جائے۔

مثنوی طالب و موہنی یہ مثنوی سید محمد والہؔ موسوی کی تصنیف ہے۔ اس کے صرف دو نسخے موجود ہیں جن میں ایک ادارۂ ادبیات اردو میں ہے اور دوسرا انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے ادارے کے نسخے کی مدد سے اس مثنوی کو مرتب کیا اور ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ ۱۹۵۷ء میں اسے شائع کیا۔ مقدمے میں انھوں نے والہؔ کے خاندانی حالات اور علمی خدمات کے بارے میں تحقیقی معلومات قلمبند کی ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ کی یہ کاوش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کے تحت وہ قدیم دکنی شہ پاروں کو طاقِ نسیان سے نکال کر بزمِ اردو کی شمع بنانا چاہتے تھے۔

معانی سخن یہ محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کا انتخاب ہے جو ۱۹۵۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس میں ڈاکٹر زورؔ نے قلی قطب شاہ کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے جو ہر اعتبار سے قلی قطب شاہ کی شاعری اور شخصیت کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ محمد قلی چوں کہ دکنی ادب کا نمائندہ شاعر ہے اس لیے اس کا کلام دکنی زبان و ادب کا نمائندہ و ترجمان ہے۔ اس انتخاب کی اشاعت کا مقصد اور ڈاکٹر زورؔ کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ جو لوگ محمد قلی کا ضخیم کلیات نہ پڑھ سکتے ہوں وہ کم از کم اس کے انتخاب سے دکنی شاعری کے معیار و مزاج سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

نذرِ محمد قلی قطب شاہ اس کتاب میں جو ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی ڈاکٹر زورؔ نے سلطان محمد قلی قطب کی سیرت و شخصیت، حالاتِ زندگی، اس کے عہدِ حکومت کے واقعات اور اس کی ادبی اور تہذیبی خدمات کے بارے میں مختلف اہلِ قلم کے مضامین یکجا کیے ہیں جن سے گولکنڈے کی تاریخ و تہذیب کی عکاسی ہوتی ہے۔

ان مستقل تصانیف کے علاوہ دکنیات سے متعلق ڈاکٹر زورؔ نے پچاس سے زائد مضامین و مقالات سپردِ قلم کیے جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ ان میں دکنی ادب اور تہذیب کے مختلف گوشوں پر روشنی تحقیق ڈالی گئی ہے۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ان مضامین کی تفصیلات بیان کی جاسکیں۔

<u>مصادر:</u>

(۱) گوپی چند نارنگ: گئے برفت..... مشمولہ ادبی تحریریں، حیدرآباد ۱۹۶۳ء، ص ۳۵

(۲) پروفیسر عبدالمجید صدیقی: تاریخ دکن میں ڈاکٹر زورؔ کا حصہ، مشمولہ سب رس، زور نمبر ۱۹۶۲ء، ص ۱۶۴

(۳) محمد نصیر الدین ہاشمی: میرے عزیز دوست ڈاکٹر زور مرحوم، مشمولہ سب رس زور نمبر ص ۱۶۶

(۴) ڈاکٹر زورؔ: دکنی ادب کی تاریخ لکھنؤ ۱۹۸۳ء، مقدمہ ص ۲

(۵) ڈاکٹر زورؔ: سیر گولکنڈہ، حیدرآباد ۱۹۲۹ء، دیباچہ ص ۷

(۶) ڈاکٹر سیدہ جعفر: ڈاکٹر زورؔ، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۷-۱۲۶

Deptt. of Urdu

Hydrabad University, Hydrabad.

ڈاکٹر سید حسن عباس

شاد عظیم آبادی کی مرثیہ نگاری

"سید علی محمد نام، تخلص شاد، مخاطب بہ خان بہادر۔ نوزدہم (۱۹) محرم ۱۲۶۲ھ مطابق جنوری ۱۸۴۶ء کو شہر عظیم آباد پٹنہ محلہ پورب دروازہ اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے"(۱)۔ سید صاحب کے والد ماجد سید عباس مرزا، نیک نہاد، متقی و خلیق رئیس تھے۔ انہوں نے چھپن برس کی عمر میں رحلت کی۔ ۱۲۹۰ھ سال وفات ہے"(۲)۔

شاد عظیم آبادی نے اپنے وقت کے متبحر علماء سے عربی و فارسی، انگریزی اور طب و فنون ادبیہ کی تعلیم حاصل کی۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا اور بچپن کے اقتضوں کے تحت کچھ اشعار موزوں کر لیا کرتے تھے۔ شاد نے بچپن کی شاعری کے کئی واقعات اپنی کہانی میں درج کئے ہیں (۳)۔ اصلاح سخن کے سلسلے میں سید شاہ الفت حسین فریاد کی طرف رجوع کیا بعد ازاں صفیر بلگرامی سے سلسلۂ شاگردی جوڑا مگر بعد میں صفیر کی شاگردی سے انکار کر دیا۔ شاد و صفیر کی شاگردی و استادی کے جھگڑے نے کافی طول پکڑا (۴)۔ شاد کی شہرت ایک صاحب طرز غزل گو کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ وہ کثیر التصانیف تھے۔ مختلف موضوعات میں ان کی تحریریں یادگار ہیں۔ اساتذۂ فن نے ان کی قادر الکلامی، مشاقی، مہارت اور علمی صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ خود شاد اپنی ایک رباعی میں اپنی کثیر تصانیف کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

کافی ہے ریاض میں جوانی میں نے   تا عمر بہت کہی کہانی میں نے
ناقدر زمانے تری پروا ہے کسے   افراط سے چھوڑی ہے نشانی میں نے (۵)

مرثیہ گوئی میں بھی شاد نے اپنی انفرادیت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اس فن میں انھیں مرزا دبیر جیسے استاد کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا جس کا اعتراف نہایت عقیدت کے ساتھ کیا ہے:

مرا کو در مراثی او ستاد است   دبیر نکتہ رس قدسی نہاد است
یکتائے زماں تھے مرے استاد دبیر   کرتا ہوں دل و جان سے ان کی توقیر

شاد نے انیس و دبیر کی صحبتوں اور مجلسوں کو دیکھا تھا اور ان سے اکتساب فیض بھی کیا تھا۔ وہ ان صحبتوں کو

۱۔ شاد کی کہانی ص ۱۲   ۲۔ ایضاً ص ۲۰   ۳۔ ایضاً ص ۲۹-۲۸
۴۔ اس قضیئے کی تفصیل ملاحظہ کریں: ظفر اوگانوی۔ صفیر بلگرامی، حیات و کارنامے   ۵۔ شاد کی کہانی ص ۱۰۳

جنت کے مشابہ سمجھتے تھے۔ایک رباعی میں کہتے ہیں :-

اے شاؔد دبیؔر کی بھی خدمت میں رہا موجود انیسؔ کی بھی صحبت میں رہا
حاضر رہا جتنی دیر دونوں کے حضور واللہ اتنی دیر جنت میں رہا

شاؔد کی مرثیہ گوئی کا آغاز ۱۲۷۸ھ میں ہوا۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

۱۲۷۸ھ کے محرم میں مرزادبیر و میر انیس اس شہر (عظیم آباد) میں وارد ہوئے۔ چوں کہ مرزا صاحب سے اور اس خاندان سے بذریعہ مراسلات پہلے سے رسم تھی۔ مرزا صاحب کے روزورود کے دوسرے ہی دن بہ شوق تمام اپنے عم بزرگوار کے ہمراہ سید صاحب (شاد) بھی ملاقات کو گئے۔ مرزا صاحب بڑے تپاک اور حسن خلق سے پیش آئے۔ سید صاحب (شاد) سے ان کے اشغال کو پوچھا۔جب معلوم ہوا کہ علمی اشغال کے ساتھ شعر گوئی کا بھی مشغلہ ہے تو بطور بزرگانہ نصیحت کے فرمایا کہ آپ مرثیہ کہیئے تو بہتر ہے۔ سید صاحب (شاد) نے بھی گھر آکر بیس پچیس بند مرثیہ کی تمہید کے نظم کر کے اپنے عم بزرگوار کو دکھائے۔وہ خوش ہو کر مرزا صاحب کے پاس لے گئے اور کہا کہ اس پر آپ اصلاح کر دیجئے۔ مرزا صاحب نے بند پڑھوا کر سنے، تعریف کی اور کہا کہ میں انشاء اللہ لکھنؤ سے اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔بہ سبب عدیم الفرصتی کے دو سال کے بعد مرزا صاحب نے اصلاح دے کر وہ بند بھیج دیئے۔(۱)

طلسم کدۂ دنیا، کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

"خدا مدارج عالی کرے میر انیس مغفور کی اُن متعدد مجالس اور شرف صحبت کے سبب اس زمانے میں اس فقیر کو بھی ولولہ اور شوق مرثیہ گوئی کا بے حد و حساب پیدا ہوا"۔(۲)

'مکتوبات' میں ایک مقام پر لکھتے ہیں :

"ایک عمدہ خبر یہ ہے کہ اس دفعہ ایک سال سے میں نے مرثیہ کہنا شروع کیا ہے ......اب تک پندرہ سولہ مرثیے کہہ چکا ہوں"۔(۳)

مکتوبات میں ہی ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

۱- شاد کی کہانی ص ۱۰۰ ۲- طلسم کدۂ دنیا ص ۱
۳- مکتوبات شاد (بنام ہمایوں مرزا) خط مورخہ ۵ر اکتوبر ۱۸۹۶ء، ص ۲۰

"......جب میں کلیات مرتب کرنے لگا تب یہ خیال پیدا ہوا کہ تمنا و تبرک کا ایک مسدس بطور مرثیہ کہہ کر داخل کر دوں۔ یہی آغاز میری مرثیہ گوئی کا ہے۔" (۱)

شاد عظیم آبادی کے مرثیوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں کہ انہوں نے کتنے مرثیے کہے۔ اس سلسلے میں ان کے بیانات میں تناقض کا پہلو نمایاں ہے۔ شاد کی کہانی میں کہتے ہیں کہ ۴۸ مرثیے کہے (۲)۔ مکتوبات میں کئی جگہوں پر مختلف تعداد لکھی (۳) ہے اور ثابت لکھنوی نے دربار حسین میں لکھا ہے کہ شاد نے سو مرثیے کہے۔

شاد کے دستیاب مراثی میں نقی احمد ارشاد کے ذریعے ۱۹۵۱ء و ۱۹۵۴ء میں شائع کردہ دو جلدیں ہیں جن میں پانچ پانچ مرثیے شامل تھے۔ اس کے علاوہ ۱۹۹۰ء میں بہار اردو اکادمی پٹنہ کے زیر اہتمام اور سید نقی احمد ارشاد کے مرتب کردہ مراثی شاد کی ایک جلد شائع ہوئی جس میں ۲۱ مرثیے ہیں۔ ان کے علاوہ بقول شاد: سنگی والان والوں نے بھی ان کا ایک مرثیہ چھپوایا تھا (۴)۔ لیکن وہ کون سا مرثیہ تھا اسکی صراحت انہوں نے نہیں کی۔ مراثی شاد جلد اول و دوم مرتبہ سید نقی احمد ارشاد میں درج ذیل مراثی شامل تھے۔

جلد اول —	۱- اے دست فکر کھول مرقع خیال کا	در حال امام حسین (ع)
	۲- اے طبع خسروان سخن سے خراج لے	حضرت عباس کے حال میں
	۳- جب ہو چکا مسافر شب کا سفر تمام	حضرت علی اکبر کے حال میں
	۴- جب چرخ پر جنود سحر کا علم کھلا	حضرت عون و محمد کے حال میں
	۵- دوستی کیا ہے عجب نعمت ربانی ہے	در حال حبیب ابن مظاھر
جلد دوم —	۱- مہماں سرائے عشق میں اے دوست کیا نہیں	امام حسین کے حال میں
	۲- کیہاں خدیو و ماسن صبر و رضا حسین	امام حسین کے حال میں
	۳- صورت گر لیلائے سخن ہے قلم اپنا	امام حسین کے حال میں
	۴- اٹھا جو حجاب انجمن آرائے سحر کا	امام حسین کے حال میں
	۵- یارب سخن کو عزت حسن قبول دے	امام حسین کے حال میں

۱- مکتوبات شاد ص ۲۵ (خط مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۱ء)

۲- شاد کی کہانی ص ۱۰۰

۳- ہمایوں مرزا کے نام خط مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۸۹۶ء میں لکھتے ہیں: اب تک پندرہ سولہ مرثیے کہہ چکا ہوں۔ خط مورخہ ر نومبر ۱۹۰۲ء میں لکھا ہے کہ اب تک پچاس مرثیوں سے زیادہ نظم کر چکا ہوں۔ (مکتوبات ص ۴۱) ایک خط مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۱ء کا ہے جس میں لکھا ہے کہ مولود و مرثیے قریب ساٹھ کے ہیں اور کوئی مسدس ۲۵۰ بند سے کم نہیں ہے (مکتوبات ص ۲۹)۔

۴- مکتوبات شاد ص ۸۰

جلد شائع ہوئی اس میں شاد کے درج ذیل مراثی شامل ہیں۔

۱- مسدس در احوال امیر المومنین علی ابن ابی طالب (ع) "مسند نشین بزم حقیقت علی علی"	۱۱۲ بند	
۲- مرثیہ طلسم کدۂ دنیا- حیرت افزائے خیالات بشر دنیا ہے	۱۷۱ بند	در حال حضرت عباس
۳- دوستی بھی عجب اک نعمت ربانی ہے	۱۵۲ بند	احوال حبیب ابن مظاہر
۴- کس چشم کو شوق رخ زیبائے سخن ہے	۱۷۲ بند	احوال امام حسین
۵- یارب مجھے گفتار غم اندوز عطا کر	۱۸۹ بند	احوال علی اکبر
۶- اٹھا جو حجاب انجمن آرائے سحر کا	۸۷ بند	احوال امام حسین
۷- شکر خدا کہ سالک راہ کمال ہوں	۱۵۳ بند	احوال حضرت عباس
۸- واحسرتا کہ وقت سا مونس نکل گیا	۱۷۴ بند	احوال امام حسین
۹- مہماں سرائے عشق میں اے دوست کیا نہیں	۱۴۶ بند	احوال امام حسین
۱۰- ضرورت گر لیلائے سخن ہے قلم اپنا	۱۰۴ بند	احوال امام حسین
۱۱- اے دست فکر کھول مرقع خیال کا (مناظرۂ عقل و عشق)	۱۴۶ بند	احوال امام حسین
۱۲- گیہاں خدیو و امن صبر و رضا حسین	۱۴۵ بند	احوال امام حسین
۱۳- اے طبع خسروان سخن سے خراج لے	۱۴۵ بند	احوال حضرت عباس
۱۴- جب ہو چکا مسافر شب کا سفر تمام	۱۵۱ بند	احوال علی اکبر
۱۵- جب چرخ پر جنود سحر کا علم کھلا	۱۲۷ بند	احوال عون و محمد
۱۶- یارب سخن کو عزت حسن قبول دے	۱۴۶ بند	احوال امام حسین
۱۷- بچوں کو لیے سامنے تھی زوجۂ عباس	۱۳ بند	رخصت حضرت عباس
۱۸- حلیۃ النور- مناقب در مدح امیر المومنین علی مرتضیٰ (ع) - غریق بحر ماوحی امیر المومنین حیدر	۵۷ بند	
۱۹- ید بیضا- مناقب در مدح امام حسین (ع) - اے شریک سر ماوحی حسین	۵۴ بند	
۲۰- اے ذہن رسا غازۂ رخسار سخن بن	۱۳۶ بند	احوال حضرت علی اکبر
۲۱- آئینۂ انوار جناں ہے قلم اپنا	۸۹ بند	احوال امام حسین

شاد کے مذکورہ مراثی کے علاوہ بقول نقی احمد ارشاد "پانچ چھ مرثیے تھے جو تلف ہوگئے" (۱)۔ جن میں ...... دُربار ہے نیساں کی طرح پھر قلم اپنا — ایک مرثیہ در احوال حضرت عباس جس کے چند بند شاد کی کہانی میں شامل ہیں۔ مذکورہ مرثیوں میں چار مرثیے غیر مطبوعہ تھے جو پہلی بار مراثی شاد میں شامل کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱- مسند نشین بزم حقیقت علی علی (مناقب)

۲- واحسرتا کہ وقت سا مونس نکل گیا

۳- کس چشم کو شوق رخ زیبائے سخن ہے

۴- یارب مجھ گفتار غم اندوز عطا کر

علاوہ ازایں طلسم کدۂ دنیا کا نصف حصہ غیر مطبوعہ تھا۔ شاد کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ جناب مشفق خواجہ نے سہ ماہی اردو (کراچی) جنوری-اپریل ۱۹۶۶ء میں شائع کرایا تھا جس پر صفیر بلگرامی اور مرزا دبیر کی اصلاحیں تھیں۔ اس مرثیے کی اشاعت کے بعد کافی لے دے مچی۔ حال ہی میں کراچی سے جدید مرثیے کے ایک اہم شاعر اور ناقد ڈاکٹر ہلال نقوی نے سہ ماہی رثائی ادب کے اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۸ء کے شمارے میں شاد عظیم آبادی کا مرثیہ — صورت گر لیلائے سخن ہے قلم اپنا — شائع کیا ہے۔ رثائی ادب میں اس مرثیے کے ۹۸ بند شائع ہوئے ہیں جب کہ مراثی شاد مطبوعہ ۱۹۹۰ء میں اس مرثیے کے ۱۰۴ بند چھپے ہیں واضح رہے کہ شاد کی کہانی اور مکتوبات میں شاد نے اپنی مرثیہ گوئی پر تفصیل سے لکھا ہے اور متعدد مرثیوں سے کثیر تعداد میں نمونے پیش کیے ہیں۔ جن کے مطالعے سے ان کے نظریات کھل کر سامنے آتے ہیں۔

شاد عظیم آبادی مرثیہ کو ایک مشکل فن سمجھتے تھے اور یہ ایک مشکل فن ہے بھی۔ کہتے ہیں:

مشکل ہے سب سے مرثیہ گوئی ہے جس کا نام — آساں سمجھ لیا ہے زمانے نے اب یہ کام
مذہب کی یہ بھی صنف میں داخل ہے لاکلام — لازم یہ ہے کہ دل سے کرے اس کا احترام

مدِ نگاہ درد و غم جاں گزا رہے
گلدستۂ سخن نہ بنے، مرثیا رہے

شاعری میں موضوع اور فکر و خیال کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاد نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ان میں جدت بیان اور ندرت معانی کے گوہر بھر دیے۔

مرثیہ نگاری میں شاد، مرزا دبیر کے شاگرد ہونے کے باوجود میر انیس کی سلاست زبان کے دلدادہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دونوں باکمالوں سے اکتساب کرنے کے بعد اپنی الگ راہ بنائی۔ ان کے یہاں دہلی اور لکھنؤ کی

۱- مراثی شاد، مطبوعہ ۱۹۹۰ء ص ۱۳

زبانوں کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ انھیں جدید مرثیے کا امام کہا جا سکتا ہے کہ پہلے پہل شاد کے مراثی میں ہی جدید فکر و خیال کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ شاد نے مرثیہ گوئی کے روایتی انداز سے دامن بچاتے ہوئے اسے صرف رونے رلانے یا ثواب دارین حاصل کرنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے معاشرے کی اصلاح اور تطہیر نفس کے لیے استعمال کرنے کی طرف توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مراثی میں فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ شاد لکھتے ہیں:

"......انداز بیان میں تو میر انیس کے احاطہ اور طرز ادا کو اختیار کیا مگر اس بات کا التزام کیا کہ روایات صحیحہ و فلسفۂ اخلاق سے کلام تجاوز نہ کرنے پائے بلکہ اکثر علمی اور فلسفیانہ باتوں کو مرثیوں میں اس طریق سے داخل کرنا شروع کیا کہ پرانی روش کے پسند کرنے والوں کو اجنبی نہ معلوم ہو۔ صبح کی کیفیت، رات کا سماں، گرمی کی شدت، صف جنگ کی حالت، گھوڑے کی توصیف، تلوار کی مدح وغیرہ وغیرہ جتنی باتیں اب مرثیہ کے لوازم میں سمجھی گئی ہیں، سب کو نظم کیا اور افراط سے نظم کیا"۔ (۱)

مکتوبات میں رقم طراز ہیں:

"میرے مرثیوں میں خلاف واقعہ و خلاف صبر اہل بیت و خلاف تاریخ و خلاف فطرت کوئی مضمون نہیں ہوتا۔ باوجود اس کے رقت خیز و اثر انگیز ہیں۔ اسی لیے ہر مذہب والے پر پورا پورا اثر ہے"۔ (۲)

شاد نے نہ صرف یہ کہ مرثیے میں جدت طرازی سے کام لیا ہے بلکہ مرثیہ کے روایتی انداز پر سخت تنقیدیں بھی کی ہیں۔ ان کے خیال میں مرثیہ کو واقعیت کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ مبالغہ اگرچہ کلام کا زیور ہے تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ مضمون خبط ہو جائے یا حقیقت مسخ ہو کر رہ جائے۔ شاد نے فکر بلیغ، شاد کی کہانی اور مکتوبات میں واضح الفاظ میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنے مرثیوں کے چہروں میں بھی جہاں کہیں موقع ملا، اس امر کی وضاحت کی ہے۔

اے خضر شوق راہ حقیقت بتا مجھے ۔۔۔ منزل پہ جو پہنچ گئے ان سے ملا مجھے
جی جاؤں جس کی بو سے وہ ساغر پلا مجھے ۔۔۔ جویا ہے جس کی روح وہ عالم دکھا مجھے
آئینۂ مرقع صدق و صفا کہیں
وہ مرثیہ سنا جسے سب مرثیا کہیں

۱۔ شاد کی کہانی ص ۱۵۸ ۲۔ مکتوبات شاد ص ۱۵-۲۹

باتیں ہوں اسطرح کی تجھے اے زباں پسند — سن کر جنھیں کریں حکمائے زماں پسند
برسوں سنا کئے ہیں جسے وہ کہاں پسند — اب اہل بزم کو ہے نئی داستاں پسند
ذوق سخن میں ذائقہ طبع کھو نہ جائے
اتنا نمک رہے کہ مزہ تلخ ہو نہ جائے

یہ بھی تو کچھ سمجھ کہ بلاغت ہے کس کا نام — جانے نہ پائے ہاتھ سے اصلیت کلام
آساں نہیں ہے لفظ و معانی کا انتظام — نظروں میں ہوں تلے ہوئے سب موقع و مقام
تصنیف شعر کے لیے لازم شعور ہے
تقلید بے محل سے کنارا ضرور ہے

داخل مبالغہ بھی محاسن میں ہے مگر — اتنا نہ ہو کہ نفس مطالب کا ہو ضرر
باتیں وہ ہوں پسند کریں جن کو ذی ہنر — آنکھوں کے آگے عین صداقت ہو جلوہ گر
اظہار مدعا میں کسی جا خلل نہ ہو
مطلب وہ کیا کہ جس کا کوئی ماحصل نہ ہو

مضموں نہ ہوں رکیک نہ الفاظ ہوں دقیق — تا ہو نہ جائے سنتے ہی سنتے دلوں کو ضیق
اعلیٰ ہو فکر شعر، خیالات ہوں عمیق — لفظیں ہوں پُر اثر کہ دلوں کو کریں رقیق
مضموں وہ چست ہو کہ مزہ صبح و شام دے
خلوت میں اک لئیق مصاحب کا کام دے

ہے جن امور کا فن اخلاق میں جواز — ہے مرثیوں میں ان صفتوں کا فقط مجاز
لازم ہے عامیانہ مضامیں سے احتراز — سننے کے ساتھ تا کہ ہو سامع کے دل گداز
افسانۂ مصائب شاہ زماں ہے یہ
اشعار ہے لحاظ کہ کس کا بیاں ہے یہ

اس طرح سے ہو حال شہ کربلا رقم — ماخوذ ہو صحیح روایت سے یک قلم
رکھے بہت سنبھال کے اس راہ میں قدم — عاقل پل صراط سے سمجھے اسے نہ کم
تابع رہے خیال عقیدت نیوش کے
آئے فریب میں نہ طبیعت کے جوش کے

مضموں نہ آئیں وہ جو ہیں اخلاق سے بعید — ہر طرح جن کی منع میں تاکید ہے شدید

یہ شاعری خزینۂ باطن کی ہے کلید　　لازم ہیں اس کی حفظ میں بھی کوششیں مزید

حقا یہ کام اہل ریاضت کا کام ہے

نا اہل کو تو ہاتھ لگانا حرام ہے

میرے خیال میں ان بندوں کو جدید مرثیہ گوئی کے مینی فیسٹو سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جن کے مطالعے سے صاف واضح ہے کہ شاد مرثیہ میں کس قسم کی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ وہ مرثیوں میں حقیقت نگاری دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مرثیوں میں ان تبدیلیوں کو عملی جامہ پہنا کر انقلاب کے نقیب بنے۔ ایک اور مرثیے میں اس طرح کہتے ہیں:

لب پر وہی آئیں جو مسائل ہوں محقق　　تا اس میں پس و پیش نہ ہو عقل کو مطلق

سنتے ہی مشکک بھی سمجھ لے جسے برحق　　اس طرح کی تقریر سے مذہب کی ہے رونق

ہر حرف پسندیدۂ ارباب ہنر ہو

جس طبقے کا ذی فہم سنے اُس پہ اثر ہو

ایک اور مرثیے میں اس طرح گویا ہوتے ہیں:

ہو جس میں ابتذال وہ مضموں نہ باندھنا　　ہو پست و پائمال وہ مضموں نہ باندھنا

عقلاً ہو جو محال وہ مضموں نہ باندھنا　　ہو جس میں قیل و قال وہ مضموں نہ باندھنا

باتیں وہ کیا کہ جان سخن جن میں کچھ نہ ہو

مضموں کی صرف ڈھانچ ہو باطن میں کچھ نہ ہو

چپ بیٹھنا ترے لئے اس بزم میں ہے ننگ　　پیری سے ڈر نہ شاد اٹھا پاؤں بے درنگ

ہشیار! مرثیوں میں نہ جھلکے غزل کا رنگ　　غزلوں میں مرثیوں کے نہ پیدا ہوں رنگ ڈھنگ

سالک کے خضر راہ گر اخلاق نیک ہیں

غزلیں ہوں مرثیے ہوں بباطن سب ایک ہیں

موزوں غزل کے واسطے حسن ازل کا ناز　　اور مرثیوں میں ذکر شہیدان پاکباز

زیبا غزل میں شکوۂ ناز از رہ نیاز　　اور مرثیوں میں ماتم عشاق سرفراز

نیت اگر درست ہے حسن مقال میں

یوں نظم ہوں تو ایک ہیں دونوں مآل میں

شاد زبان پر خصوصی توجہ کے قائل ہیں کہ تشبیہات و استعارات اور دیگر صنائع لفظی و معنوی کا استعمال کچھ اس طور ہو کہ مطلب خبط نہ ہونے پائے اور صنائع کا استعمال چیستاں نہ بن جائے۔ حفظ مراتب کا بھی پورا خیال رکھا جائے۔

الفاظ چست و درست ہوں۔

تشبیہ و استعارہ و ذکر مناسبات　　ایہام معنوی و مجاز و مبالغات
ایضاح ظاہرات و خفائے مقدرات　　ان سب کے ساتھ نظم میں آجائیں سب نکات
لفظیں سلیس و چست حکیمانہ بات ہو
اردو رہے نہ یہ کہ غیاث اللغات ہو

میر انیس مرحوم نے بھی ایک مرثیے میں اسی قسم کے نکات بیان کیے ہیں:

روزمرہ شرفا کا ہو، سلاست ہو وہی　　لب و لہجہ وہی سارا ہو، متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے، صنعت ہو وہی　　یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں، مضمون بھی عالی ہوئے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہوئے

بزم کا رنگ جدا، رزم کا میداں ہے جدا　　یہ چمن اور ہے، زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامے کا عنواں ہے جدا　　مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقت بھی ہو، تعریف بھی ہو

شاد نے انیس و دبیر سے اکتسابات تو کیے تھے مگر اپنی خداداد صلاحیت اور ذہانت سے مرثیہ کو ایک نئی راہ دکھائی۔ انہوں نے "صنف مرثیہ میں ایک حکیمانہ اور عارفانہ رنگ بھرا، امتحان گاہ کربلا کی روحانی عظمت عزاداران امام حسین کے ذہن نشین کرائی اور خانوادۂ رسالت کے کردار میں صبر و استقامت کی جگہ ان کے منفعلانہ شیون و شین کے تذکرے سے جو اخلاقی اعتراضات مرثیہ نگاری پر وارد ہوئے، ان کی تلافی کر دی۔ شاد اگر یہ مصلحانہ روش اختیار نہ کرتے تو اس میں وہ ارتقائی دور نہ آتا جس سے جوش ملیح آبادی اور آل رضا وغیرہ جیسے فنکار پیدا ہو گئے"۔(۱)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے شاد کی مجددانہ کاوشوں کے ذکر میں لکھا ہے کہ "وہ روایات صحیح اور تحقیق شدہ مسائل کی اہمیت پر زور دیتے ہیں"۔(۲)

یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مقام تک پہنچنے کے لئے شاد کو بڑی ریاضتیں کرنا پڑیں۔ بیس برس تک دس دس بیس بیس بند کہہ کہہ کر پھاڑتے رہے تب کہیں جا کر ان کے حسب دلخواہ مرثیے تخلیق ہو سکے۔ ان کے مرثیوں میں

۱۔　زبان و ادب پٹنہ (شاد نمبر) مضمون از علامہ جمیل مظہری 'شاد کی استعاراتی شاعری' ۱۹۷۹ء۔
۲۔　بیسویں صدی اور جدید مرثیہ　ص ۱۴۴

روایات اصل کے مطابق ہیں اور ان میں جذب واثر بھی موجود ہے۔ یہ جذب واثر ان کی مخصوص زبان کی وجہ سے ہے جس کی تعریف مرزا دبیر جیسے استاد فن نے بھی کی ہے (۱)۔ جب ۱۸ ؍ برس کی عمر میں دس بارہ بند کا مرثیہ لکھ کر مرزا دبیر کی خدمت میں اصلاح کے لئے پیش کیا تو مرزا صاحب نے کمال تعجب سے فرمایا تھا کہ "پورب میں ایسی فصیح زبان نہایت محل تعجب ہے" (۲)۔ مرزا دبیر کے اس جملے سے شاد کی زبان دانی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر فصیح و بلیغ زبان کے استعمال پر قادر تھے۔ شاد نے صرف اپنی جدت طبع سے اس میدان میں نئی راہیں نکالی ہیں۔ ایک مرثیہ میں اپنی مرثیہ گوئی کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں ۔

کس چشم کو شوق رخ زیبائے سخن ہے | کس دل کو طلبگاری سلمائے سخن ہے
وہ کون ہے جو والہ و شیدائے سخن ہے | آئے اگر آشفتۂ لیلائے سخن ہے

موسیٰ کی طرح روشنیٔ طور کو دیکھے
طالب ہو بصیرت کا تو اس نور کو دیکھے

کیوں سب سے جداگانہ ہے انداز ہمارا | اس وقت تلک کیوں نہ کھلا راز ہمارا
قاصر ہے خود اور اک خدا ساز ہمارا | توڑا ہے اسی نے پرِ پرواز ہمارا

اپنے کو نہ جانا ہمیں مارا اسی غم نے
ہم کیا ہیں ابھی تک تو یہ جانا نہیں ہم نے

ہوں بلبل خوش لہجہ گلزار جناں میں | دھوئے ہوئے ہوں بادۂ کوثر سے زباں میں
پامال مضامین کہاں اور کہاں میں | آگاہ ہے اے عرش جہاں تو ہے وہاں میں

الہام الٰہی مری تقریر سمجھ لو
آیات و احادیث کی تفسیر سمجھ لو

ان بندوں کے مطالعے کے بعد عام ذہن اسے شاعرانہ تعلی پر محمول کر سکتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے جو شاد نے کہی ہے۔ ان کی زبان بادۂ کوثر سے دھلی معلوم دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں دور از کار باتوں سے اجتناب کیا ہے اور حقیقت بینی و حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ وہ چاہتے تو اپنی قوت متخیلہ سے آسمان کو زمین پر اور زمین کو آسمان پر لے جاتے۔ لیکن انہوں نے مرثیے کو مرثیہ ہی رہنے دیا اور چیستاں بننے نہیں دیا۔

واقعہ کربلا جیسا مہتم بالشان واقعہ اور شاد جیسے قادر الکلام شاعر کا اسلوب بیان، جب وہ واقعہ بیان کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ موضوع کے صادقانہ اور عقیدتمندانہ اظہار میں کسی شے کا اضافہ نہیں کرتے، غلط یا ضعیف روایات کو

۱۔ دربار حسین ص ۷۵ ۲۔ دربار حسین ص ۷۵

یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ غیر معتبر واقعات سے صرف نظر کرتے ہیں جو ماضی کے مرثیہ گویوں کے یہاں کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شاد پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان باتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا اور شعرا کی تساہلی پر انہیں ٹوکا اور مرثیہ گوئی کی اس روش پر کڑی تنقید یں کیں۔ یہ ان کے حقیقت پسند اور مجتہد ہونے کا بین ثبوت ہے۔

شاد کو معاشرتی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کا احساس تھا اور وہ اس کوشش میں تھے کہ مرثیے کے قالب میں فکری اجزا کی شمولیت کی جائے نیز اسے عامیانہ روش سے ہٹا کر صحت مند موڑ عطا کیا جائے۔ شاد نے مرثیوں میں حکمت و معرفت اور واقعیت کے عناصر کا اضافہ کیا۔ معتبر روایات کی پیشکش میں پیش قدم رہے اور اس فن کی تطہیر و تقدیس کے لئے عمر بھر کوشاں رہے۔ انہوں نے مرثیوں کے خالص لکھنوی انداز بیان سے نہ صرف روگردانی کی بلکہ اسے اپنی شدید تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔ شاد کو ''ہمیشہ تجدید و اصلاح کا خیال جدت طرازیوں کی طرف مائل رکھتا تھا۔ یوں تو میر انیس کے کمالات فن کے قائل تھے اور مرزا دبیر کی شاگردی پر افتخار کیا کرتے تھے۔ مونس کی زبان کے والہ و شیدا تھے۔ پیارے صاحب رشید اور دولھا صاحب عروج کے مزاج سخنوری پر تنقید کرنے کے باوجود ان کے انداز بیان کے مداح بھی تھے۔ شاد کو مبدء فیاض نے اجتہادی فکر و نظر بخشی تھی۔ شاد نے مرثیہ گوئی میں نئے زاویہ ہائے نظر پیدا کیئے''۔(۱)

شاد کے مرثیوں میں عرفانی شعور ان کے مراثی کا خاص وصف ہے کیونکہ اس پہلو پر کم ہی مرثیہ گو شعرا نے توجہ دی تھی جب کہ واقعات کربلا کے سیاسی شعور پر توجہ دی جانے لگی تھی جس کے نتیجے میں بعد میں اس موضوع پر معرکۃ الآرا مرثیے تخلیق کیئے جا سکے۔ عرفانی اور سیاسی شعور شاد کا عطیہ ہے جس نے جدید مرثیہ نگاروں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔

اردو مرثیہ میں منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے سلسلے میں انیس و دبیر کی کاوشیں نا قابل فراموش ہیں لیکن شاد نے اپنے پیش رووں اور معاصرین سے اس وادی میں الگ چلنا مناسب نہ سمجھا اور اجزائے مرثیہ — تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف، جنگ کا نقشہ، مناظر قدرت کی عکاسی، بہاریہ مناظر —— وغیرہ کے بیان میں عرفان ذات کو دخیل کیا۔ تلوار کی تعریف کا یہ عرفانی پہلو ملاحظہ ہو۔۔

تلوار تھی حسین سے اہل نیاز کی
پابندی تھی قیام کی، عادی نماز کی

''شاد کے مرثیوں میں گھوڑے کی تعریف اس انداز سے ہے کہ مبالغہ آمیزی اور تخیل کاری کے ساتھ فطری خاصیت کا پہلو بھی نمایاں ہے جو لکھنو کے مرثیہ نگاروں سے قدرے جداگانہ خصوصیت کا ہے''۔(۲)

۱۔ اردو مرثیے کا ارتقا انیس سے جوش تک: ثریا جمال مظہری ص ۳۹۲ (تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔لٹ، بہار یونیورسٹی مظفر پور)

۲۔ مرثیہ شناسی۔ سید علی حیدر، ص ۶۴

مرثیہ "حیرت افزائے خیالات بشر دنیا ہے" میں شاد نے مرثیے کی تمہید میں دیگر مذاہب کی کتابوں سے جہاں تک مذہب اسلام کی تطبیق ہوتی ہے اس کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ جس کے دوران مذہب، تصوف، فلسفہ اور عقل وغیرہ موضوعات پر بڑی دقیق بحث کی ہے۔

عقل کیا چیز ہے ایک جوہر نورانی ہے — ہم نے ہر چند اسے عقل سے پہچانی ہے

عقل سے کام نہ لے کوئی یہ نادانی ہے — یہ وہ جوہر ہے جو اس دہر میں لاثانی ہے

غور سے کام نکالے کہ بشر عاقل ہے

کوئی تکلیف نہیں اس پہ جو لایعقل ہے

اس کے بعد آٹھ دس بندوں میں شاد نے عقل، قدرت اور فطرت کا بیان کیا ہے۔ اور ہر چیز کو عقل وفطرت سے ملا کر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ خدا کے افعال کو بہ نظر غائر دیکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ جس سے پتا چل سکے کہ اُس نے بشر میں کون کون سی قوتیں ودیعت کی ہیں۔ پھر دین، انسانی فریضے، خواہشات نفسانی وروحانی غرض پورا مرثیہ درس حکمت و فلسفہ پر مشتمل ہے۔ جس کا مقصد کائنات کے سربستہ رازوں کی پردہ کشائی ہے۔ اس مرثیے میں صبح کا سماں، نماز کا فلسفہ اور رزمیہ بند قدیم مرثیوں کے طرز میں کہے گئے ہیں۔ شاد نے ساقی نامے بھی کہے اور شہادت وبین میں اپنی مرثیہ گوئی کے جوہر دکھلائے ہیں۔ شاد نے اپنے استاد مرزا دبیر کے طرز میں بھی مرثیہ کہا ہے۔ طرز دبیر میں کہا گیا مرثیہ:

شور وداع سید عالم حرم میں ہے

میں صلح امام حسن اور درمیان میں اخلاقی مضامین شاعرانہ بصیرت کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں۔

مرثیہ —

مہماں سرائے عشق میں اے دوست کیا نہیں

حضرت امام حسین کے حال میں ہے۔ مرثیے کے چہرے میں نادانی ودانائی اور دوستی ومحبت کا بیان ہے۔ چند بند میں حضرت امام حسین کی عظیم الشان شخصیت اور تاریخ ساز کردار پر روشنی ڈالنے کے بعد یزید کا سریر آرائے مملکت ہونا، کوفے سے امام علیہ السلام کی خدمت میں دس ہزار خطوط کا آنا، یزید کی طرف سے بیعت کا مطالبہ، امام حسین کا انکار اور پھر مدینہ سے روانگی، حج کو عمرے سے بدلنا، حقانیت کی سربلندی اور سرفرازی کے لئے اہل خاندان کے ساتھ دشت بلا میں آنا، فوج اشقیا کا ہجوم اور پھر وفا شعاروں کی شہادت کا ذکر بڑے موثر پیرائے میں کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسلام کی تعریف، بشریت کی وضاحت اور تقاضے، شرک مخفی وجلی کا تعارف وغیرہ اہم مگر ضمنی موضوعات پر مدلل بیان — مرثیہ کو کئی اعتبار سے اہم بنا دیتا ہے۔ مرثیے میں جگہ جگہ روایات واحادیث اور امام کے خطبے کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں۔ جس سے شاد کے وسیع المطالعہ ہونے کا بھی پتا چلتا ہے۔ یہ مرثیہ شاد کے دوسرے مرثیوں کی طرح بے

حد رواں ہے۔ زبان و بیان میں سادگی و صفائی اور دلکشی ہے کیوں کہ شاد کی زبان بھی اپنی ہے اور اس کا طریقہ استعمال بھی اپنا ہے۔ بقول اختر اورینوی :

"شاد کی زبان بہت رچی اور منجھی ہوئی ہے ان کے رچاؤ اور معنویت کے نکھار نے میں راسخ عظیم آبادی اور انیس لکھنوی کی روایت نے بڑا حصہ لیا ہے"۔ (۱)

مولانا سید سلیمان ندوی نے شاد کو لفظی اعتبار سے لکھنو کا اور معنوی حیثیت سے دہلی کا شاعر بتایا ہے اور ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں :

"ان کے کلام میں جہاں دہلی کے انداز خیال، معانی اور سنجیدگی و متانت پر زور ہے وہیں رعایات لفظی، صنائع و بدائع کی جھلک، محاورات کا شوق، زبان و الفاظ کی صحت لکھنو کا ترکہ ہے"۔ (۲)

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے شاد کی زبان اور موضوع کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے :

"شاد کے مراثی کی زبان بہت سلیس، شگفتہ اور پیاری ہے۔ شاد کے مراثی میں حکیمانہ اور فلسفیانہ مضامین بڑی کثرت سے ملتے ہیں جن سے ان مراثی میں ایک خاص انفرادیت پیدا ہو گئی ہے"۔ (۳)

سید سفارش حسین رضوی اپنی کتاب 'اردو مرثیہ' میں شاد اور کلام شاد پر مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سید سلیمان ندوی نے شاد کو اس دور کا میر کہا ہے مرثیہ گوئی میں انھیں اس دور کا انیس کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے مرثیے کے قالب میں نئی روح پھونکی، نیا انداز بیان عطا کیا، تفکر اور تصوف کی چاشنی ملائی اور اس طرح مرثیہ کے پیکر کو نکھارا اور اسے نئے انداز پر سنوارا۔ کلام میں فن کے حسن اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ بیان کی خوبی پر بھی ان کی نظر جمی رہی۔ انیس سال کے مسلسل ریاض نے شاد کو مرثیہ گوئی میں مجدد کے درجہ پر پہنچا دیا۔ میر انیس کے بعد اردو مرثیہ دم توڑنے لگا تھا شاد کی صورت میں مرثیے کو مسیحا مل گیا۔ ادب پر شاد کا یہ بڑا احسان ہے"۔ (۴)

شاد عظیم آبادی کے ایک ہندو شاگرد —— رائے بھوانی پرشاد آزاد (م۔ ۱۹۳۵ء) نے شاد کی تعریف میں ایک قطعہ

۱۔ سراج، منہاج ص ۷۹
۲۔ نگار لکھنو ستمبر ۱۹۴۳ء
۳۔ دبستان دبیر، ص ۲۲۸
۴۔ اردو مرثیہ، ص ۲۹۹

کہا ہے جس میں شاؔد کا ہر سال مرثیے میں نئے مضامین کی ایجاد کی طرف واضح اشارہ موجود ہے:

علی ہے نام اس کا اور محمد لوگ کہتے ہیں
تخلص شاؔد ہے جس کا وہ دل کو شاد کرتے ہیں
بتاؤ کیا لکھوں تعریف اے آزاؔد میں ان کی
مضامیں مرثیے کے ہر برس ایجاد کرتے ہیں (۱)

۱۔ بہار کی اردو شاعری میں شاؔد کے ہندو تلامذہ کا حصہ: رضی احمد، ص ۱۶۰ (تحقیقی مقالہ برائے پی-ایچ-ڈی بہار یونیورسٹی مظفرپور)۔

ڈاکٹر قطب الدین اشرف

مضامینِ اکبر الہ آبادی

لسانی و ادبی زاویے سے اکبر الہ آبادی کی نثری کاوشیں نوادرات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تحریریں برسوں پر محیط اپنے عہد کے اہم رُجحانات و میلانات کی گواہ ہیں۔ لکھنؤ سے "اودھ پنچ" کا اجرا اور اکبر کی نثر نویسی کا باضابطہ آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بھی اس خیال کے موئید ہیں۔ مگر ان کا یہ بیان کہ "اودھ پنچ کے اجراء سے قبل انہوں نے نثر نہیں لکھی تھی (۱)" تحقیق طلب ہے۔

"اودھ پنچ" عہد رفتہ میں ظرافت کا دبستان تھا۔ مسلک و مزاج کے اعتبار سے یہ اخبار حکومت برطانیہ کا حریف، کانگریس کی پالیسیوں کا ترجمان اور حرّیت وطن کی سالمیت کا علم بردار تھا۔ اس کے نورتنوں میں منشی سجاد حسین، نواب سید محمد آزاد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی شوق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، اکبر الہ آبادی وغیرہ کے اسماخصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ "اودھ پنچ" کے ان قلمی معاونین کے نثرپاروں کا ایک انتخاب پنڈت کشن پرشاد کول نے ۱۹۱۵ء میں "گلدستۂ پنچ" کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ البتہ اکبر کے نثری کارناموں کو کسی مجموعے کی شکل نہ دی جا سکی۔ "اودھ پنچ" کے رنگارنگ شماروں سے ان کے اکتالیس (۴۱) مضامین برآمد ہوئے جو پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (سیوان) میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اپنی کتاب "اکبر الہ آبادی" کے صفحہ ۴۱۵ پر ان کی چالیس تحریروں کا ذکر کیا نیز صفحہ ۴۶۱ اور صفحہ ۴۶۲ پر اُن کی انتالیس تحریروں کی فہرست دی ہے۔ ان میں "گانو کے قاضی"، "دہلی دربار"، "لالہ شتاب رائے کا خط"، "کلکتہ کی وجہ تسمیہ" وغیرہ اہم و منفرد مضامین غائب ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر کے مضامین کی تعداد کہیں زیادہ ہے اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی تحقیقی کاوشیں ابھی تشنہ ہیں۔

اکبر نے ان مضامین میں رعایت لفظی، لطیفہ گوئی، تمثیل نگاری، قافیہ پیمائی، واقعہ طرازی، مکالماتی انداز اور زبان و بیان کی شعبدہ بازی سے ظرافت کے چمن آباد کیے ہیں۔ ان کے موضوعات سنجیدہ ہیں مثلاً سیاستِ عصر، معاشرت مغربیت، معیشت و برطانوی جارحیت کے بین بین سرسید کے نظریات کی مخالفت وغیرہ۔ انداز بیان طنزیہ مگر لطیف ہے۔ اسلوب جدت و قدامت کے ساتھ ساتھ منفرد اس لئے ہے کہ اس میں تنقیدی بصیرت، عصری آگہی

۱۔ اکبر الہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مطبوعہ ۱۹۹۴ء، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ صفحہ ۴۱۵

اور ناوک طنز کو ہدف کے عین جگر میں اُتار دینے کا موثر پیرایہ کار فرما ہے۔

اکبر کی اکتالیس طویل و مختصر تحریروں سے بہ خوفِ طوالت پندرہ مضامین کے تعارف تک ہی خود کو محدود رکھوں گا، جو بہ اعتبار فن و معیار بلاشبہ نثر نگاری کی جملہ سمتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ایسے مضامین یہ ہیں :-

(۱) دہلی دربار (۲) گانو کے قاضی (۳) حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو (۴) انگریزوں کی زبان دانی (۵) کوئی کہتا ہے دیوانہ کوئی کہتا ہے سودائی (۶) لالہ شتاب رائے کا خط ان کے دوست کے نام (۷) کلکتہ کی وجہ تسمیہ (۸) مسلمانوں کی ترقی اور عالی ہمتی کا ثبوت (۹) تم بھی برطرف (۱۰) چھپارہے گانہ احوالِ آسماں زنہار (۱۱) خدا غارت کرے ان موذیوں کو (۱۲) فلسفیانہ اوہام (۱۳) مکرمی فتنہ انگیزی (۱۴) بجز اونٹ کے سب سواریاں موقوف (۱۵) پردۂ نسواں۔

(۱) دہلی دربار یہ مضمون نہایت مختصر ہے۔ اس میں مکالماتی و افسانوی انداز کار فرما ہے۔ اس کا موضوع سِول سروس کے امتحانوں سے مسلمانانِ ہند کی بے توجہی اور سراسیمگی کی طرف توجہ دلانا ہے۔ محاکاتی انداز کے سہارے مقصد کی پیش کش میں وہ کامیاب ہیں۔ زبان شگفتہ و شاداب ہے۔

(۲) گانو کے قاضی یہ اُس عہد کے دیہات کی رنگا رنگ جہالت، توہم پرستی، گانو کے رہبر کی بیمار ذہنیت و خود پرستی، گانو والوں کی عقیدت مندی اور اوہام پرستی کا انتہائی دلچسپ البم ہے۔ قصہ نگاری، جزئیات اور زبان و بیان کے اختلاط سے طنزیہ و مزاحیہ فضا پیدا ہوئی ہے۔ گانو کے قاضی کی نسبت فرماتے ہیں :-

> "اب ہم ایک آدمی کو ساتھ لے کر قاضی صاحب کے مکان پر پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اُلّو کا پٹھا چروا پگڑی باندھے ہوئے بیٹھا ہے۔ میں نے جاتے ہی سلام علیکم کہا۔ اُنھوں نے بالے کم سلام جواب دے کر کہا: بھیا بیٹھ جا، تو کہاں سے آیا؟ میں: دلّی سے آیا ہوں۔ کیا دلی میں بڑے اچھے آدمی ہیں؟ بادساہی سہر ہے، کیوں نہ ہو، پر تیر اگلام بھی سو سو کوس میں اکاہی ہے۔ میں نے کہا: بجا ہے۔ اتنی باتیں ہوئی تھیں کہ ایک شخص دوڑا ہوا آیا کاجی جی نتواں پٹھان کا اُونٹ مر گیا۔ حلال کردو۔ آپ نے کہا: گردن چھوڑ دیں اور اس کی ٹانگیں کاٹنی شروع کردیں۔ ایک بھلے مانش سے باتیں کرلوں تو آکر اس کی ناڑی کاٹ دوں۔ میں نے یہ باتیں سن کر کہا کہ یہ جونپور کے بھی پردادا نکلے"۔ (۲)

غرض یہ کہ طنز و شتم کے پیرایہ میں دیہات کے جاہلانہ نظامِ حیات کی بڑی دلچسپ اور انوکھی تصویر پیش کی

۲۔ "اودھ پنچ" جلد اول ۲۳ راپریل ۱۸۷۷ء، صفحہ ۷۵ - "انتخاب اودھ پنچ"

گئی ہے۔

(۳) حدیث از مطرب یہ مضمون سراسر تمثیلی ہے۔ اس میں زمانے کو ایک کوہ پیکر، فلک کا ہم عصر تغافل شعار شخص قرار دیا ہے۔ اور اس کی کروٹوں کو انقلاب دنیا سے تشبیہ دی ہے۔

> "جب وہ کروٹ بدلتا ہے تو آندھیاں آتی ہیں۔ زلزلے محسوس ہوتے ہیں۔ پرانے پہاڑ غرق، نئے کہسار پیدا ہو جاتے ہیں۔ نئے نئے دریا نئے نئے جزیرے ظاہر ہوتے ہیں۔ عالم تہ وبالا ہو جاتا ہے۔ اور جدھر سے کروٹ پھیری ادھر کی دبی ہوئی خلقت پھر از سر نو زندہ ہو کر دوسروں کی مصیبت کی تماشائی بن جاتی ہے"۔ (۳)

یہاں تمثیلی انداز میں فکر انگیز خیالات کی عمدہ ترجمانی کی گئی ہے۔ بہ اعتبار ظرافت یہ اعلیٰ درجہ کا مضمون ہے۔ زبان و بیان میں روانی ہے ثقالت کہیں نہیں ملتی۔ یوں بھی اکبر کی نثر سادہ اور ترسیل والبلاغ کے زیور سے آراستہ ہے۔ روانی، شگفتگی اور بے ساختگی اکبر کی نثر کی مشترکہ خوبی ہے۔ اس میں اشعار بھی آئیں ہیں مگر وہ محض ادائیگیٔ مطلب اور فکر کی ترجمانی کے لیے۔

(۴) انگریزوں کی زباندانی یہ مختصر سی لطیف تحریر ہے۔ انگریزوں کی زبان اُردو یا ہندی سے کم آشنائی سے متعلق ہے۔ ملاحظہ کریں:-

> "ایک میم صاحبہ کے لڑکا پیدا ہوا اور دودھ پلانے کے واسطے حسب معمول گدھی کی ضرورت ہوئی۔ اپنے بیرا کو بلا کر فرمایا: ول بیرا! بابا کے واسطے ایک گدھا لاؤ۔ بیرا بیچارہ ایک کمہار سے جا کر گدھا خرید لایا۔ اب میم صاحبہ دیکھتی ہیں تو اس کے تھن ہی نہیں۔ گھبرا کر تیز چیخ آواز سے بولیں: ول بیرا یہ تو صاحب کے مافیک ہے، ہمارے مافیک لاؤ"۔ (۴)

اس میں اکبر نے لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کے امتزاج سے مزاحیہ ماحول پیدا کیا ہے۔ "سسرال کی گالی"، "بیل کا میم (بیل کا میم)" اور "بل آف ایکسچینج" اسی قبیل کی مختصر تحریریں ہیں۔ جن میں بذلہ سنجی سے لطافت وظرافت پیدا کر دی ہے۔ "بل آف ایکسچینج" کی یہ عبارت ملاحظہ کریں:-

> "ایک صاحب نے شائستہ وتعلیم یافتہ لڑکے کی تعریف میں فرمایا کہ حضت ماشاءاللہ یہ کرنسی نوٹ ہے جہاں پہنچا روپیہ لایا۔ ایک خوشامدی بیٹھے تھے، بول اُٹھے: بجا ہے پیر و مرشد اگر کوئی دختر نیک اختر ہوتی تو وہ بھی بل آف ایکسچینج ہوتی"۔ (۵)

۳۔ "اودھ پنچ"۔ جلد اول، ۲۹ر مئی ۱۸۷۷ء، "انتخاب اودھ پنچ"، صفحہ ۹۸-۹۷

۴۔ "اودھ پنچ"، جلد اول ۱۹ر جون ۱۸۷۷ء

۵۔ "اودھ پنچ"۔ جلد دوم ۲۵ر ستمبر ۱۸۷۷ء، "نقوش" لاہور طنز و مزاح نمبر، صفحہ ۲۹۸

"سسرال کی گالی" بھی گو کہ ایک لطیفہ ہے مگر اس میں اُس وقت کے ایک سلگتے سیاسی واقعہ پر طنز بھی ہے۔ "بیل کا میم" بھی ایک خوبصورت لطیفہ ہے :-

"ایک ولایت سے تازہ وارد انگریز کے سامنے ایک گائے کی چوری کا مقدمہ پیش ہوا۔ صاحب بہادر کا اجلاس سہ منزلہ کوٹھے پر تھا۔ صاحب بہادر گائے کا نام سن کر گھبرائے اور کہا: گائے عدالت میں حاضر کیا جائے۔ اہل عملہ نے عذر کیا کہ گائے کوٹھے پر نہیں آسکتی، آپ نیچے چل کر ملاحظہ فرمائیں۔ جب صاحب بہادر نیچے گئے اور گائے کو دیکھا تو فرمایا: او کالا لوگ! ہم کو کھراب کرتا ہے، گائے گائے پکارتا ہے یہ نہیں کہتا کہ بیل کا میم ہے"۔(۶)

(۵) کوئی کہتا ہے دیوانہ..... اپنی نوعیت کا بہت دلچسپ و لطیف تمثیلی مضمون ہے۔ اس میں خیال کو شخص قرار دیا گیا ہے اور اس کی زبانی بڑی شاداب باتیں کی ہیں۔ اس میں زبان لکھنوی کا چٹخارہ اور بے ساختہ پن ملتا ہے۔ اس کے علاوہ حالات حاضرہ و گذشتہ پر تبصرہ و تنقید اور کچھ دوسرے سیاسی معرکوں کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ آغاز و اختتام حسین حکاکاتی و مزاحی انداز میں ہوتا ہے۔ مضمون گرچہ طویل ہے مگر گراں نہیں گذرتا۔ عبارت بلا ترتیب پیش نظر ہے۔ ملاحظہ کریں :-

"ہٹو بچو! سنبھل کر بیٹھو جگہ دو ہم آتے ہیں ہم آتے ہیں۔ ہاں ہاں ہم۔

یا اللہ اے حضت آپ ہیں کون ؟

ایں ہم ہیں کون ؟ ہم ہیں ہم۔

توبہ ارے میاں کچھ کہو گے بھی، آخر ہو کون ؟

بتا ہی دیں۔ ہم ہیں خیال ردماغ ولد نیچر ولد قل ھو اللہ احد۔

واہ! واہ! یہ تو آپ نے اپنے نام کے ساتھ اپنا نسب نامہ بھی پڑھ سنایا یہ تو فرمایئے یہاں نہ کوئی کمیٹی، نہ سوسائیٹی، نہ لیکچر، نہ آرٹیکل، نہ چندہ، نہ لاٹری آپ زور و شور سے جو تشریف لائے ہیں اس کا کیا باعث ..... کہنے میں کیا عذر، وہ بھی سن لیجئے :

ہوتے تھے آگے ہند میں مجنون بادشاہ کرتے تھے بے خطا بھی بہت خون بادشاہ

اے پنچ میر اعہد عجب عہد امن ہے یعنی ہے اس زمانے میں قانون بادشاہ

یوں ہے تو خیر۔ خیر کیسی ؟ خون جگر کھا کر نظم کروں اور آپ ایک خیر میں خاتمہ بالخیر کئے دیتے ہیں"۔(۷)

۶۔ بہ حوالہ "نقوش لاہور"، طنز و مزاح نمبر۔ صفحہ ۲۹۸ ۷۔ "اودھ پنچ"۔ جلد دوم، ۶/ اگست ۱۸۷۸ء

غرض بے حد شاداب اور باغ و بہار مضمون ہے۔ اس میں زبان کی کارگیری، مزاح کی تخلیق میں معاون ثابت ہوئی ہے۔ بہ اعتبار ظرافت اکبر کا شاہ کار مضمون ہے۔

(۶) لالہ شتاب رائے..... اکبر الہ آبادی نے لفظوں کی تکرار کے ذریعہ بھی مزاحیہ نثر کی اچھی مثال قائم کی۔ ظرافت کی تخلیق کا یہ حربہ گرچہ فی زمانہ متروک ہو چکا ہے مگر اگلے وقتوں کے ادیبوں کا یہ مقبول حربہ تھا۔ یہ مضمون اس طرز کا بہترین نمونہ ہے۔ ملاحظہ کریں:

"مشفق مہربان! سلامت۔ بعد سلام شوق کے واضح ہو کہ یہاں سب خیریت ہے۔ فقط۔ مکرر یہ کہ اپنی خیریت مزاج سے مطلع فرمائیے۔ فقط۔ لیکن جلد مطلع فرمائیے۔ فقط۔ ہاں خوب یاد آیا بیر نگ خط نہ بھیجئے گا۔ فقط۔ مکرر یہ کہ اگر بیر نگ آئے گا تو واپس ہو گا۔ فقط۔ اس بے تکلفی کو معاف کیجئے گا۔ فقط۔ زیادہ نیاز۔ فقط۔ نیاز مند۔ فقط۔ مکرر یہ کہ شتاب رائے۔ فقط۔ مکتوب الیہ نے جواب میں یہ شعر لکھا:

تحریر بند کیجئے ایسے خطوط کی
ہر بار کیا ضرور ہے اتنے فقوط کی (فقط کی جمع)"۔(۸)

مختصر یہ بہ اعتبار ظرافت اکبر کا بہترین مضمون ہے۔

(۷) کلکتہ کی وجہ تسمیہ یہ مضمون ایک لطیفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں لفظوں کی اُلٹ پھیر ظرافت کی موجب بنی ہے۔ ملاحظہ کریں:

"جناب پنچ! تسلیم۔ کلکتہ کی وجہ تسمیہ بہت لوگ لکھ چکے ہیں۔ لیکن بندہ کی تحقیق بھی نرالی ہے۔ جب شروع میں اہل یورپ یہاں آئے تو پہلے کلکتہ میں جاکر دیکھا تو چند مشٹنڈے بیٹھے ہوئے گھاس کاٹ رہے تھے۔ اُن لوگوں نے پوچھا اس شہر کا نام کیا ہے۔ یہ اُلّو کے پٹھے سمجھے کہ پوچھتے ہیں کہ گھاس کب کاٹی۔ جواب دیا کل کاٹا۔ کثرت استعمال سے کلکتہ ہو گیا"۔(۹)

(۸) مسلمانوں کی ترقی..... یہ بات واضح ہے کہ اکبر کی طنزیہ و مزاحیہ فکر مقصدی تھی۔ چوں کہ مغربی نظام عروج پر تھا۔ براہ راست کچھ کہنا بغاوت کے مترادف تھا۔ اکبر نے ہنسی مذاق کا توازن پسندانہ پیرایہ اختیار کیا۔ اکبر کا

۸۔ "اودھ پنچ"۔ جلد پنجم، ۱۰ر فروری ۱۸۸۱ء، صفحہ ۴
۹۔ "اودھ پنچ"۔ جلد پنجم، ۲۸ر جون ۱۸۸۱ء نمبر ۲۶، صفحہ ۲

انداز مزاحی تھا مگر سنجیدہ مقاصد کا ترجمان تھا۔ علاوہ ازیں اکبر پر رجعت پسندی و جدید ترقیات کا دشمن ہونے کی تہمت عائد کی جاتی ہے حالانکہ ان کے نثری اسلوب میں رجائیت و ترقی پسندی ملتی ہے۔ یہ مضمون اکبر کے ترقی پسند ذہنی رجحان کا امین ہے۔ اس میں اُنھوں نے ۱۸۸۲ء میں وکالت کے امتحان میں شریک اُمیدواروں کا ڈاٹا پیش کیا ہے جس میں مسلمانوں کا فی صد (%) ایک ہے۔ اس پر افسوس و ملال کا اظہار کرتے ہوئے گویا ہیں :-

"اب ذرا انصاف کیجئے کہ علی گڑھ والا کافر کیوں نہ غل مچائے اور بگو بگو کر کیوں نہ گالیاں سنائے کیوں نہ کم ہمت اور جاہل کا لقب دے۔ اے کسی زمانے کے کشور کشا لوگ ! اب تم کتاب کشائی کے قابل بھی نہ رہے۔ اے رئیسو ! اے آسودہ حال صاحبو! تم اپنے موجودہ کھیتوں کی آمدنی کے بھروسے اپنی اولاد کے نہال عزت و آبرو کو کیوں خشک کر رہے ہو۔ قیامت کو ابھی بہت دن باقی ہیں۔ غیرت مندوں کی جان پر تم ابھی سے کیوں قیامت ڈھا رہے ہو"۔ (۱۰)

ناصحانہ انداز سے قطع نظر ان سطور میں قوم کا جو درد اور متاع آبرو کی بربادی کی جو کسک پنہاں ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود اکبر اور سرسید دونوں کے مطمح نظر کی تانیں ایک ہی جگہ ٹوٹتی ہیں اور مقاصد میں اشتراک نظر آتا ہے۔ دونوں ہی کلرک سازی و تقلید پرستی سے بیزار اور جدید تعلیم و علوم کے موئد تھے۔ مگر طریقہ کار الگ و جداگانہ تھے۔ اکبر مزاح نگار تھے اور سرسید مصلح۔ اخلاقی ضابطوں کی پامالی، مسلمانوں کی معاشی و تعلیمی تنزلی پر دونوں متفکر تھے۔

(۹) تم بھی برطرف اکبر الہ آبادی اور سرسید کی چشمک ادب کی تاریخ کا ایک دلچسپ باب ہے۔ سرسید نے علاوہ اور باتوں کے عقلیت پسندی کی رَو میں بہہ کر حضرتِ خضر کے وجود سے انکار کر دیا۔ "خضر کوئی چیز نہیں" (مطبوعہ تہذیب الاخلاق) میں اس عالمانہ بحث کو سرسیّد نے چھیڑا تھا۔ اکبر نے اس کی تردید نہیں کی صرف اس خیال کا تمسخر اُڑایا۔ انداز و اسلوب کے لحاظ سے یہ اکبر کا نمائندہ مضمون ہے۔ اکبر کا انداز تحریر ملاحظہ کریں :

"ایک نواب صاحب ایک مسند پر بیٹھے اور نوکر کو پکارنا شروع کیا اور جو سامنے آیا اس سے کہا تم بھی برطرف۔ یہاں تک کہ جو رُو بچے بھی برطرف۔ اسی طرح سید صاحب نے ریفارمری کے اجلاس پر بیٹھ کر مذہبی لشکر میں تخفیف شروع کر دی۔ تم کون ہو؟ حوریں برطرف۔ تم کون؟ فرشتے۔ تم بھی برطرف۔ تم کون؟ بہشت و دوزخ تم بھی برطرف۔ آخر عمر پوری

۱۰۔ "اودھ پنچ"۔ جلد ششم، ۱۰ر جنوری ۱۸۸۲ء، نمبر ا۔ ضمیمہ ا

کر کے ہمارے پرانے رفیق خواجہ صاحب بھی کہیں نظر آ ہی گئے۔ سید صاحب نے للکارا! یہ کون بڈھا آدمی جا رہا ہے۔ جناب میں کمترین حضرت خواجہ خضر۔ تم بھی برطرف "۔ (۱۱)

(۱۰) چھپا رہے گا نہ...... یہ بھی نسبتاً اچھا مضمون ہے۔ اس میں بہ انداز مزاح وکیل، منصرم اور پٹواری وغیرہ کی بد دیانتی اور ضمیر فروشی کی تصویر کشی کی ہے۔ زبان اور آداب لکھنوی نے اس میں جان ڈال دی ہے۔ انداز بیان مکالماتی اور محاکاتی ہے۔

(۱۱) خدا غارت کرے...... یہ ایک اچھی مزاحیہ تحریر ہے۔ تمثیلی و مکالماتی انداز غضب کا ہے۔ خشک سالی کا شتکاروں کی پریشانی، موسم کی بے وفائی کو اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ نیز رشوت خوری کی رسم دیرینہ کی خبر یوں لی ہے:۔

> "میرا نام بی رشوت جان ہے۔ قریب قریب اکثر ملازموں کے دلوں میں میرا مکان ہے۔ پہلے تو انسان مجھ پر عاشق ہوتے ہیں، مگر جناب میں ایسی ڈھیلی مٹی کی بنی نہیں کہ مجھ کو کھا کر اوپر سے نمک سلیمانی یا پنجم صاحب کی گولیاں، ایک بوتل سوڈا واٹر اڑا لی جائے اور بندی ہضم ہو گئی۔ جناب میرے کھانے سے تو وہ کھٹی کھٹی ڈکاریں آتی ہیں کہ فوراً بد ہضمی کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے میرا کنبہ ماشاء اللہ بہت بڑا ہے اور طرہ یہ کہ ابا جان تو کچھ کمسن نہیں یعنی زمانہ سلف سے ان کا وجود ہے۔ لیکن خدا رکھے بڑے کلے ٹھلے کے جوان ہیں ہاتھ پاؤں کی قوت میں روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے۔ ایک نہ ایک بچہ ہر سال پیدا ہوتا ہے"۔ (۱۲)

رشوت خوری ایک آفاقی موضوع ہے۔ اس مضمون میں اس کے مضرت رساں اثرات کی تصویر کشی تمثیلی و محاکاتی نیز نسوانی طرز کے سہارے کی گئی ہے۔ اکبر کے بہترین مضامین کی فہرست میں اسے شامل کیا جاتا ہے۔

(۱۲) فلسفیانہ اوہام یہ مضمون "فلسفیانہ اوہام" منطق طرازی، و فلسفیانہ انداز تحریر میں اکبر کی نمائندہ نثر ہے۔ اس میں شئے کی بالارادہ حرکت کو فلسفیوں کی خود ساختہ حقیقت کا نام دیا ہے۔ سائنسی اذہان رکھنے والوں کا عقیدہ ہے کہ ہر چیز اپنے ارادہ سے حرکت کرتی ہے۔ مگر مذہبی نظریات و عقائد اس میلان کی نفی کرتے ہیں۔ انداز بیان خشک مگر بحث نہایت معلوماتی ہے۔

۱۱۔ "اودھ پنچ"۔ جلد ہشتم، اپریل ۱۸۹۶ء، نمبر ۱۴۔ حوالہ فائل مملوکہ محمود آباد لائبریری، ریاست محمود آباد

۱۲۔ "اودھ پنچ"۔ جلد ہشتم، ۱۰ر ستمبر ۱۸۹۶ء، نمبر ۷، ۳، حوالہ فائل مملوکہ محمود آباد لائبریری ریاست محمود آباد

(۱۳) مکرمی فتنہ انگیزی اس کا انداز بیان بہت شگفتہ اور عملی ہے۔ اس میں ایک خوشگوار واقعہ درج ہے۔ کسی صاحب کو انھوں نے "مکرما" کہہ کر مخاطب کیا ایک دوسرے کو "مکرمی" کہا۔ مکرمی والے دوست نے یہ خیال فرمایا کہ "مکرمی" "مکرما" کی مادہ ہے۔ شکایت کی اور اخیر تک نہیں مانے۔ مختصر یہ کہ یہاں لطیفہ سنجی اور انداز بیان سے ظرافت پیدا کی ہے۔ اور علم کی کمی سے پیدا ہونے والی فتنہ انگیزی کو ہدف طنز بنایا ہے۔

(۱۴) بجز اونٹ...... یہ قدرے طویل مضمون ہے۔ اس میں جدید ترقیات کے مخالفین کی کھلی اڑائی ہے۔ ایسے لوگوں کو طنز کا موضوع بنایا ہے جو سائنسی ایجادات و گوناگوں ترقیات کے باوجود ریل موٹر پر اونٹ کی سواری کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ مضمون اکبریات کے طلبا کے لئے اہم مواد کی حیثیت رکھتا ہے۔ مضمون نیم مزاحیہ نیم سنجیدہ ہے۔ یہ اکبر الٰہ آبادی کی رجائیت پسندی، روشن خیالی اور وسیع النظری کی پُرزور دلالت کرتا ہے۔

(۱۵) پردۂ نسواں خواتینِ ہند کی تعلیم و پردہ اکبر کا خاص موضوع رہا ہے۔ انھوں نے سید نذیر احمد انبالوی کے مضمون "در باب مخالفت پردۂ نسواں" کی رد میں یہ مضمون قلم بند کیا۔ اس میں مضمون نگار (نذیر احمد انبالوی) نے مرد و زن کے مراتب میں مساوات کی حمایت اور عورتوں کو پردے کی قید بیجا کی پرزور مخالفت کی تھی۔ اکبر کو یہ بات ناگوار گذری اور اس کے ردِ عمل کے طور پر یہ تحریر وجود میں آئی۔

متذکرہ بالا سطور میں اکبر الٰہ آبادی کی نمائندہ تحریروں کا تذکرہ کیا گیا۔ اس کی روشنی میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اردو نثر کی تاریخ میں اکبر الٰہ آبادی کی نثری کاوشوں کا اہم حصہ ہے، جنھیں باضابطہ کھنگالا نہیں گیا۔

اکبر کے طنز و مزاح کا موضوع ان کے عہد کی ناہمواریاں اور اقدار حیات کی پامالیاں ہیں۔ تمثیل نگاری و مکالماتی انداز اکبر کے طنز و مزاح کا وصفِ خاص ہے۔ ان کے علاوہ محاکات، مکالمہ، جزئیات، ایمائیت، قصہ نگاری و لطیفہ گوئی ان کے خاص حربے ہیں۔

اکبر کی نثر میں اصلاحی فکر کی جستجو زحمتِ بے جا ہے۔ بحیثیت مزاح نگار اکبر اپنے عصر کی ناہمواریوں کی عکاسی کرتے یا چوکے لگاتے ہیں۔ مگر وہ معاشرتی پھوڑوں کی جراحی کرنا نہیں چاہتے اور نہ ماحول سے مذہبی بیزاری کا سایہ کہیں ملتا ہے۔ اکبر کی نثر میں جارحیت، شعلگی یا جذباتیت نہیں ملتی۔ وہ نہایت خوشگوار اور لطیف انداز میں معاشرے کی بے ڈھنگیوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ یہ طریقہ کار یقینی طور پر مزاح نگار کا ہے نہ کہ طنز نگار یا مصلح کا۔

اکبر الٰہ آبادی کا نثری اسلوب قدیم و جدید کا سنگم ہے جو لطافت، ذہانت، بے ساختگی کے مرکب سے تیار ہوتا ہے۔ اس میں نہ کہیں ثقالت ملتی ہے نہ رومانیت نہ آداب و القاب کی گراں باری۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اکبر کی نثر حالی کی نثر کے مانند روکھی پھیکی ہے۔ اکبر نے اپنی نثر میں دلچسپی کے عنصر کو ہر جگہ برقرار رکھا ہے۔ اکبر کی نثر

کا یہ وصف غالب کی نثر کی یاد تازہ کرتا ہے۔ مگر غالب اس طرز کے موجد ہیں اور اکبر اپنی تمام ترجدتوں کے باوجود غالب کے خوشہ چیں۔ اکبر کی نثر پر روایت کا اثر عیاں ہے اس کے باوجود اس کی اہمیت ولسانی حیثیت مسلم ہے۔

Sufia Market, Near- International Hotel,
Siwan (Bihar)- 841 226

پروفیسر سید امیر حسن عابدی

رباعیاتِ سحابی استر آبادی کا نسخہ، علی گڑھ

سحابی استر آبادی نے شاہ عباس (۱) کے زمانہ میں اپنی زندگی کے آخری چالیس سال نجف اشرف میں گوشہ نشینی میں گزارے اور وہیں ۱۰۰۴ھ / ۹۶-۱۵۹۵ء میں انتقال کیا۔ مؤلف شمع انجمن ان کے متعلق لکھتے ہیں :

"سحابِ گوہر پاشِ اسرار است و آفتابِ سر گرمِ اضائہ انوار۔ در ارشادِ حقایق و معارف بی نظیر افتادہ و ارواح معانی را در چار عنصر رباعی بر وجہ خوب جلوہ دادہ...... از حطام دنیا بہ حصیری و ابریقی قانع"۔ (۲)

اس مولف نے ان کی رباعیوں کی تعداد ستر ہزار بتلائی ہے۔

صاحب تذکرۂ منتخب الاشعار نے ان کو "مہر فلک سیر عالم نکتہ یابی" کہا ہے۔ نیز لکھا ہے کہ "حقیقت و عرفان کے وہ رموز جو اب تک پوشیدہ تھے، انہوں نے انہیں کھل کر بیان کیا ہے"۔ صاحب تذکرہ نے ان کی رباعیوں کی تعداد چھ ہزار بتلائی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "انھوں نے ان کا دیوان دیکھا تھا جس میں چار ہزار اشعار تھے"۔ (۳)

سعد اللہ مسیحی پانی پتی کی مثنوی چھپ چکی ہے جو 'رامائن مسیحی' کے نام سے مشہور ہے۔ شاعر نے اس میں پیغمبر اسلام ﷺ کی نعت میں یہ بیت کہی تھی۔

دل از عشق محمدؐ ریش دارم　　　رقابت با خدائے خویش دارم

صاحب کلمات الشعرا نے لکھا ہے کہ "سحابی نے اپنی ایک رباعی میں 'رقیب' کا لفظ استعمال کیا ہے":

آن را کہ خدا رقیب باشد

رباعیاتِ سحابی کا ایک اہم قلمی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے (۴)۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی کتابت منشی چندر بھان برہمن نے کی ہے (۵)، جیسا کہ آخر میں کاتب نے لکھا ہے۔

"تمام شد خط اصغر الناس چندر بھان، دوازدہم...... عالم گیر غازی، در مقام بلدہ......"

۱۹۵۵ء میں میں نے 'ہندوی فارسی داں' کے نام سے ایک مقالہ فارسی میں لکھا تھا جو تہران کے مجلہ 'سخن' میں شائع ہوا تھا (۶)۔ اس کے بعد میں نے انگریزی میں ایک مقالہ لکھا جو ISLAMIC CULTURE میں

شائع ہوا(۷)۔ جہاں برہمن بہت بڑے شاعر تھے وہیں بہت بڑے انشاپرداز بھی تھے۔ وہ شاہجہاں (۸) کے زمانے میں دار الانشا کے رئیس تھے اور بہت سے ممتاز ایرانی انشاپرداز ان کے ماتحت کام کرتے تھے۔ ابھی حال میں مجھے چندر بھان برہمن کے متعلق اسیری صاحب کا مقالہ پڑھنے کو ملا (۹)۔ مگر کسی نے ان کے کاتب ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ اس نسخے کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ خود پسندیدہ کلام کی کتابت بھی کرتے تھے خاص کر دارا شکوہ (۱۰) کے قتل اور عالمگیر کی تخت نشینی کے بعد، جب وہ بالکل گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

اس نسخے کے پہلے صفحے پر یہ عبارت بھی ہے:

''بتاریخ چہاردہم شوال .... شاہ جہان ثانی در بلدۂ لکھنو دیدہ شد''۔

اس نسخے کی دوسری اہم اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نسخہ امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کو پیش کیا گیا تھا۔ نیز اس پر ان کی مہر ہے اور یہ نسخہ اودھ کے شاہی کتب خانہ میں رہ چکا ہے۔ مہر وغیرہ کی عبارت یہ ہے: ''مُہر کتاب خانہ سلطانی بادشاہ غازی محمد امجد علی شاہ بہادر: محمد بیگ، ۱۰ صفر ۱۱۹۸''۔

اور آخری صفحہ پر یہ عبارت ہے:

''حضور نواب محمد امجد علی شاہ دام سلطنۃ پادشاہ اودھ''۔

اس نسخہ میں سحابی کی رباعیات کا وہ انتخاب ہے جو منشی چندر بھان برہمن نے کیا تھا۔ بہر حال یہ نسخہ اس رباعی سے شروع ہوتا ہے:

الحمد للہ کہ با تمام خدا	از خلق رسیدم و شدم رام فدا
ہر کس سخنی ازین و آن می گوید	من گویم تام خدا تام خدا

اب یہاں اس انتخاب سے کچھ رباعیاں دی جا رہی ہیں۔

پرسیدم از ابلیس کہ ہجران وطن است	چون آدمیان چرا نہ طاعت فن است
گفتا کہ نشد کار مرا با این راست	ورنہ بد و نیک در جہاں پیش من است

عارف زخم عشق شرابی زدہ است	زاہد در زہد خویش خوابی زدہ است
عالم چو کتابست دو رو ہر شخصی	بر قدر طبیعت انتخابی زدہ است

قحطی مردان وفاداران آمدہ است	وقت دونان و نا سران آمدہ است
خامنہ و کج و خور دھمہ خلق آری	پاکیزہ جہان آخر آن آمدہ است

درمذہب عشق زہد وپیانہ یکیست　　ورد سحر و نعرۂ مستانہ یکیست
ازمسجد و دیرحق پرستی غرض است　　گرخانہ دوتاست صاحب خانہ یکیست

ماہیت خود اگر ندانست چہ شد　　یا آنکہ بہ جد و جہد دانست چہ شد
چون نیست بغیر آب در یخ چیزی　　دانست چہ شد اگر ندانست چہ شد

صوفی بسماع دست ازان افشاند　　تا آتش دل بہ حیلتی بیفشاند
عاقل داند کہ دراین گہوارۂ طفل　　از بہر سکون طفل می جنباند

خال وخط وچہرہ خوش ادا پیدا کرد　　چشم ولب وزلف دلربا پیدا کرد
نی نی ہمہ عشق بود کز دیدۂ من　　آئینہ ای دید و خود نما پیدا کرد

حواشی :

۱۔ ۹۹۶-۱۰۳۸ھ/۱۵۸۵-۱۶۲۹ء

۲۔ نواب صدیق حسن خان: شمع انجمن، ص ۱۹۸، بھوپال ۱۲۹۳ھ

۳۔ مردان علی خان مبتلا: تذکرہ منتخب الاشعار، ص ۶۲، ترتیب وتلخیص: ڈاکٹر محمد اسلم خاں، انڈو پرشین سوسائٹی، دہلی، ۱۹۷۵ء۔
تذکرہ کی اصل عبارت یہ ہے: "مہر فلک سیر عالم نکتہ یابی بودہ، از فرط اشتہار محتاج بہ تعریف وتوصیف نیست۔ شش ہزار رباعی از جناب ایشان در حقایق ومعارف، ودیوانی مشتمل بر چہار ہزار بیت دیدہ شدہ، راز حقیقت وعرفان را کہ ہموارہ در پردۂ خفا بود در رباعیات برملا کردہ، اگرچہ تمام یک دست وانتخاب ندارد"۔

۴۔ نمبر فارسی ۵۳،

۵۔ ۱۰۲۳-۱۰۷۳ھ/۱۶۱۴-۱۶۶۳ء

۶۔ یہ مقالہ میرے فارسی مقالوں کے مجموعہ 'گفتارہای پژوہشی در زمینۂ ادبیات فارسی' مرتبہ ڈاکٹر سید حسن عباس شائع کردہ انتشارات موقوفات محمود افشار تہران ۱۳۷۷ ھ ش میں شامل ہے۔

۷۔ یہ ۱۹۶۶ء میں چھپا تھا۔

۸۔ ۱۰۳۷-۱۰۶۸ھ/۱۶۲۸-۱۶۵۸ء

۹۔ F.M. ASIRI : Chander Bhan Brehman and His Chahar Chaman, Visva Bharti Annual SANTINIKETAN, Vol. IV, 1951

۱۰۔ ۱۰۲۴-۱۰۶۹ھ/۱۶۱۵-۱۶۵۹ء۔

پروفیسر محمد علی اثر

کتب خانہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے چند نادر مخطوطات

ادارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد) کا کتب خانہ عربی، فارسی، اردو اور خصوصاً دکنی کے ذخیرۂ مخطوطات کے اعتبار سے دنیا کے چند اہم اور قابلِ فخر کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ اس کتب خانہ میں محفوظ ایک ہزار چار سو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرستیں شائع ہو چکی ہیں۔ مشہور مخطوطہ شناس اور ماہر دکنیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ایک ہزار ایک سو پچاس مخطوطات کی توضیحی فہرستیں پانچ جلدوں میں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیان شائع کیں۔ پانچویں جلد کی اشاعت کے چوبیس سال بعد مولوی اکبر الدین صدیقی اور راقم الحروف کے اشتراک سے چھٹی جلد کی اشاعت عمل میں آئی۔ حال ہی میں راقم الحروف نے ادارۂ ادبیات اردو کے تذکرۂ مخطوطات کی ابتدائی تین جلدوں کو ترمیم و اضافے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ جن میں سے پہلی جلد نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے مالی تعاون سے شائع ہو چکی ہے اور دوسری اور تیسری جلد ترقی اردو کاونسل دہلی کی جانب سے زیرِ اشاعت ہے۔

ادارہ ادبیات اردو کے چند نادر و نایاب مخطوطات کے تذکرے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مخطوطات کے جامع اور ادارۂ ادبیات کے بانی ڈاکٹر زور کی غیر معمولی ادبی خدمات پر بھی سرسری نگاہ ڈالی جائے۔ ڈاکٹر زور کو دکنی ادب ہی نہیں بلکہ دکن کی ہر چیز سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ سرزمین دکن سے تعلق رکھنے والے شعرا اور ادیبوں کی نگارشات کے علاوہ نوادراتِ دکن کو بھی آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔ اس مطمحِ نظر کے حصول کے لیے وہ تا حیات کوشاں رہے۔ ادارے کے ذخیرۂ نوادرات کو انھوں نے قدیم بادشاہوں کے فرامین، دستاویزات، احکامات، یادداشتوں، فرمانوں، سکوں، کتبوں، مہروں، تصویروں، وصلیوں اور خطاطی کے اعلیٰ نمونوں سے آراستہ و پیراستہ قلمی کتابوں کے حصول کے سلسلے میں انھوں نے راستے کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور اس کے صلہ میں سینکڑوں بیش بہا اور نادر مخطوطات جمع کیے۔ ادارے میں بے شمار ایسے مخطوطات ہیں جن کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں ہے۔ متعدد قلمی کتابیں خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور ایسے مخطوطات کا بھی قابلِ لحاظ ذخیرہ موجود ہے جو عمدہ کاغذ، بہترین نقش و نگار اور خطاطی کے اعلیٰ نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر زور کی سعی و کاوش کی بدولت اردو کے سینکڑوں ایسے شاعر و

ادیب متعارف ہوئے ہیں جن سے اردو دنیا ناواقف تھی۔ ادارے میں محفوظ خطاطی اور خوش نویسی کے نادر اور شاہکار نمونوں کے تعلق سے ڈاکٹر زور کا یہ بیان آج بھی اہل علم کو دعوت فکر دیتا ہے۔ ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ:

"اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دکن کے خوش نویسوں کے جتنے شاہکار ادارے میں محفوظ ہیں، اتنے کسی اور ایک ہی کتب خانے میں، خواہ وہ سالار جنگ میوزیم ہو یا کتب خانہ آصفیہ (اورینٹل مینو اسکرپٹ لائبریری) یا رکارڈ آفس (آرکائیوز) موجود نہیں ہیں"۔(۱)

اس تمہید کے بعد ذیل میں کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو کے ذخیرۂ مخطوطات میں محفوظ چند قلمی کتابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱- دیوانِ ولی: ادارہ ادبیات اردو میں دیوان ولی کے بارہ قلمی نسخے موجود ہیں۔ یہاں ہم دیوان ولی کے جس نادر و نایاب مخطوطے کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا نمبر ۷۷ ہے۔ یہ نسخہ شکستہ آمیز خطِ نستعلیق میں ہے اور ۱۱۵۲ھ کا مکتوبہ ہے۔ مسطر ۱۳ سطری ہے اور تقطیع ½۷ × ½۵ انچ ہے۔ کاغذ نہایت عمدہ دولت آبادی ہے۔ اس مخطوطہ میں عنوانات اور تخلص سرخ روشنائی سے تحریر کئے گئے ہیں۔ پہلا ورق ضائع ہو گیا ہے، موجودہ صورت میں اس نسخے کی پہلی غزل کا ابتدائی شعر یہ ہے ۔

نہیں یو آہ و زاری جو سینے اور انکھیاں میں ہے
سمجھ بے شک کہ افسوں ہے سو اس پیو کے لبھانے کا

غزلوں کے بعد مخمسات، رباعیات، ترجیع بند، مستزاد، قصائد، مثنویات اور فردیات نقل کئے گئے ہیں۔ اس مخطوطے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کتابت ولی کے ایک ہم وطن اور باکمال شاعر مبتدی اورنگ آبادی نے کی ہے۔ مخطوطے کے آخر میں درج ذیل دو مادۂ تاریخ تحریر کئے ہیں ۔

"غنیم بھاگا" (۱۱۲۹ھ) اور "شہیدِ منزلِ خاص" (۱۱۳۷ھ)

اس کے نیچے مخطوطے کی تکمیل کا سال ۱۱۵۲ھ درج کیا گیا ہے۔ اور پھر آخر میں اس مخطوطے کے کاتب مبتدیؔ نے اپنا کلام درج کیا ہے۔ اس نسخے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ مبتدی نے اس کے حاشیوں پر جگہ جگہ ولی کی متعدد غزلیں تحریر کی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے دیوان ولی کی کتابت کے بعد جوں جوں نئی غزلیں ملتی رہیں حاشیوں پر ان کا اضافہ ہوتا رہا۔ اس مخطوطے کے مطالعہ سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ ولیؔ کا نام ولی اللہ، محمد ولی اللہ یا شمس ولی اللہ نہیں بلکہ "ولی محمد" تھا۔ مبتدی نے مختلف منظومات کی سرخیوں کے طور پر ولی کا نام بھی تحریر کر دیا ہے۔ جیسے "مخمسات ولی محمد"، مثنوی ولی محمد، "ترجیع بند ولی محمد"۔ صاحبِ "گلشن گفتار" نے بھی ولیؔ کا یہی نام بتایا ہے اور ولی کے عزیز

ترین دوست سید ابو المعالی کے فرزند شاہ اللہ کے مکتوبہ دیوان ولی کے نسخے میں بھی یہی نام ملتا ہے۔ دیوان ولی کی اشاعت ۱۸۳۳ء اور ۱۹۵۴ء کے درمیان چھ بار عمل میں آئی ہے لیکن احسن مارہروی اور نور الحسن ہاشمی نے اس کی ترتیب و تدوین میں بڑی چھان بین اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اختلاف نسخ کے اعتبار سے بھی زیر بحث نسخے کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک تو اس لیے کہ یہ عہدِ ولی کے قریبی زمانے میں لکھا گیا ہے، دوسرے یہ کہ اس کا کاتب ایک خوش گو شاعر اور ولی کا ہم وطن ہے۔ لیکن مذکورہ دونوں محققین نے اس مخطوطے سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا۔ یہاں نور الحسن ہاشمی اور احسن مارہروی کے مرتبہ دیوان ولی سے زیر بحث نسخے کے صرف ایک مطلع کا تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

پیش نظر نسخہ : کتاب العشق لکھ یو ہے صفا تیر اصفا دستا
ترے ابرو کے دو مصرعے یو اس کا ابد ادستا

احسن مارہروی : کتاب حسن کا یہ لکھ صفا تیر اصفا دستا
ترے ابرو کے دو مصرعے یہ اس کا ابد ادستا

نور الحسن ہاشمی : کتاب الحسن کا یہ لکھ صفا تیر اصفا دستا
ترے ابرو کے دو مصرعے یہ اس کا ابد ادستا

اس شعر میں اختلاف نسخ کا حوالہ دیے بغیر قدیم لفظوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جدید کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس تقابلی مطالعے سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ دیوان کے دونوں مرتبین نے پیش نظر مخطوطے کے درج ذیل شعر کو شامل نہیں کیا ہے ۔

ترے غم میں سوائے موہن ہو اجیوں کاہ میراتن
نین تیرے کا یو انجن سو مجہ کوں کہر بادستا

۲۔ **مثنوی نادر** : خطِ نستعلیق، ۱۱ سطری مسطر، "۶½ × ۸½" تقطیع۔ اس نادر و نایاب مخطوطے کا نمبر ۱۰۶ ہے۔ "مثنوی نادر" کے عناوین سرخ روشنائی سے تحریر کیے گئے ہیں اور اس کا سنہ کتابت ۱۲۳۸ھ ہے۔ یہ مخطوطہ ناقص الاول ہے اور اس کے کم از کم آٹھ ابتدائی اشعار ضائع ہو چکے ہیں۔ موجودہ صورت میں درج ذیل شعر سے مخطوطے کا آغاز ہوتا ہے ۔

نہال اب ہے تجھ فیض سے نونہال گرہ میں ہے غنچے کے زر مالا مال

درج ذیل صوری و معنوی تاریخ پر یہ مخطوطہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

کیا ہے سفر جب شہ نیک خو ‏ ‏ کہ بارہ سو اٹھتیسواں سنہ تھا وہ

اس ہی سن میں کر فکر نظم کلام ‏ ‏ کیا اس سفر نامے کو اختتام

یہ دل جب کہ تاریخ کی فکر کی ‏ ‏ ندا ہاتفِ غیب نے تب یہ دی

صلہ اس کا تجھ کو ملے بہترین ‏ ‏ یہ نادر ہوی مثنوی آفریں

ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے میں یہ مخطوطہ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ۲۲؍ستمبر ۱۹۴۷ء کو داخل کیا تھا۔ کتاب کے آخر میں مولوی نصیر الدین ہاشمی کے دستخط اور اس سے پہلے درج ذیل ترقیمہ موجود ہے۔

"مالکه حلیمه بنت صبغت الله بن محمد غوث بن ناصرالدین محمد عطاء الله عنهم. غلام محمدشرف الدوله بهادر. مالکهٔ عبدالقادر شرف الدوله –

"مثنوی نادر" دراصل نواب اعظم جاہ والیٔ آرکاٹ کا سفر نامہ ہے۔ اس کے مصنف کا تخلص نادر ہے۔ اس کے مکمل نام کا علم نہیں ہو سکا۔ پیش نظر مثنوی کے علاوہ نادر نے ایک اور مثنوی "رشکِ قمر ومہ جبیں" اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

تاریخ ادب اردو میں اس مخطوطے کو اس لیے غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی ہے کہ یہ نہ صرف اردو کا پہلا سفر نامہ ہے بلکہ یہی سفر نامہ اردو میں منظوم سفر ناموں کا نقطہ آغاز بھی ہے۔ دنیا میں اب تک اس کا کوئی اور نسخہ دریافت نہیں ہوا۔ یہ واحد و نایاب نسخہ ادارے میں اب بھی اپنی جگہ پر نہیں ہے۔

۳۔ دیوان فدویؔ : مثنوی نادؔر کی طرح دیوان فدوی کا بھی اب تک صرف ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے جو ادارہ ادبیات اردو کی زینت ہے۔ ۱۹ سطری مسطر، "۵ × ½۷" تقطیع کے ۱۹ اوراق پر مشتمل اس مخطوطے کا نمبر ۵۸۵ ہے۔ اس دیوان کا مصنف فدوی خاں فدویؔ اورنگ آبادی ہے۔ جس کے اپنے کلام میں ولیؔ کا ذکر بھی ملتا ہے، اس کی زمینوں میں غزلیں بھی ہیں۔ نمونتاً دو اشعار ملاحظہ ہوں –

سخت مشکل ہے اے عزیزاں ہو ‏ ‏ شعر کہنا ولی کے مضموں کا

پھر پھر ولی کا مصرعہ آتا زباں پہ فدوی ‏ ‏ دوزخ ہے مجہ کوں بیو بن گلزار کا تماشا

قدیم اردو کی دیگر قلمی کتابوں کی طرح دیوان فدوی کے مخطوطے میں املا کی درج ذیل خصوصیات نظر آتی ہیں :

۱۔ یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔

۲۔ ک اور گ دونوں کے لیے "ک" تحریر کیا گیا ہے۔

۳۔ ٹ، ڈ، ڑ کو ٹ، ڈ، ڑ لکھا گیا ہے یعنی ط کی علامت کی جگہ تین نقطے۔

۴۔ بعض الفاظ کو غیر ضروری طور پر ملا کر لکھا گیا ہے۔ جیسے بے گناہ کے لیے "بیگنہ" چمن میں کے لیے

''جھمیں'' اے کافر کے لیے ''ایکافر'' اے دل کے لیے ''ایدل'' میرے سوں کے لیے ''میریسوں'' وغیرہ۔
دیوان کا آغاز ۱۷ اشعر پر مشتمل ایک قصیدے سے ہوتا ہے۔ جو دراصل اس دیوان کے منظوم دیباچے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مطلع یہ ہے ۔

ایزد کے نام پاک سوں میں ابتدا کیا بعد از ثنا و نعت رسول خدا کیا

اس قصیدے کے علاوہ دیوان فدوی میں جملہ ۳۷ غزلیں موجود ہیں۔ اس مخطوطے کا تعارف کرواتے ہوئے ڈاکٹر زور نے اطلاع دی ہے کہ اس میں جملہ ردیفوں میں غزلیں موجود ہیں۔ حالانکہ اس میں صرف الف، ب، ت، ث، ج، ح، ذ، ر، س، ش، ص، ض، غ، ک، ل، م، ن، و اور ی کی ردیف میں غزلیں ہیں باقی ردیفوں میں ایک شعر بھی نہیں ہے۔
.... میں ''گلدستہ کرناٹک کے مولف کے حوالے سے اس مثنوی کا تذکرہ کرتے ہوئے اطلاع دی ہے کہ یہ (روپ سنگار) بھی ایک مشہور مثنوی تھی اس کا نسخہ بھی نایاب ہے''۔ یہ ادارے کی خوش قسمتی ہے کہ مثنوی روپ سنگار اس کے ذخیرۂ مخطوطات کی قدر و قیمت میں اضافہ کر رہی ہے۔ اس مثنوی کا اب تک کوئی اور نسخہ دریافت نہیں ہوا ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۱سطری مسطر اور ۴×۷'' تقطیع کے ۱۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ عنوانات سرخ روشنائی سے تحریر کیے گئے ہیں اور خط پاکیزہ نستعلیق ہے۔ مثنوی نادر کی طرح پیش نظر مثنوی کا نسخہ بھی مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ادارے کو تحفۃً پیش کیا ہے۔ کتاب کے سرورق پر ہاشمی صاحب کی درج ذیل تحریر موجود ہے۔
''محبی ڈاکٹر زور کی خدمت میں ''تحفہ ہاشمی'' میں نے اس کو ادارے میں بطور عطیہ داخل کر دیا ہے''۔ (۲)
باقر آگاہ کی اس مثنوی کا موضوع نائکہ بھید ہے۔ بقول ڈاکٹر زور ''سنسکرت شاعری میں عورتوں کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں اور ان کے جو مختلف جذبات واضح کیے گئے ہیں، ان سے مصنف نے اس کتاب میں تفصیل سے بحث کی ہے'' (۳)۔ مولانا باقر آگاہ دکنی اردو کے بلند پایہ عالم، باکمال شاعر اور اردو کے اولین نقاد تھے۔ عربی، فارسی اور اردو میں ان کی تصانیف کی تعداد ۳۰۲ بتائی جاتی ہے۔ ان کے دیوان میں تلگو اور اروی زبان میں اشعار ملتے ہیں۔ پیش نظر مخطوطے کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ برج بھاشا اور سنسکرت پر بھی ماہرانہ عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے اس مثنوی میں سنسکرت کو ہندی کے نام سے یاد کیا ہے اور اس زبان کی وسعت اور فصاحت کی بہت تعریف کی ہے۔ چند اشعار دیکھئے ۔

زبانیں جو مروج ہیں بہ عالم کہ شہرت سے ہوئی ہیں وہ مکرم
نے ہم بعض اور بعضوں کو دیکھے نگاہ غور سے سب کو پرکھے
نہیں کوئی ان میں ہے ہندی کے مانند ہے جس کا نام سنسکرت اے خردمند
ہے وسعت اس کی بے حد اے گرامی فصاحت اور تفرد سے ہے نامی

جہاں تک آگاہ کی دکنی تصانیف کا تعلق ہے انہوں نے اپنی پہلی دکنی تصنیف ''تحفۃ النسا'' ۲۷ سال کی عمر میں (۱۱۸۵ھ میں) تصنیف کی تھی۔ مثنوی روپ سنگار آگاہ کی آخری تصنیف ہے جو ان کی وفات (۱۲۲۰ھ) سے پانچ سال قبل (۱۲۱۵ھ) پایہ تکمیل کو پہنچی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اردو'' کی دوسری جلد میں اس مثنوی کا نام ہوا ''اوب سنگار'' تحریر کیا ہے۔

درج ذیل اشعار سے اس مثنوی کے نام اور تاریخ تصنیف پر روشنی پڑتی ہے۔

بنا جب حسن کا آئینہ اوتار　　رکھا میں نام اس کا روپ سنگار

ہے اب ہجرت سے بارا سو پہ پندرہ　　کہ اعجاز اس کا ہے جیسے کا دیا

حواشی :

۱　ڈاکٹر زور۔ تذکرۂ نوادر ایوان اردو۔ ص ۱۷

۲　نصیر الدین ہاشمی۔ مدراس میں اردو۔ ص ۸۵

۳　ڈاکٹر زور۔ تذکرۂ مخطوطات (جلد اول) مخطوطہ نمبر ۲۲۱، ص ۳۹۰

ڈاکٹر ظفر کمالی

مثنوی قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ

"مثنوی قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ" جناب ابوالبرکات کربلائی کی تصنیف ہے۔ ۱۵۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۸۶ء (کتاب میں سنہ اشاعت موجود نہیں) میں نصرت پبلشرز لکھنؤ نے شائع کی۔ "تعارف" میں مصنف نے وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایم۔اے کے دوران امتحان میں انھیں ایسی کتاب کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی جس میں ملا وجہی اور "قطب مشتری" پر سیر حاصل بحث کی گئی ہو۔ بڑی مشکل سے انھیں پروفیسر وہاب اشرفی کی کتاب ہاتھ لگی اور اسی سے انھوں نے کسی طرح اپنا کام چلایا۔ وہاب اشرفی کی کتاب ان کے خیال میں امتحان کے لیے ناکافی ہے اور یہی حال "قطب مشتری" پر مولوی عبدالحق کے مقدمے کا بھی ہے۔ اسی وقت موصوف نے ارادہ کرلیا تھا کہ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد آیندہ امتحان دینے والے طلبہ کی مشکلات کو دور کریں گے۔ ان کے خیال میں یہ "چٹیل میدان" تھا لیکن اپنے استاد جناب احمد جمال پاشا کی حوصلہ افزائی کی بدولت ایک سال مسلسل صبح وشام کی محنت کے بعد یہ "سیر حاصل تنقیدی مطالعہ" معرض وجود میں آیا اور نصرت پبلشرز نے اسے شائع کرکے انھیں کے لفظوں میں "اردو ادب کی گرانقدر خدمت کی"۔ مصنف ابھی عمر کی جس منزل پر ہیں اس سے یہ توقع ہے کہ وہ آیندہ بھی اس طرح کی "سیر حاصل" اور گراں قدر" کتابیں لکھیں گے۔ پیشِ نظر جائزے کا مقصد یہ جتانا ہے کہ تحقیق و تنقید کی راہیں کتنی دشوار ہیں اور اس میں کتنی دیدہ ریزی، احتیاط اور صبروضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔

برکات صاحب نے جس نسخے کو اپنے مطالعے کی بنیاد بنایا ہے اس کا متن ڈاکٹر وہاب اشرفی کی کتاب "قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ" (اشاعت ۱۹۷۷ء) میں شامل ہے جس کے متعلق وہاب صاحب کا کہنا ہے کہ یہ متن وہ ہے جسے مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی سے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا تھا۔ راقم حروف کے پیشِ نظر مولوی صاحب کا شائع کردہ نسخہ نہیں ہے۔ چونکہ وہاب صاحب نے "قطب مشتری" کی کتابت نئے سرے سے کرائی ہے اس لیے اس میں غلطیوں کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ واضح رہے کہ مولوی عبدالحق نے جو متون ترتیب دیے، اپنی اہمیت کے باوجود فنِ تدوین کے لحاظ سے معیاری نہیں ہیں۔

کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے کی اساسی شرط یہ ہے کہ مصنف اس پر پوری دسترس رکھتا ہو۔ موضوع اگر شعری ادب سے متعلق ہو تو اس کی ذمے داریوں میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ مثلاً وہ موزوں طبع ہو، اوزان و بحور اور شاعری کی مبادیات سے واقف ہو اور مثالیں پیش کرتے وقت صحتِ متن کا پورا خیال رکھ سکتا ہو۔ قدیم متون پر لکھنا

ویسے بھی آسان نہیں۔ خاص طور سے متن کا تعلق اگر دکنی ادب سے ہو تو پیچیدگی اور بڑھ جاتی ہے۔ فی زمانہ صورتِ حال یہ ہے کہ مطبوعہ دکنی کلاسیکی مثنویوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جس کے متن پر ہم پوری طرح بھروسہ کر سکیں۔ جو متن دستیاب ہیں انھیں صحیح پڑھنے اور سمجھنے والے نہیں کے برابر ہیں۔ ایسی حالت میں کسی نو آموز کا بغیر کسی تیاری کے اس میدان میں قدم رکھنا بہت جسارت کا کام ہے۔ برکات صاحب نے جس انداز سے یہ کتاب لکھی ہے اسے مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ وہاب صاحب کے نسخے میں اشعار کی غلط قرأت بھی موجود ہے اور ناموزوں اشعار بھی کم نہیں۔ ایسے نسخے کو بنیاد بنا کر جب لکھنا تھا تو مزید احتیاط کی ضرورت تھی لیکن موصوف نے احتیاط کا دامن سرے سے پکڑا ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پیشِ نظر نسخے میں جو غلط مصرعے درج ہیں انھیں درست سمجھ کر من و عن نقل کر دیا گیا ہے۔ کچھ اشعار کی صورت برکات صاحب نے مسخ کی ہے یعنی بہت سے اشعار میں لفظی تحریف کی گئی ہے۔ بعض اشعار میں کسی لفظ کا اضافہ اور کچھ میں کسی لفظ کو حذف کر دیا ہے جس سے اشعار ناموزوں ہو گئے ہیں۔ بعض مقامات پر اشعار کی غلط قرأت کی وجہ سے مدعا عنقا ہو گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ موصوف طبع موزوں نہیں رکھتے۔ طبیعت کی ناموزونی کا ایک اہم ثبوت صفحہ سترہ پر موجود ہے۔ انھوں نے "وجہی کا مذہب" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ شعر درج کیا ہے ؎

علی کا محب نیں جو ئی سچ توں جان ☆ حرامی پنے کا وہی ہے نشان

اور اس کے بعد یہ شعر ہے ؎

علی اندر علی پردے کے باہر ☆ علی کا مرتبہ اللہ اکبر

موصوف نے فٹ نوٹ میں جو حوالہ دیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دوسرے شعر کو بھی قطب مشتری کا ہی سمجھتے ہیں۔ اگر انھیں وزن و بحر سے ابتدائی واقفیت بھی ہوتی تو ایسا سمجھنا محال تھا۔ "قطب مشتری" کی بحر متقارب مثمن محذوف (فعولن فعولن فعولن فعل) ہے جب کہ "علی کا محب الخ" بحر ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن) میں ہے۔

موصوف نے جن اشعار کو درست سمجھ کر نقل کیا ہے اور جو ان کے پیشِ نظر نسخے میں بھی غلط ہیں ان میں سے چند درج کیے جاتے ہیں:

(۱) دکھن (کذا) ملک بھوتیچ خاصا ہے (ص ۱۲)

یہاں "بھوتیچ" کے بدلے "بھوتچ" کا محل ہے۔ دکنی میں تاکیدی حروف "ہی" کے بجائے تاکیدی "چ" کا رواج رہا ہے۔ اور یہاں اسی روایت کی پیروی کی گئی ہے۔

(۲) عجب کیا مردے اٹھیں جیو کر (ص ۳۲)

مصرع ناموزوں ہے۔ "عجب کیا" کے بعد اگر 'جو' بڑھا دیا جائے تو شعر کا سقم دور ہو جائے گا۔

(۳) اسد خاں جو ہے شاہِ سرطان کا (ص ۴۰)

"شاہ" کی 'ہ' کو بہ اضافت لکھنے سے شعر غلط ہو گیا ہے۔

(۴) پھرے شوق نے عرب لگ باد ہو (ص ۶۸)

"شوق نے عرب" غلط اور 'شرق تے غرب' درست ہے۔ یہاں وجہی عطارد کا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نے مشرق سے مغرب تک کا سفر کیا تھا۔

(۵) جو توں ناکہسی منج کن اپنایو حال

"کہسی" نے شعر کے آہنگ کو متاثر کیا ہے۔ صحیح لفظ 'کہی' ہے۔

(۶) جو دکھلائی آنکھ کعبہ سو دھن ☆ سرو سُر نوائے تھے سجدہ کرن (ص ۱۰۰)

"سر" کو بالضم لکھنا صریحاً غلط ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ جس وقت معشوق نے اپنا کعبے جیسا مقدس چہرا دکھایا اس وقت اسے سجدہ کرنے کے لیے سرو سر جھکائے ہوئے تھے۔

موصوف نے جہاں لفظی تحریف کی ہے اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ (صحیح / غلط)

سینسار / سنسار ص ۱۱، تے / رنے ص ۱۶، ۲۶، ۲۷، ۲۹، کسے / کسی ص ۱۶، اپسے / ایسے ص ۲۷، سوں / رسے ص ۲۸ پتار / پتا ص ۳۲، ۳۴، دور / وہ ص ۳۵، سند ھریاں / سندہریاں ص ۳۷، خزینار / خنرینا ص ۳۸، اپر / اوپر ص ۳۸، اتھی / رتھی ص ۳۹، اس / رس ص ۳۹، نکبتی / نلبتی ص ۳۹، پہ / پر ص ۴۰، رھیا / رہیا ص ۴۱، وھاں / رہاں ص ۴۱، نحاس / نماس ص ۵۷، بدنھانٹے / بدھانٹے ص ۶۲، یو / جو ص ۶۵، انجھوں / انچھوں ص ۶۵، نھواں / نسواں ص ۶۶، بچھور / بچھڑ ص ۸۳، سریاں / سرماں ص ۸۴، تجے / تجھے ص ۸۷، کدحاں / کدھاں ص ۸۸، بدھے / بدہے ص ۸۹، باتاں / باتاں ص ۹۰، کیک / کیگ ص ۹۴، چتر / پچڑ ص ۹۶، ایں / ریں ص ۹۶، اپر / اپو ص ۹۸، ڈوریاں / ڈودیاں ص ۱۰۳، سہاتی / سہاتی ص ۱۱۵۔

موصوف نے اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے جن اشعار میں تبدیلیاں کی ہیں اس کا ایک سرسری جائزہ پیش ہے:

(۱) دو جگ آج نورِ اعلیٰ نور ہے ☆ زمیں چاند آسمان سو سور ہے (ص ۳۲)

شعر خارج از بحر ہے۔ پہلے مصرعے میں "اعلیٰ" کے بدلے 'علی' ہونا چاہیے اور مصرعۂ ثانی میں "آسمان" کی جگہ 'اسمان'۔ موصوف نے اکثر جگہوں پر الف مقصورہ کو الف ممدودہ سے بدل کر شعر کو بے وزن کر دیا ہے۔ مثلاً ص ۲۸ پر بھی "علی" کو 'اعلیٰ' لکھا ہے۔ اسی طرح ص ۶۶ پر "انچل" کی تصحیح 'آنچل' سے کر دی ہے۔

(۲) نکوں کرتوں لٹی ہولنے کا ہوس (ص ۲۸)

'لٹی' بے معنی ہے۔ یہاں 'لٹی' بہ معنی 'بہت زیادہ' ہونا چاہیے۔

(۳) عجب دوداس دائی من میت کا ☆ کہ ہر بند کوں تاثیر ہے امرت کا (ص ۳۲)

دوسرے مصرعے میں "میت" کی مناسبت سے 'امریت' ہونا چاہیے۔

(۴) کدھیں کوئی دکھاتی سُنا کھول کر (ص ۳۵)

غلط قرأت کی وجہ سے شعر کا مدعا خبط ہو گیا ہے۔ "سنا" بالضم نہیں بالکسر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کبھی کوئی اپنا سینہ کھول کر دکھاتی تھی۔

(۵) صورت شہ کو دیکھت بھلی نارو (ص ۴۲)

"کو" کی جگہ 'کی' کا محل ہے۔

(۶) نہیں حاجت اب تیرے سکالانے کا (ص ۶۲)

"سکالانے" کی جگہ 'سکلانے' ہونا چاہیے۔

(۷) کہاں ہے وہ لالن مٹھی حال کا (ص ۶۶)

"مٹھی حال" کہنا لغویات ہے۔ 'چال' ہونا چاہیے۔

(۸) ہوئے شہ جب مست اپی ہور دھن (ص ۶۷)

"شہ" کو 'شاہ' کر دینے سے مصرعے کا وزن درست ہو جائے گا۔

(۹) فرشتیاں کو مہمان سب لیالے کر (ص ۶۸)

"کو" کی جگہ 'کوں' اور "لیالے" کے بدلے 'لیائے' ہونا چاہیے۔

(۱۰) فن اس کام کا ہر کے فام نیں (ص ۷۰)

"کے" کے بدلے 'کے' لکھنے سے شعر کا وزن باقی نہیں رہا ہے۔

(۱۱) بڑے خوف معقول ہر ایک باب ☆ بڈھیاں کی دعا ہے ہوتی ہے مستجاب (ص ۷۰)

پہلا مصرع بے معنی اور دوسرا بے وزن ہے۔ "خوف" کی جگہ 'خوب' ہے۔ دوسرے مصرعے میں "دعا" کے بعد لفظ 'ہے' زائد ہے۔

(۱۲) عجب ہور خصلت اہے یو پری (ص ۸۱)

"حور" ہونا چاہیے۔

(۱۳) جفا پیری ہور تومانی منے ☆ ہر ایک کوں لذت جوانی منے (ص ۸۲)

درست شعر یوں ہے ۔

جفا پیری ہور نا توانی منے ☆ ہر ایکس کوں لذت جوانی منے

(۱۴) کمل پھول طالب ہے جو سور کا (ص ۸۳)

وجہی نے "ہے جو" کی جگہ 'جو ہے' لکھا ہے۔

(۱۵) مجے اس سکیاں کا سو یو چھند نہ بھاوے (ص ۸۳)

"بھاوے" غلط 'بھائے' درست ہے۔

(۱۶) نہ یادی کے لائق ہر یک یاد ہے (ص ۸۴)

"یاری" بجائے 'یادی' اور "یار" بجائے 'یاد' درست ہے۔

(۱۷) مجے یاراں رہنا بھوت مشکل رہے (ص ۸۵)

"یاراں رہنا" کی جگہ 'یاں رہنا' کا محل ہے۔

(۱۸) کہے شہ کے مردانے مرداں کہیں (ص ۸۵)

"کے کی جگہ 'کہ' ہونا چاہیے۔

(۱۹) توں صورت ستی جیو کیا لائی ہے ☆ توں صورت منے معنی کیا لائی ہے (ص ۸۷)

دوسرے مصرعے کا قافیہ "لائی" نہیں 'پائی' ہے۔

(۲۰) جتو ئی نار اس کن ہے اس نا تھے ☆ مجے رشک آئی ہے اس ٹھار تے (ص ۸۸)

پہلے مصرعہ میں "نا تھے" کی جگہ 'نار تے' ہونا چاہئے تھا۔ ثانی مصرعے میں "آئی" کے بدلے 'آتی' درست ہے۔

(۲۱) کدھیں لیوے بھاتا کہ سر درو ہے (ص ۹۱)

لفظ "بھاتا" نے مصرع کو معنی سے بے نیاز کردیا ہے۔ یہ دراصل 'بھانا' بمعنی بہانہ ہے۔

(۲۲) کہ پکڑیا ہے موں میں چچو کوں بھونگ (ص ۱۰۱)

"چچو" بغیر تشدید کے ہے۔

(۲۳) کہیں چاند سورج تارے انبر (ص ۹۷)

یہاں سورج غلط "سوریج" صحیح ہے۔

(۲۴) کہ شاہیر شہ کے تنگ مارتے (ص ۱۱۰)

"شاہیر" کے بدلے 'شاطیر' ہونا چاہئے۔

(۲۵) انکھیاں پر بھنوں چھند سوں بھانے ہیں ☆ کہ ترکاں سراں پر طرے لالے ہیں (ص ۱۰۲)

صحیح شعر اس طرح ہے ؎

انکھیاں پر بھنواں چھند سوں چھائے ہیں ☆ کہ ترکاں سراں پر طرے لائے ہیں

موصوف صرف اشعار نقل کرنے میں بے احتیاطی سے کام نہیں لیتے بلکہ جہاں انھوں نے دوسروں کے نثری اقتباسات نقل کیے ہیں ان میں بھی بیشتر تحریفات سے خالی نہیں۔ مثال کے طور پر صفحہ پندرہ پر "سب رس" اور "تاج الحقائق" کے اقتباسات موجود ہیں۔ اسی کو انھوں نے ص ۱۱۲ پر مکرر درج کیا ہے۔ ان دونوں جگہوں کی عبارتوں میں یکسانیت نہیں ملتی۔ اسی طرح صفحہ اٹھارہ پر وہاب اشرفی کا ایک اقتباس ہے جس میں اصل کے اعتبار سے کم از کم دو خامیاں موجود ہیں۔

تحقیقی و تنقیدی غلطیاں :

(۱) "ملا وجہی (نے) قطب شاہی عہد کے چار بڑے بادشاہوں یعنی ابراہیم قلی، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبد اللہ قطب شاہ کا زمانہ ہی نہیں دیکھا تھا بلکہ ان کے ادوار میں تصانیف بھی کی تھیں۔ (کذا) اور بادشاہوں کے چرکے بھی کھائے تھے"۔ (ص ۱۰)

ابراہیم قلی کا دور حکومت ۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ (۱۵۵۰-۱۵۸۰ء) ہے۔ وجہی کا سنہ پیدائش متنازعہ ہے۔ موصوف نے ڈاکٹر نور السعید اختر سے اتفاق کرتے ہوئے اس کا سالِ ولادت ۱۵۶۶ء یا ۱۵۶۷ء متعین کیا ہے (ص ۱۱-۱۲)۔ اگر ہم ۱۵۶۵ء کو وجہی کا سنہ پیدائش تسلیم کر لیں، اور اس تسلیم کرنے کا کوئی معقول جواز موجود نہیں، تو ابراہیم قلی کے انتقال کے وقت وجہی کی عمر تیرہ چودہ برس قرار پاتی ہے۔ اس عمر میں وجہی کا دادِ سخن دینا محتاج ثبوت ہے۔ موصوف نے ص ۱۲ پر لکھا ہے کہ وجہی نے زمانۂ طفلی سے شاعری شروع کر دی تھی لیکن اس کا ثبوت نہیں پیش کیا ہے۔ اگر یوں ہی لکھنا تھا تو "زمانۂ طفلی" کے بجائے "شکمِ مادر" لکھ دینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دربار سے وابستگی سے پہلے محمد قلی قطب شاہ کے میر جملہ سوری راؤ برہمن کے ذریعے وجہی کو تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں۔ قلی قطب شاہ نے اسے کوئی تکلیف نہیں دی اور اسے ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا۔ محمد قطب شاہ کے عہد میں وجہی عتابِ شاہی کا شکار ہوا لیکن محمد قطب شاہ کے بعد جب عبد اللہ قطب شاہ تخت پر بیٹھا تو وجہی کی مشکلات کا خاتمہ ہو گیا۔ اس لئے یہ کہنا کہ وجہی نے "بادشاہوں" کے چرکے کھائے تھے، درست نہیں ہے۔

(۲) "وجہی نے اپنے علم کو عربی و فارسی زبانوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ کنڑ، مراٹھی، تلگو اور دکن کی مقامی بولیوں میں بھی ید طولیٰ حاصل کر لیا تھا"۔ (ص ۱۲)

کسی زبان سے واقفیت اور بات ہے اور اس پر عبور حاصل کرنا دیگر بات۔ وجہی کنڑ، مراٹھی اور تلنگو زبانوں پر "ید طولیٰ" رکھتا تھا، اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

(۳) "وجہی کا مزار حیدر آباد میں سید حسن شاہ برہند کی درگاہ میں موجود ہے"۔ (ص ۱۵)

سید حسن شاہ کے ساتھ لفظ "برہند" غلط ہے اس کی جگہ "برہنہ" ہونا چاہئے۔ یہ درست ہے کہ وجہی کی تربت حسن شاہ برہنہ کی درگاہ میں تھی لیکن اس کی موجودگی کا دعوا نظر ثانی کا محتاج ہے۔ "حیات وجہی" (اشاعت ۱۹۹۰ء) کے مصنف ڈاکٹر م-ن- سعید نے لکھا ہے کہ "وجہی کے مزار کی جستجو میں راقم الحروف نے بہت سا وقت صرف کیا۔ حضرت سید حسن برہنہ شاہ کے گنبد کے اردگرد بے شمار قبریں اور مزارات ہیں اور کافی شکستہ حالات میں ہیں۔ کسی واضح رہنمائی اور کسی قطعی اشارے کے نہ ہونے کی وجہ سے وجہی کے مزار کا پتا لگانا ممکن نہ ہو سکا" (ص ۱۴۸)۔

(۴) "قطب مشتری میں.......... منقبت کے ۵۰ اشعار ہیں"۔ (ص ۱۶)

منقبت کے اشعار پچاس نہیں اکیاون ہیں۔

(۵) "سب رس کی ایک غیر متنازعہ عبارت ملاحظہ ہو......" (ص ۱۷)

اس قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب رس کی کچھ عبارتیں متنازعہ بھی ہیں جب کہ ایسی کوئی بات نہیں۔

(۶) "شبلی نعمانی نے 'شاہنامہ اسلام' کا نمونہ پیش نظر رکھ کر مثنوی کی خصوصیت کی وضاحت کی ہے" (ص ۱۲)۔

موصوف نے اگر 'شعر العجم' جلد چہارم کو بچشم خود دیکھا ہوتا تو وہ 'شاہنامہ اسلام' کا نام نہ لیتے۔ شبلی نے اس نام کی کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ انہوں نے شاہنامہ فردوسی کو رزمیہ مثنویوں میں سب سے افضل مقام ضرور دیا ہے، لیکن مثنوی کی فنی خصوصیات بیان کرتے وقت شاہنامے کو پیش نظر نہیں رکھا۔

(۷) "یہ (قطب مشتری) بدیت، آفاقیت اور ہمہ گیری رکھتی ہے"۔ (ص ۳۰)

بالکل لغو بات ہے۔ قطب مشتری کا آفاقیت اور ہمہ گیری سے کیا تعلق؟ موصوف وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مثنوی کے فن کے مطابق تعلی کو بھی شامل کیا ہے۔ علمائے ادب اس نکتے سے اب تک بے خبر ہیں۔

(۸) "اس میں مثنوی کے فن کے مطابق تعلی، زور بیان، ربط و تسلسل اور ارتقا ملتا ہے"۔ (ص ۳۰)

(۹) "قطب مشتری وجہی کا شاہکار ہے"۔ (ص ۳۱)

وجہی کا شاہکار 'قطب مشتری' نہیں 'سب رس' ہے۔ البتہ 'قطب مشتری' کو اس کا شعری شاہکار کہہ سکتے ہیں۔

(۱۰) "چونکہ مثنوی کا ہیرو محمد قلی قطب شاہ ہے اس لیے جگہ جگہ ابراہیم قطب شاہ مثنوی کی فضا میں نظر آتا ہے"۔ (ص ۵۶)

[illegible] ابراہیم قطب شاہ کے [illegible] غلط [illegible]

(۱۱) "ابراہیم شہزادہ کی دل بستگی کے لیے چین وماچین، کرناٹک وگجرات کی حسینوں کو جمع کرتا ہے جو ایک باپ کے لئے زیب نہیں دیتا (کذا)"۔ (ص ۵۸)

یہ سچ ہے کہ بیٹے کی دل بستگی کے لیے حسینوں کو جمع کرنا ایک باپ کے لیے مناسب نہیں لیکن موصوف کو سمجھنا چاہئے کہ وجہی اخلاقیات کی کتاب نہیں لکھ رہا تھا، وہ تو ایک عاشقانہ قصہ بیان کر رہا تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابراہیم نے کن حالات میں ایسا کیا؟ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ اس کا نور نظر خواب کے معشوق کی تلاش میں سرگرداں نہ ہو جائے اس نے اس پریشانی سے بچنے کی خاطر یہ تدبیر اختیار کی تھی اور شاہی ماحول میں ایسی باتوں کو اخلاقیات کے ترازو پر نہیں تولا جاتا۔

(۱۲) "قلی قطب شاہ ایک کارٹون سے کم نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خواب کی معشوق کو اس زمین پر تلاش کرتا ہے"۔ (ص ۶۰)

خواب کی معشوقہ کو زمین پر تلاش کرنے سے قلی قطب شاہ 'کارٹون' نہیں معلوم ہوتا۔ یہ داستانوں کا عام رنگ ہے کہ اس کے کردار خواب میں جو دیکھتے ہیں وہ عموماً سچ ہوا کرتا ہے۔ داستانوں اور عاشقانہ مثنویوں سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ویسے بھی عشق جنون ہے اور جنون میں خلافِ عقل کام کرنا بعید از قیاس نہیں۔

(۱۳) "تصویر کو دیکھ کر ہی وہ قلی قطب شاہ کی منکوحہ بن جاتی ہے"۔ (ص ۶۶)

مشتری قطب شاہ کی تصویر دیکھ کر اس پر دل وجان سے فریفتہ ضرور ہوتی ہے لیکن بغیر نکاح کے منکوحہ بن جانا، یہ موصوف کے خیال کی جدت ہے۔

(۱۴) صفحہ اکیاسی بیاسی پر موصوف نے لکھا ہے کہ عشق وعاشقی کی راہ میں روڑے اٹکانے پر عاشق اپنے عزیز و مشیر تک کو غصے کا ہدف بناتا ہے اس لیے جب عطارد شہزادے کو بنگال کی مہم اور مشتری کے وصال سے باز رہنے کی ہدایت کرتا ہے تو شہزادہ اس پر برس پڑتا ہے۔ موصوف شہزادے کی خفگی سے متعلق سات اشعار درج کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ "اگرچہ یہاں شہزادے کا لب ولہجہ تند و تیز ہو گیا ہے، وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہے، ایسے موقع پر ایک آقا اپنے غلام کے ساتھ تلخ لہجہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ بعد میں شہزادہ کہتا ہے۔۔۔۔۔۔ "شہزادے کا یہ قول پانچ اشعار میں پیش کیا گیا ہے جن میں یہ دو اشعار بھی ہیں ؎

کمل پھول طالب ہے جو (کذا) سور کا   وہ محتاج نیں چاند کے نور کا

مجے اس سکیاں کا سو یو چھند نہ بھاوے (کذا)   سمندر کو امریت کیا کام آئے

موصوف کے لکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عطارد کو برا بھلا کہنے کے بعد یہ دونوں اشعار بھی شہزادے نے عطارد سے

کہے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں اشعار میں شہزادہ عطارد سے نہیں بلکہ اپنے والد سے مخاطب ہے اور یہ واقعہ عطارد کو ڈانٹنے سے کافی پہلے کا ہے۔

(۱۵) ''مثنوی کے آخر میں ملا وجہی نے وصال کا مکمل نقشہ پیش کیا ہے۔ جس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ یا تو یہ قطب شاہی دور کے بادشاہوں کے کرداری گراوٹ کا نتیجہ ہے (جس سے وجہی وابستہ تھا) یا خود وجہی کی ہوسناکی تھی جو اس بڑھاپے میں بھی اس طرح کے جذبات پیر قلم کرنے پر اسے مجبور کرتی ہے''۔ (ص ۸۹)

ادب میں اس طرح کی کوئی قید نہیں کہ شاعر کس عمر میں کس طرح کے جذبات نظم کرے گا۔ اس بحث سے قطع نظر موصوف یہ سمجھتے ہیں کہ وجہی نے بڑھاپے میں یہ مثنوی لکھی ہے۔ صفحہ ۱۰۴ پر بھی وہ اسے 'بوڑھا فنکار' کہتے ہیں۔ قطب مشتری کے متعلق یہ معلوم ہے کہ یہ ۱۰۱۸ھ (۱۶۰۹-۱۰ء) میں لکھی گئی اور وجہی کی پیدائش کے متعلق وہ تحریر فرما چکے ہیں کہ وہ ۱۵۶۶-۶۷ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۵۶۷ء کی پیدائش کے حساب سے مثنوی کی تکمیل کے وقت وجہی کی عمر ۴۲-۴۳ سال ہوتی ہے اور یہ عمر بڑھاپے کی نہیں کہی جا سکتی۔

(۱۶) ''وجہی پیکر تراشی کے فن سے قطعی نابلد تھا۔ مثنوی کی ساری فضا میں صرف دو کرداروں کے نقش و نگار ابھر کر سامنے آتے ہیں''۔ (ص ۹۹)

جب اتنے تیقن کے ساتھ یہ بات لکھ دی گئی کہ وجہی پیکر تراشی کے فن سے قطعی نابلد تھا تو پھر دو کرداروں کے نقش و نگار اُبھر کر کیسے سامنے آگئے؟

(۱۷) ''شہزادے کی شکل و شباہت کیسی ہے؟ اس کا تن و توش کیسا ہے؟ رنگت کیسی ہے؟ عادات و خصائل کیسے ہیں؟ لباس و معاشرت کیسی ہے؟ پوری مثنوی میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں''۔ (ص ۱۰۳)

وجہی نے مشتری کی سراپا نگاری میں تفصیل سے اور شہزادہ قطب کی پیکر تراشی میں اجمال سے کام لیا ہے۔ عطارد نے مشتری کا محل آراستہ کیا تو مختلف مناظر کے درمیان ایک چوکے میں قطب شاہ کی تصویر بھی بنا دی۔ جب مشتری محل کی آرایش دیکھنے کو آئی اور شہزادے کی تصویر دیکھ کر عطارد سے اس کے متعلق دریافت کیا تو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عطارد نے شہزادے کی جو خوبیاں بیان کیں اس سے اس کے حسن اور شکل و شباہت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

جھلکچھ نور شہ مکھ چندر میں اہے	نہ جن نا پری نا بشر میں اہے
----------------	----------------
لگا عشق لاک استریاں دھات دھات	دیوانیاں ہوں پھرتیاں ہیں اس کے سنگات
جہاں پانو دھر شاہ چلتا اہے	وہاں آب زمزم ابلتا اہے
----------------	----------------

وو ایسا ہے شہ جان سن اے سندر	سکی ما بھلے کی اسے دیکھ کر
صورت اس کی اس دھات اچھے خوب جب	جو توں دیک اسے بھولی تو کیا عجب
جو شہ باغ میں ٹک تماشے کو جائیں	تو بن رات جھاڑاں پھلاں بار لیایں
شہنشہ کے دیدار کے نور تھے	سکے جھاڑ ہرے ہویں بھی سیر تھے

(قطب مشتری-مکتبۂ رفاہِ عام،گلبرگہ ۱۹۹۰ء،ص ۱۲۲)

جہاں تک شہزادے کے عادات واطوار اور اس کی معاشرت کا تعلق ہے، اس کی جھلکیاں پوری مثنوی میں جا بجا نظر آتی ہیں۔شہزادے کا کردار ایک عاشق کا ہے اور عشق کا جو روایتی تصور رہا ہے وہ اس کردار میں بھی موجود ہے۔ مثالوں کی ضرورت نہیں۔یہی حال معاشرت کا بھی ہے۔شاہانہ ماحول، نوکر چاکر، دوست احباب، بزمِ عیش وطرب، پری پیکروں کے جم گھٹے، ماہرین علم وفن کا مجمع وغیرہ سے ظاہر ہے کہ شہزادہ کس معاشرے کا رہنے والا ہے۔ اس لیے موصوف کا اعتراض صداقت نہیں رکھتا۔

(۱۸) ''ادب تاریخ وفلسفہ سے زیادہ معتبر ومفید ثابت ہوتا ہے''۔(ص ۱۰۵)

ادب تاریخ وفلسفہ سے زیادہ مفید ہے یا نہیں، یہ ایک علاحدہ بحث کا موضوع ہے لیکن ادب تاریخ سے زیادہ معتبر ہے، اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ ادبیات میں مبالغے کا عمل دخل ہوتا ہے جب کہ تاریخ نگاری اس سے مبرّا ہے۔ایسی صورت میں ادب تاریخ سے زیادہ معتبر کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟

(۱۹) ''ابراہیم کے دربار سے فارسی شعرا کے ساتھ اردو کے شعرائے کرام بھی منسلک رہے ہیں جن میں محمود اور فیروز کا نام قابلِ ذکر ہے''۔ (ص ۱۰۶)

محمود اور فیروز قطب شاہی دور سے تعلق رکھتے تھے اور وہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں دادِ سخن بھی دے رہے تھے لیکن ان دونوں کا تعلق ابراہیم قطب شاہ کے دربار سے تھا، اس کا ثبوت دستیاب نہیں ہے۔ موصوف کو چاہئے تھا کہ انھوں نے جب یہ بات لکھی تو اس کا حوالہ بھی دیتے۔

(۲۰) ''وجہی کے پاس اردو مثنوی کا کوئی نمونہ نہیں تھا''۔ (ص ۱۰۹)

قطب مشتری کی تصنیف سے پہلے وجہی کی نظروں سے اردو مثنوی کا کوئی نمونہ نہیں گزرا تھا ایسا کہنا مشکل ہے کیوں کہ قطب مشتری سے قبل نظامی کی ''کدم راؤ پدم راؤ''، شاہ میراں جی کی ''خوش نامہ''، ''خوش نغز'' اور ''مغز مرغوب''، سید شاہ اشرف بیابانی کی ''نوسرہار''، خوب محمد چشتی کی ''خوب ترنگ''، برہان الدین جانم کی ''منفعت الایمان''، ''حجت البقا'' اور ''ارشاد نامہ''، عبدل کی ''ابراہیم نامہ'' اور احمد گجراتی کی ''یوسف زلیخا'' جیسی مثنویاں لکھی جا چکی تھیں۔ قطب مشتری میں وجہی اپنے پیش رو فیروز کو جن الفاظ میں یاد کرتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ اس کے کمالِ فن کا

قائل تھا۔ فیروز نے جو مثنوی "پرت نامہ" کے عنوان سے لکھی ہے امید اغلب ہے کہ اسے وجہی نے دیکھا ہوگا۔

(۲۱) ''مثنوی کے آخری باب کا مطالعہ اس بات کا غماز ہے کہ جنسی و شہوانی امور میں محمد قلی قطب شاہ کافی کمزور کردار کا تھا''۔ (ص ۱۰۸)

جنسی و شہوانی امور میں محمد قلی قطب شاہ کمزور کردار کا مالک نہیں تھا۔ اس کا ثبوت اس وقت ملتا ہے جب مشتری سے اس کی پہلی ملاقات ہوتی ہے۔ قطب شاہ نے بوس و کنار کی حدیں پھلانگ کر جب آگے بڑھنے کی کوشش کی تو عطارد نے اسے روکا۔ عطارد کے سمجھانے کا شہزادے پر خاطر خواہ اثر ہوا اور ۔

جو سمجا کہ شہ کوں کمیا دھات دھات　　　سنیا شاہ آخر عطارد کی بات

اگر وہ کمزور کردار کا مالک ہوتا تو جس کے وصال کے لیے وہ ایک مدت سے تڑپ رہا تھا اس کے ساتھ سب کچھ کر گزرنے سے اسے کون روک سکتا تھا؟ اس طرح کا ایک اور موقع وہاں آتا ہے جب وہ مہتاب پری سے ملتا ہے۔ اگر وہ بدکردار ہوتا تو مہتاب کو دامِ تزویر میں پھنسا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ۔

پری تو پھر آئی تھی ملنے کو خیال　　　ولے شہ رکھے واں اپس کوں سنبھال

'قطب مشتری' کے آخری باب میں موصوف نے شاید درج ذیل اشعار کو غور سے نہیں دیکھا یا پھر وہ ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے ۔

ملے قطب ہور مشتری ایک ٹھار　　　ہوا آج جگ میں انند بے شمار

سو جبریل قاضی ہو واں آے کر　　　فرشتیاں کوں مہمان سب لیاے کر

بندیا مہر اس نار نادان کا　　　سو حاصل زمین ہور اسمان کا

جب قطب شاہ کا نکاح مشتری سے ہو چکا اور وہ حجلۂ عروسی میں وصال کے مزے لوٹ رہا ہے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ کیا شبِ زفاف میں بھی موصوف میاں بیوی کو مصلے پر دیکھنا چاہتے ہیں؟

(۲۲) ''مثنوی قطب مشتری کا ہر دوسرا شعر نادر تشبیہات و استعارات سے معمور ہے''۔ (ص ۱۱۷)

یہ دعوا سراسر لغو ہے۔ اگر موصوف کو اپنی بات پر اصرار ہو تو وہ کہیں سے بھی دس اشعار نقل کر کے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کریں۔

(۲۳) ''اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جسمانی اور جنسی قوتوں کا بیان وجہی نے رمز و کنایے میں پیش کیا ہے۔ اس طرح کی باتوں کو رمز و کنایے میں پیش کرنا مثنوی نگاری کا ایک اہم وصف ہے''۔ (ص ۱۳)

رمز و کنایے کے پردے میں جسمانی اور جنسی قوتوں کے بیان کو اس مثنوی کا سب سے اہم وصف قرار دینا تنقیدی اعتبار سے ذہنی کمزوری کو اجاگر کرتا ہے۔ ویسے بھی وجہی نے آخری باب میں وصال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اشارے کنایے میں

ہے مگر جب وہ ''بچھاتا ہوا گھا نگرا گھول سب'' تک جا پہنچا ہے تو رمز و کنایے کا سارا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔

(۲۴) ''اردو کے کلاسیکی ادب میں جتنی عشقیہ اور بزمیہ مثنویاں تحریر کی گئی ہیں ان میں قطب مشتری کی روایت کو ملحوظ رکھا گیا ہے''۔ (ص ۱۳۷)

یہ دعوا محض ذہنی فریب ہے۔ وجہی سے کہیں زیادہ اس کے معاصر غواصی سے مثنوی نگاروں نے فیض اٹھایا ہے اور اس کا برملا اعتراف بھی کیا ہے۔ ایسے شاعروں میں مقیمی، نصرتی، غوثی بیجاپوری، عشرتی اور حسینی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

(۲۵) ''غواصی نے کوئی طبع زاد مثنوی نہیں لکھی۔ اس کی دونوں مثنویاں فارسی اور سنسکرت سے ترجمہ ہیں''۔ (ص ۱۳۸)

اس سے قبل وہ ص ۱۲۰ پر لکھ چکے ہیں کہ ''غواصی نے تین مثنویاں تحریر کیں۔ سیف الملک و بدیع الجمال، طوطی نامہ اور چندا اور لورک''۔ صحیح یہ ہے کہ غواصی نے تین مثنویاں لکھیں۔ 'سیف الملک.....' درست نام نہیں ہے 'سیف الملوک'' ہونا چاہئے۔ 'چندا اور لورک' کا اصل نام 'مینا ستونتی'' ہے۔

(۲۶) ''نسیم نے محض دو اشعار میں حمد، نعت اور منقبت کا حق ادا کر دیا ہے''۔ (ص ۱۳۸)

موصوف کا اشارہ 'گلزار نسیم'' کے ان اشعار کی جانب ہے ؎

حمدِ حق و مدحتِ پیمبر — کرتا ہے یہ دو زباں سے اکثر

یعنی کہ مطیعِ پنجتن ہے — پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے

نسیم نے یہاں کمالِ اختصار کو راہ دی ہے لیکن یہ لکھنا کہ اس سے حمد، نعت اور منقبت کا حق ادا ہو گیا ہے، الفاظ کا بے جا استعمال کرنا ہے۔

(۲۷) ''ص ۱۲۲ اور ۱۲۶ پر وجدی کی مثنوی نام ''پنچھی باچھا'' لکھا ہے جب کہ صحیح نام ''پنچھی باچھا'' ہے۔

(۲۸) ''ولی...... کی نہایت مشہور مثنوی 'در تعریف شہر سورت' ہے''۔ (ص ۱۲۲)

موصوف کے علاوہ شاید ہی کسی اور نے اسے 'نہایت مشہور' لکھا ہو۔ یہ کوئی ایسی قابلِ ذکر مثنوی نہیں ہے۔

(۲۹) ''دورِ جدید میں مختصر مثنویاں زیادہ لکھی جانے لگیں۔ حاتم نے 'حقہ' اور 'قہوے' کے نام سے دو مختصر مثنویاں لکھیں۔ آبرو نے 'آرائش معشوق'۔ فائز نے 'بیان میلہ بہتہ' اور 'تعریف نہان نگمنود' جیسی چھوٹی مثنویاں لکھیں'' (ص ۱۲۲)۔

موصوف کو بتانا چاہئے کہ انھوں نے حاتم اور آبرو کے دور کو کس بنیاد پر ''دورِ جدید'' لکھا ہے۔ فائز کی ثانی الذکر مثنوی کا صحیح نام 'تعریف نہان نگمبوذ' ہے۔

(۳۰) ''ولی ویلوری نے 'روضۃ الشہدا' لکھی اور ملا حسین واعظ کاشفی نے 'دہ مجلس''۔ (ص ۱۲۷)

ملا حسین واعظ کاشفی کو اردو شاعر قرار دینا اور 'دہ مجلس' کو اردو مثنوی سمجھ کر کاشفی کی ذات سے اسے منسوب کرنا بہت بڑا دعوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کاشفی اردو زبان کا ادیب نہیں اور نہ 'دہ مجلس' اس کی کوئی کتاب ہے۔ وہ سلطان حسین کے عہد کا مشہور عالم ہے جس نے 'اخلاقِ محسنی'، 'اخلاق جلالی' اور 'روضۃ الشہدا' جیسی کتابیں لکھیں۔ یہ تمام کتابیں فارسی نثر میں ہیں۔ فضلی نے 'روضۃ الشہدا' کا ترجمہ 'کربل کتھا' کے نام سے نثر میں کیا تھا۔ ولی ویلوری نے اسے 'روضۃ الشہدا' ہی کے نام سے شعری جامہ پہنایا تھا۔

(۳۱) ''میر حسن کی دو اور مثنویاں (سحر البیان کے علاوہ) 'گلزارِ ارم' اور 'رموز العارفین' ہیں''۔ (ص ۱۲۸)۔

کلیاتِ میر حسن کے مختلف نسخوں میں طویل مختصر گیارہ مثنویاں پائی جاتی ہیں، سحر البیان ان کے علاوہ ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فضل الحق کا مقالہ ''میر حسن دہلوی کی غیر معروف مثنویاں'' ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ('اردو ادب' علی گڑھ شمارہ ۲، ۱۹۶۵ء) گیارہ مثنویوں کو ڈاکٹر وحید قریشی نے مثنویات حسن کے نام سے ایک جلد میں شائع کیا ہے۔ ناشر مجلسِ ترقیِ ادب لاہور۔ سال طبع ۱۹۶۶ء (بحوالہ سحر البیان، مرتبہ رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲)۔

(۳۲) ''راسخ کی ایک مثنوی کا نام 'جذبہ عشق' تحریر کیا ہے''۔ (ص ۱۲۸)

صحیح نام 'جذب عشق' ہے''۔

(۳۳) ''خواجہ حیدر بخش آتش کے شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیم نے 'گلزار نسیم' کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔ اس مثنوی کی کہانی طبع زاد نہیں ہے بلکہ نہال چند لاہوری کی مثنوی 'مذہب عشق' کا چربہ ہے''۔ (ص ۱۲۸)

افسوس کا مقام ہے کہ موصوف کو آتش جیسے شاعر کا صحیح نام تک معلوم نہیں۔ ان کا نام خواجہ حیدر بخش نہیں بلکہ خواجہ حیدر علی ہے۔ حیدر بخش حیدری معروف مصنف ہیں جن کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے تھا۔ نہال چند لاہوری کی تصنیف ''مذہب عشق'' کو مثنوی کہنا حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نثر میں ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اپنی تصنیف ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات'' میں (ص ۲۴۴-۴۵) اس کے اقتباسات بھی درج کیے ہیں۔

(۳۴) ''سلطنت لکھنؤ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ اختر نے بھی کئی مثنویاں لکھیں۔ واجد علی شاہ کی طفلی اور جوانی دونوں نازنینوں کے آنچل تلے گزری۔ وہ عیش و عشرت کے دلدادہ تھے۔ اپنی مثنویوں کے نام بھی اسی مناسبت سے رکھے جیسے 'دریائے عشق'، 'بحر المحبت'، 'حزن اختر' اور 'خاقان سرور'''۔ (ص ۱۲۹)

''دریائے عشق'' اور ''بحر المحبت'' کو واجد علی شاہ سے کوئی نسبت نہیں۔ اول الذکر میر کی اور ثانی الذکر مصحفی کی

مثنوی ہے۔ واجد علی شاہ نے بقول سید مسعود حسن رضوی ادیب نو مثنویاں لکھیں جن کے نام یوں ہیں: (۱) حزن اختر (۲) ثبات القلوب (۳) بیت حیدری (۴) عشق نامہ (۵) مثنوی بحر مختلف (۶) مثنوی بے نام (مثنوی گنا) (۷) افسانہ عشق (۸) دریائے تعشق (۹) بحر الفت۔

ان نو میں سے آخری تین مثنویاں ہی عاشقانہ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ''حزن اختر'' سے عیش و عشرت کا کون سا پہلو جھلکتا ہے۔ شاید موصوف ''حزن'' کے معنی سے واقف نہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے وقت جب واجد علی شاہ فورٹ ولیم کالج میں نظر بند کر دیے گئے اور اس مدت میں انھیں جو اذیتیں پہنچیں، انھیں کا بیان اس مثنوی میں کیا گیا ہے۔

''خاقان سرور'' سے متعلق مسعود صاحب کی یہ عبارت نقل کر دینا کافی ہے:

> ''یہ مثنوی واجد علی شاہ کی تصنیف قرار دی گئی ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک کم علم اور بد سلیقہ شخص خواجہ محمد ولی جان عاصی نے مثنوی 'عشق نامہ' سے ادھر ادھر کی چند داستانیں لے کر ان کا بے ربط مجموعہ جو صرف چار سو اکہتر شعروں پر مشتمل ہے، 'مثنوی خاقان سرور' کے بے ڈھنگے نام سے مطبع گلشن فیض لکھنؤ میں چھپوا کر ۱۳۱۷ھ میں شائع کر دیا''۔ (سلطان عالم واجد علی شاہ، اشاعت ۱۹۷۷ء، ص ۱۹۳)

(۳۵) ''اردو کی ابتدائی مثنویاں جن میں سے زیادہ تر صوفیائے کرام (کذا) کے ملفوظات سے دستیاب ہوئی ہیں، چیدہ چیدہ اشعار پر مشتمل ہیں''۔ (ص ۱۲۵)

موصوف لفظ 'چیدہ' کے معنی سے واقف نہیں۔ وہ اسے 'چند' یا 'مختصر' کا مترادف سمجھتے ہیں۔ 'چیدہ' مصدر چیدن کا اسم مفعول ہے جس کے معنی 'چنا ہوا' یا 'منتخب' کے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس لفظ کو جن معنوں میں استعمال کیا ہے وہ غلط محض ہے۔

موصوف کے یہاں واحد، جمع، جنس اور املا کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً وہ الم کی جمع آلام نہیں 'الائم' لکھتے ہیں (ص ۵۱)، 'بارگاہ' (ص ۵۸) اور 'نوک پلک' کو مذکر تحریر کیا ہے جب کہ 'لالچ' (ص ۷۸، ۱۰۴) ان کے خیال میں مونث ہے۔ وہ مرقعہ کو 'مرقع' (ص ۴۰) لکھنے سے نہیں ہچکچاتے۔

قطب مشتری میں موصوف کی تضاد بیانی کے نمونے بھی جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ شاید وہ اس سے آگاہ نہیں۔ 'ہاں' اور 'نہیں' کی اس کیفیت نے ان کی ذہنی تذبذب کو نمایاں کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہاں	نہیں
(۱) مثنوی کے مطالعہ سے قلی قطب شاہ کی تعیش	(۱) مثنوی قطب مشتری میں اس وقت کی

پسندی اور اس کے دور کے حالات و کوائف اور معاشرت و تمدن ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ (ص ۱۲-۱۳)	تہذیب، ثقافت اور معاشرت کی جلوہ گری نہیں ملتی۔ (ص ۱۴۱)
(۲) مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی نے مثنوی کے فن کے سلسلے میں جن شرائط سے بحث کی ہے ان پر لگ بھگ قطب مشتری پوری اترتی ہے۔ (ص ۳۰)	(۲) مولانا الطاف حسین حالی کے وضع کردہ اصول پر جب ہم مثنوی قطب مشتری کو پرکھتے ہیں تو چند ہی اصولوں پر مثنوی پوری اتر پاتی ہے۔ (ص ۲۲)
(۳) تنقیدی، تکنیکی اور فنی اعتبار سے مثنوی قطب مشتری وجہی کا شاہکار ہے۔ ہم فنی طور پر اسے ایک بلند پایہ مثنوی قرار دیں گے۔ (ص ۳۱)	(۳) مثنوی کی حیثیت سے تو قطب مشتری ایک اوسط درجے کی تخلیق ہے۔ (ص ۱۱۳)
(۴) مثنوی کے تمام اشعار آپس میں تسبیح کے دانے کی طرح پروئے گئے ہیں (ص ۲۳)........ قطب مشتری کے اشعار میں ربط و تسلسل ہے۔ اس کا ہر شعر دوسرے شعر سے اس طرح مربوط ہے جیسے زنجیر کی کڑیاں۔ (ص ۱۱۴)	(۴) درمیان میں ایک ضمنی قصہ بھی آتا ہے جس کو اگر مثنوی سے خارج کر دیا جائے تب بھی اصل قصہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (ص ۲۹)
(۵) جزئیات نگاری کی وجہ سے ہر منظر اور واقعہ آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے۔ (ص ۲۳) .... منظر نگاری میں وجہی کامیاب ہے۔ (ص ۱۴۱)	(۵) ملا وجہی بہ حیثیت منظر نگار بہت ہی کمزور ہیں (ص ۹۳)..... مناظر کا حسین مرقع ناپید ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مناظر فطرت اور ماحول عکاسی وجہی کے بس کی بات نہ تھی۔ (ص ۹۵)

موصوف نے ایک مذموم حرکت یہ کی ہے کہ دوسرے کے بیانات کو کہیں من و عن اور کہیں الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ بغیر حوالے کے اپنا لیا ہے جسے سرقے کے سوا کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔ صرف ایک مثال پیشِ خدمت ہے:

وہاب اشرفی	ابو البرکات
قصہ کہتے ہوئے وجہی پند و نصائح کے دفتر کھول دیتا ہے...... کہانی جگہ جگہ ٹوٹ کر رہ گئی ہے...... بعض مکالمے ایسے ہی حالات کی پیداوار ہیں۔ یہ مکالمے بذاتِ خود دلچسپ اور قیمتی ہیں لیکن ماجرا نگاری کے مرحلے میں یہ نمایاں نقص بن گئے ہیں اور کہانی کے ربط و تسلسل پر ناگوار اثر ڈالتے ہیں...... وجہی نے طوالت سے کام لیا ہے جس سے پلاٹ مجروح ہو گیا ہے۔ (قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی۔ اشاعت ۱۹۷۷ء، ص ۹۴)	ملا وجہی نے قطب مشتری میں پند و نصائح کا دفتر کھول دیا ہے...... کہانی جگہ جگہ ٹوٹ کر رہ گئی ہے...... بعض مکالمے ایسے ہی حالات کے پیداوار (کذا) ہیں۔ یہ مکالمے قیمتی اور دلچسپ بھی ہیں لیکن ماجرا نگاری کے نقطۂ نظر سے نمایاں نقص بن جاتے ہیں جس سے کہانی کے ربط و تسلسل پر بہت ہی برا اثر پڑتا ہے۔ وجہی کے مکالمے کی بے جا طوالت سے قطب مشتری کا پلاٹ مجروح ہو گیا ہے۔ (ص ۵۲)۔

کتابیات کی فہرست بھی سائنٹفک نہیں ہے۔ فہرست میں نمبر پندرہ کے تحت 'سب رس' کا نام درج ہے جس سے واضح ہے کہ موصوف نے اس کا براہِ راست مطالعہ کیا ہے لیکن متن میں تمام جگہوں پر اس کا ذکر ثانوی حوالے کے طور پر ہے بعض کتابوں کے حوالے ادھورے ہیں جنھیں بہ آسانی پورا کیا جا سکتا تھا۔

کتاب کے آخر میں جو فرہنگ ہے وہ بھی اسقام سے خالی نہیں۔ حروف تہجی کا خیال نہ رکھتے ہوئے موصوف نے الفاظ کی جو ترتیب قائم کی ہے وہ اصولِ فرہنگ کے منافی ہے۔ الفاظ کے جو معنی درج کیے گئے ہیں ان میں بھی کئی خامیاں ہیں۔ کئی جگہ مصدر کے بدلے ماضی مطلق کا اندراج ملتا ہے۔ 'رُس' کا مطلب 'روٹھنا' لکھا گیا ہے جب کہ یہاں 'رُسنا' ہونا چاہیے۔ 'کانداں' کا مطلب 'دیوار' تحریر کیا ہے۔ کانداں جمع ہے کاند کی۔ اس لیے 'کاند' کا اندراج ہی درست ہے۔ 'وخت' کا مطلب 'وقعت' درج ہے۔ یہ فاحش غلطی ہے۔ یہاں 'وقت' ہونا چاہیے۔ ''لیانہار'' اور ''ہون ہار'' کا مطلب بالترتیب یوں لکھا ہے ''لیانے والا'' اور ''ہونہار''۔ یہ دونوں درست نہیں۔ ان کے بدلے ہونا چاہیے ''لانے والا'' اور ''ہونے والا''۔ فرہنگ میں لفظ 'اولک' اور 'اپچے' کا اندراج بھی ہے لیکن ان کے معانی تحریر نہیں کیے گئے ہیں۔

جہاں تک موصوف کے تنقیدی بیانات کا تعلق ہے ان میں اکثر مقامات پر مضحکہ خیزی اور غرابتِ خیال نمایاں ہے۔ وہ غیر متعلق باتیں بھی کثرت سے لکھتے ہیں۔ ان کی تضاد بیانی نے ان کے تنقیدی بیانات کو مجروح اور بے وقعت کر دیا ہے۔ قطب مشتری کی فنی قدر و قیمت متعین کرنے سے وہ قاصر ہیں۔ وہ دعوے تو کر بیٹھتے ہیں لیکن اسے

ثابت کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ "اردو مثنویوں میں قطب مشتری کا مقام" اور "تاریخی اور ادبی اہمیت" کے تحت انھوں نے جو کچھ دعوے کیے ہیں وہ کھوکھلے ہیں۔ وہ گمان کے دائرے میں ہی چکر کھاتے ہیں، یقین کی سرحد میں داخل نہیں ہوتے۔ انھوں نے ایک ایسے کام کا بیڑا اٹھایا جو ان کے بس کا نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے ہر گام پر ٹھوکریں کھائیں۔ "قطب مشتری" پر ان سے قبل جو کچھ لکھا جا چکا تھا اس پر وہ کسی قسم کا اضافہ نہیں کر سکے۔ فکری اعتبار سے تہی دامن ہونے کے سبب وہ سرقے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ قلت مطالعہ اور تحقیقی شعور کی کمی کی وجہ سے وہ کثرت سے تحقیقی غلطیاں کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ فارسی کو اردو اور نثری کتابوں کو شعری تصنیف سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ان بیانات کی روشنی میں یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب جس نیک مقصد کے تحت لکھی گئی تھی اس میں قطعی طور پر ناکام ہے۔ یہ اپنے قارئین کو فیضیاب کم، گمراہ زیادہ کرتی ہے۔ •••

سید حسن عباس

میزان الصرف — ایک اہم مخطوطہ

احمد آباد میں ۱۴-۱۶؍ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو عہد وسطیٰ میں گجرات کی علمی، ادبی خدمات، پر درگاہ پیر محمد شاہ لائبریری اور ریسرچ سنٹر میں ایک سہ روزہ قومی سیمینار منعقد ہوا تھا جس میں راقم السطور نے بھی شرکت کی تھی۔ سیمینار کے بعد درگاہ کی لائبریری اور اس کے مخطوطات دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ اس لائبریری کے اردو، فارسی اور عربی مخطوطات کی چھ جلدیں طبع ہو چکی ہیں اور ساتویں جلد بھی تیار ہو چکی ہے جس کے نصف حصے پر راقم سطور نے نظر ثانی بھی کی۔ امید ہے یہ جلد بھی دیگر جلدوں کی طرح شائع ہو جائے گی۔ جہاں اور بہت سے نوادرات دیکھے وہیں اس لائبریری میں عظیم آباد سے تعلق رکھنے والے جمال الدین حسین ابن سید نور اللہ کی ایک فارسی تالیف 'میزان فارسی' کا مخطوطہ بھی دیکھنے میں آیا۔ غالباً یہ واحد مخطوطہ ہے۔ اس کا اندراج درگاہ کی فہرست مخطوطات جلد ۲۲۸/۶ پر بھی موجود ہے۔

یہ مخطوطہ ایک مجموعہ میں مجلد ہے جس میں اس کے علاوہ تین اور رسالے ایک ساتھ مجلد ہیں، یہ مجموعہ کا پہلا رسالہ ہے۔ اس کا نمبر ۱۸۵۸ ہے۔ سنہ تالیف ۱۱۶۴ھ/۵۱-۱۷۵۰ء ہے۔ خط نستعلیق، کاتب کا نام عبدالقادر، مقام کتابت کانپور، نیز تاریخ کتابت ۳۰؍ ربیع الآخر ۱۲۰۸ھ/ ۹۳-۱۷۹۲ء ہے۔ رسالہ ۷۳ اوراق پر مشتمل ہے جبکہ ہر صفحہ ۱۷ سطری ہے۔ کتاب کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، فارسی قواعد ہے۔ اس میں پانچ مقدمات ہیں اور ۲۸ اوزان ہیں۔ ۲۳ ویں وزن پانچ جلووں میں تقسیم کیا گیا ہے جب کہ ۲۶ ویں وزن کو چار قانون میں بانٹا گیا ہے اور ۲۸ ویں وزن کو مختلف بخش میں۔ درگاہ کی فہرست میں مقام کتاب عظیم آباد غلط لکھا گیا ہے۔ اسی طرح کاتب نے سنہ تصنیف ۱۱۰۶ھ غلط لکھا ہے۔ مصنف نے دیباچہ میں ۱۱۶۴ھ لکھا ہے اور یہی درست ہے۔

آغاز: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ چنین می گوید اضعف العباد الراجی برحمت ربہ الباری فی الدارین جمال الدین حسین ابن نور اللہ غفر اللہ لہ ولوالدیہ واحسن الیہما واللہ کہ پلہ ترازوی فہم نکتہ سنجان صاحب تمیز.....

انجام: الٰہی از تو ہیم امید بود آغاز کہ تا زبرکت حمد تو باید این انجام ہزار شکر کہ داوی مراد وی خواہم کہ شد بفضل تو اتمام این خجستہ کلام کنون امید چنانست کز فواید آن

جملہ خلق رسانی حلاوتی درکام بودند تاجہان اہل علم درس آموز زمانہ تاسواد ومداد گیرد کام سواد این ھمہ شان رلبار دیدہ بار چو نور مدار این بہ بیاض کتاب باد مدام کہ ھر کہ خواند ازین نسخہ ودر رسد مر اد جمال الدین رابہ دعایاد آرد از اتمام۔

ترقیمہ : تمام شد نسخہ میزان فارسی من تصنیف میر جمال الدین حسین ساکن عظیم آباد بتاریخ چہارم شہر ربیع الاول (تالیف) شدہ در ۱۰۶ اوبدست فقیر حقیر عاصی پُر تقصیر اضعف العباد باسم عبد القادر در مکان .... کانپور فارغ ۳۰ شہر رجب المرجب ۲۰۸ ا یوم جمعہ ......

مصنف شاعر بھی تھا۔ اس نے فارسی زبان کی قواعد اور اس کی جزئیات کا بہت عمدہ بیان کیا ہے۔ مثال میں قدما اور متاخرین کے بے شمار اشعار بھی سند کے طور پر پیش کیے ہیں۔ مصنف دیباچہ میں لکھتا ہے کہ کسی نے 'میزان فارسی' کے نام سے فارسی قواعد میں ایک کتاب لکھی تھی لیکن چوں کہ اس نے صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا تھا اس لیے اسی نام سے مصنف نے یہ کتاب لکھی۔ اس کا دیباچہ اور ابواب کی فہرست پیش کی جارہی ہے۔ مصنف کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں اور یہ کہ اس کے علاوہ اس کی کوئی اور تصنیف ہے یا نہیں معلوم نہیں۔

○○○

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چنیں می گوید اضعف العباد الراجی برحمت ربہ الباری فی دارین جمال الدین حسین ابن سید نور اللہ غفر اللہ لہ ولوالدیہ واحسن الیہما واللہ کہ پلہ ترازوی فہم سنجان صاحب تمیز و تہہ معیار وھم صیرفیان درست پیش نزد در خریطہ خیال متمیز ان بدرہ وفقیر یعنی میان کیسہ 'السنہ دلالان ھمہ چیز ہر جو ھر را رنگی وسنگی وہر سخن را قدری ووزنی مقرر است کہ بہ میزان ہر یک سنگینی واسنگی آنہا معلوم می شود از آنجملہ بہترین جواھر، گوہر نطق است کہ بآن ممتاز است انسان وحیوان و ھر دو بود یکساں، پس ضرور است برای این گوھر میزان، تا سنجیدہ شود بآن دُرر غرر ہر زبان و از آنجا کہ در این شہر ھندوستان محاورہ زبان فارسی رانیک پسند دارند لہذا شخصی رسالہ ای در این باب نگاشتہ "میزان فارسی" نام گذاشتہ بود، چون میزانش سنگی وپاسنگی نداشت کہ از آن جواہر ات زواہر ات فارسیہ ارزیدہ شود، بنابر تسوید این اوراق پرداختم و میزانی موسوم بہ اسم مرقوم محتوی بہ پنج مقدمہ متضمن بر بیست وسہ بخش، بیست وہشت وزن، لمولفہ

ہزار شکر خدای را کہ این خجستہ کلام	چو عقد گوھر شہوار یافت حسن نظام
محمد حضرت باری چو کردمش آغاز	زبان سعد گرفت از عنایتش انجام

ہزار و یکصد و شصت و چہار کسری بود	زسال ہجرت خیر الانام رحمت عام
بہ شہر روح فزا بلدہ عظیم آباد	کہ ہست مردم چشم سواد ہند تمام
چہ شہر طرف شمال آب گنگ دارد موج	جنوب طرف نگر جوش رود جلد نام (کذا)
حوالیش ہمہ جندق رات (کذا) مالامال	سواد ہر طرفش باغ و تال و جامن عام
زہر دیار کہ اتجار سید سیاحی	نمود سجدہ خدا را البشر کرد مقام
ہر آنچہ ہست بروی زمین ہفت اقلیم	چہ پوشش و چہ فروش و چہ میوہ و چہ طعام
چہ از ظروف اگر زر یکسرات داری	برو نخر کہ دریں شہر ہست آتمہ نام
چہار سال ازین پیشتر ز احل اللہ	مدینہ بود کنونش فرنگ کرد ایام
مگر ز صاحب عصرم جمال ہست نظر	بروز مصقلہ تیغ رنگ ظلم ظلام
خدا کند کہ ببینم جمال مولانا	برین دعا است بروح نبی و آل سلام

☆☆☆

فہرست مطالب

وزن هفتم : از آئین نهم فرهنگ مرقوم۔ دربیان حروف وکلماتیکه باواخر اسماوافعال جهت حصول معانی در آرند۔
وزن هشتم : از آئین دهم فرهنگ مرقوم دربیان آوردن حروف مفرده که اواحل واو آخر کلمات بیاورند جهت دریافت معانی مختلف۔
وزن نهم : بدانکه هر گاه دو کلمه بگونه ای که یکی صفت باشد ودوم موصوف۔
وزن دهم : بدانکه در هر کلمه اول آن الف ممدوده باشد۔
وزن یازدهم : از فرهنگ مرقوم نقل نموده باشد۔ بدانکه در فارسی هر گاه دو کلمه رابا هم آرند۔
وزن دوازدهم : دراوغام وحذف قلب حرفی بحرفی دیگر راگر در نوشتن باشد در خواندن یاقلب وحذف هم در نوشتن وهم در خواندن از آئین فرهنگ مرقوم نوشته شد۔
وزن سیزدهم : بدانکه هر جا آخر اسم باو قبل ازو الف باشد...
وزن چهاردهم : بدانکه در اسماء عجم اگر سر اسم حرف باباشد...
وزن پانزدهم : بدانکه در اسمای فارسی آخر اسم هاباشد یابعد از وبای هم باشد۔
وزن شانزدهم : بدانکه هر چیز در هر ملک که اصلش از آنجاباشد ونامش بزبان دیگر نباشد اگر شاعر گوید ونام آن چیز را درزبانی که هست بیارد، درست است۔
وزن هفدهم : در تفریق دال وذال، دال غیر منقوطه وذال بانقطه ودال عجمی گوید۔
وزن هیزدهم : بدانکه در فارسی تثنیه وجمع بیک طورمی آیدومراسم واحدرابدوطریق جمع می خوانند۔
وزن نوزدهم : بدانکه درزمین عرب وهند چون باکسی سخن گوی در خطاب تفاوت مردوزن معلوم می شودودر خطاب فارسی تفاوت مردوزن هرگزنیست۔
وزن بیستم : بدانکه درزبان فارسی بساالفاظ است که به معنی مستضادمی آید۔
وزن بیست ویکم: بدانکه درزبان عرب هر اسم انسان راکه جمع کنند آخر اسم رابرای جمع الف ونون می افزایند یایای تحتانی ونون می آیدوبرای تثنیه آخر اسمارالف ونون می دهند بخلاف فارسیان۔
وزن بیست ودوم: دربیان تفریق میان اسما وافعال۔
وزن بیست وسوم: بیان تفریق صیغه احتمالی — دراین پنج جلوه است۔
جلوه اول : هر چیز وبر حرکت رالامی مقرر است۔
جلوه دوم : دربیان ترکیب صیغه ماضی۔
جلوه سیوم : دربیان ترکیب صیغه مستقبل۔

جلوہ چہارم	:	دربیان ترکیب صیغۂ حال۔
جلوہ پنجم	:	دربیان ترکیب صیغہ امر و نہی۔
وزن بیست و چہارم	:	از آمین فرہنگ مرقوم دربیان تبدیل حروف واسمای مصدری درساختن صیغہ حال وامر ونہی۔
وزن بیست و پنجم	:	بیان صیغہ ہای افعال متفاوت اوقات — درچہار بیان!
بیان اول	:	بدانکہ صیغۂ ماضی بر سہ گونہ است۔
بیان دوم	:	بدانکہ صیغۂ مستقبل نیز بدو طریق است۔
بیان سوم	:	بدانکہ صیغۂ حال ہم بر دو گونہ می آید۔
بیان چہارم	:	بدانکہ صیغہ ہائے امر و نہی نیز سہ قسم گفتہ می شود۔
وزن بیست و ششم	:	بیان صیغہ ہای افعال بطریق دیگر واسمای فاعل و مفعول وبیان ترکیب در صیغہ مصدر باہم وترکیب اسم فاعل باسم دیگر واین جملہ چہار قانون است۔
قانون اول	:	بدانکہ آن ہر شش صیغہ بدو صورت اند۔
قانون دوم	:	بدانکہ در جملہ بابہا ہر جا کہ دو صیغہ مصدر فارسی کہ آخر دیگری دن باشد بیارند...
قانون سوم	:	بدانکہ چون خواہند اسم فاعل و مفعول بسازند فاعل راچنین می سازند...
قانون چہارم	:	بدانکہ ہر گاہ پیش اسم فاعل دیگر اسم بیاید ہر دو اسم را فارسیان بحال داشتہ می گویند۔
وزن بیست و ہفتم	:	درساختن مفرس۔
وزن بیست ہشتم	:	بیان حرکات یعنی اعراب سہ گانہ کہ بہ عوض حذف حروف ثلاثہ علت می گذارند وبیان ہمزہ ممدودہ یعنی الف مدداداہ شدہ۔
نجش اول	:	صیغہ ہادر شروع نجش اول — حرف الف۔
نجش دوم	:	باب البای۔
نجش سوم	:	حرف پا۔
نجش چہارم	:	باب التای مثنات فوق۔

اسی طرح ہر حرف کا ایک باب قائم کر کے اس کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

□

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب

گل ہوئے جاتے ہیں چراغ اپنے

(سنہ ۲۰۰۰ء میں وفات پانے والے شعرا و ادبا کا تذکرہ)

بیسویں صدی کے اختتام تک صرف ایک سال میں اردو کے تقریباً ساٹھ اہل قلم اس دنیا سے رخصت ہو گئے جن میں بعض اعلیٰ درجے کے فکشن نگار، محقق، نقاد، شاعر، صحافی اور کچھ اردو کے شیدائی بھی تھے۔ اس لحاظ سے اردو زبان و ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ جنوری ۲۰۰۰ء سے دسمبر ۲۰۰۰ء کے دوران اردو دنیا جن اصحاب سے محروم ہو گئی ان کا مختصر تعارف ذیل میں حروف تہجی کی ترتیب سے پیش ہے (مرحومین کے لیے بلندیٔ درجات کی دعا اور پسماندگان سے اظہار ہمدردی کے ساتھ)۔

اس مضمون کی تیاری میں رسالہ آج کل، اردو بک ریویو، اردو دنیا، ایوان اردو، شب خون، قومی زبان، کتاب نما اور روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو)، قومی آواز وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ میری لاعلمی کے سبب اس فہرست میں جو شامل ہونے سے رہ گئے ہوں، ان کے حق میں بھی دعائے خیر اور پسماندگان سے اظہار ہمدردی کے ساتھ معذرت خواہ ہوں۔

(۱) **ابو مسلم صدیقی** : اردو کے بزرگ ادیب اور نقاد تھے۔ ۱۰ر جون کو کراچی میں انتقال ہوا۔

(۲) **احقر کانٹھوی** : بزرگ اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ بزم فروغ اردو کانٹھ کے سرپرست تھے۔ ۱۶ر اکتوبر کی شب میں انتقال ہوا۔

(۳) **احمد سعدی** : بنگلہ دیش (سیدپور) میں اردو کے ایک فعال ادیب، افسانہ نگار، شاعر اور مترجم تھے۔ افسانوی ادب میں زیادہ شہرت پائی۔ تقریباً دو سو طبع زاد افسانے لکھے۔ پہلا افسانہ "شریک حیات" فروری ۱۹۴۵ء میں، "جدید اردو" ہفتہ وار "نظام" ممی میں شائع ہوا۔ بنگلہ زبان کے متعدد اہم افسانوں اور اسٹیج ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ علاء الدین آزاد کے ناول "کرنا فلی"، "جاڑے کی آخری رات"، "بہار کا پہلا دن" اور بمل مترا کے ناول "کوڑیوں کے مول" کا بنگالی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ پہلا افسانوی مجموعہ "دو دو چراغ محفل" ہے جس میں س-م-ساجد کے افسانے بھی شامل ہیں۔ دوسرا افسانوی مجموعہ "مٹی کی خوشبو" ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا۔

(۴) **اختر الزماں ناصر** : اورنگ آباد (مراٹھواڑہ) کے مشہور شاعر اور اقبالیات کے ماہر تھے۔ انگریزی

کے استاد تھے اور ۲۲ سال پہلے ملتی پور ہائی اسکول ٹانڈیر کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ۴ر جولائی کو ۸۱ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے :

اے رفیق تنہائی اختر سحر تھم جا ☆ ہم بھی ساتھ چلتے ہیں ہم بھی کوئی دم کے ہیں

مشہور شاعر جاوید ناصر ان کے فرزند ہیں۔

(۵) افتخار احمد صدیقی : اردو کے ادیب اور اقبال شناس تھے۔ علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ ۱۹۱۷ء میں پٹیالہ میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸ر جون کو وفات پائی۔

(۶) اقبال حیدری : شاعر، ادیب، مترجم اور نقاد تھے۔ دوستوو سکی کے ناول CRIME AND PUNISHMENT کا "جرم و سزا" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ انگریزی میں "اکانومسٹ انٹر نیشنل" نامی جریدہ بھی نکالتے تھے۔

ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کی شخصیت اور فن پر بھی ان کی ایک کتاب کچھ ہی دنوں پہلے آئی تھی۔ شعری مجموعہ "شہرِ بے نوا" شائع ہو چکا ہے۔ ۲۳ر فروری کو ۷۱ سال کی عمر میں کراچی میں انتقال ہوا۔

(۷) (پروفیسر) اقبال عظیم : شاعر، محقق اور نقاد تھے۔ نعتیہ شاعری کے دو مجموعوں (۱) "قاب قوسین" اور (۲) "زبور حرم" کے علاوہ غزلوں کے دو مجموعے "ماحصل" اور "چراغ آخرِ شب" شائع ہو چکے ہیں۔ نثری تصانیف میں "مغربی بنگال میں اردو" اور "مشرق" (مشرقی پاکستان سے متعلق ادبی، لسانی، معاشرتی اور ثقافتی موضوعات پر مضامین کا مجموعہ) قابل ذکر ہیں۔ دیوانِ ناطق بھی مرتب کیا تھا۔ ۸۷ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

(۸) انجم رومانی : شاعر اور صحافی تھے۔ ۱۹۶۲ء میں روزنامہ "اردو ٹائمز" سے وابستہ ہوئے اور اس کے ادبی صفحہ "لوح و قلم" کے مرتب بھی رہے۔ شعری مجموعہ "روشنی بے چراغ راتوں کی" شائع ہو چکا۔ ۷۲ سال کی عمر میں ۲۶، ۲۷ر جولائی کی شب میں ممبئی میں انتقال ہوا۔ پسماندگان میں ۴ بیٹے اور ۳ بیٹیاں ہیں۔

(۹) انور عظیم : ممتاز افسانہ نگار، ڈراما نویس، مترجم اور صحافی تھے۔ ۲۲ سال کی عمر سے افسانہ نگاری شروع کی۔ پہلا افسانہ "چکراتے ہوئے" رسالہ افکار ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ ڈھائی سو سے زیادہ افسانہ لکھے جن میں سے بیشتر نقوش، فنون، شاہراہ، نیا دور، سویرا اور گفتگو وغیرہ رسائل کی زینت بنے۔ افسانوی مجموعوں میں قصہ رات کا (۱۹۷۲ء)، اجنبی (۱۹۹۴ء)، دھان کٹنے کے بعد (۱۹۹۹ء)، لاو ہیم (۲۰۰۰ء) اہمیت کے حامل ہیں۔ چار ناول، جھلستے جنگل، پرچھائیوں کی وادی، دھواں دھواں سویرا اور بہت جھڑ کی صدائیں کے نام سے لکھے۔ ڈراموں کے مجموعہ "رات کے راہی" کے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی کے لیے بھی ایک درجن سے زائد ڈرامے لکھے۔ دہلی دور درشن کی

پہلی ٹیلی فلم "فخرو میاں" کا اسکرپٹ بھی انہوں نے ہی لکھا تھا۔ گورکی کے ڈراموں اور روسی ادب کے کئی شاہکاروں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ برتولت برمخت کے ڈراما "THE RISE AND FALL OF ARTURO IOI" انہوں نے نیشنل اسکول آف ڈراما کے لیے بڑا کامیاب ترجمہ (آرتورواوئی کا عروج وزوال) کیا۔

انور عظیم کا اصل نام سید صدر الدین احمد تھا۔ ۱۹۲۴ء میں پوکسی (ضلع نوادہ، بہار) میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے نفسیات میں بی-اے آنرز اور اردو میں ایم-اے کیا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک روزنامہ "استقلال" (کلکتہ) کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد دو سال تک مکتبہ جامعہ دہلی سے بحیثیت ایڈیٹر وابستہ رہے۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۰ء تک "بلٹز" اردو (ممبئی) کے مدیر رہے۔ پھر ۱۹۹۰ء تک سوویت لینڈ میں ایڈیٹر انچارج رہے۔ انگریزی روزنامہ "پیٹریاٹ" اور "قومی آواز" (اردو، دہلی) میں کالم بھی لکھے۔ ۱۹۶۹ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا اور دہلی اکادمی نے ۱۹۹۹ء میں ایوارڈ برائے تخلیقی نثر پیش کیا۔ پرچھائیوں کی وادی اور اجنبی فاصلے پر یوپی اردو اکادمی کے انعامات ملے۔ ۷۶ سال کی عمر میں دماغ کی نس پھٹ جانے کے سبب ۲۰ر اکتوبر کو نوئیڈا کے کیلاش اسپتال میں انتقال ہوا۔ تدفین جامعہ نگر دہلی کے قبرستان میں ہوئی۔ پسماندگان میں خدیجہ عظیم (اہلیہ)، نیلما عظیم (بیٹی) اور بیٹے پروفیسر اے-این-انور پاشا ہیں۔

(۱۰) بال کرشن بیتاب :- فرید آباد کے مشہور شاعر تھے۔ جیند کے برہمن خانوادے سے تعلق تھا۔ کیمپ کالج دہلی سے انگریزی میں ایم-اے کرنے کے بعد ہریانہ میں نائب تحصیلدار ہو گئے اور فیروزپور جھرکہ سے SDM کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ راجندر ناتھ رہبر کے قریبی دوستوں میں تھے۔ کلام میں پختگی تھی اور عروض پر اچھی نظر رکھتے تھے۔

(۱۱) (ڈاکٹر) بدر الزماں بدر : نوجوان شاعر حکیم مسیح الملک ندوی، سابق پرنسپل طبیہ کالج لکھنؤ کے فرزند۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ساتویں دہائی کے ایک ذہین اور فعال طالب علم تھے۔ کراپس میں ایک حادثہ میں شدید طور سے زخمی ہو گئے تھے، وہیں دس دن تک بے ہوشی کی حالت میں رہے اور اکتوبر ۴۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

(۱۲) تاباں نقوی : امروہہ کے بزرگ ادیب، شاعر اور صحافی تھے۔ اصل نام مختار حسین تھا۔ 1915ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک عرصے تک اخبار "اتحاد" کے مدیر رہے۔ پھر مراد آباد کے روزنامہ "جدت" کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۴۹ء میں اپنا ذاتی اخبار 'نوائے ہند' جاری کیا جو عرصے تک نکلتا رہا۔ رئیس امروہوی کے دوستوں میں تھے۔ تین کتابیں (۱) تذکرۂ خطیر (اپنے آباواجداد کا تذکرہ) (۲) شہنشاہ اشعار (آم) اور (۳) میخانۂ حرف (غالب کے فارسی کلام پر تحقیقی کام) شائع ہو چکی ہیں۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ چھوٹی بیٹی زیبا امروہوی ملک کی مشہور آرٹسٹ ہیں۔

(۱۳) جمیل اختر خاں : ادیب، نقاد اور دانشور تھے۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر تھے۔ ولادت ۱۹۴۱ء میں رام پور (یوپی) میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم رامپور کے ایک اسکول میں ہوئی جس کے پہلے ہیڈ ماسٹر خود ان کے دادا مولوی عطاء اللہ خاں تھے۔ پھر مرتضیٰ ہائی اسکول اور گورنمنٹ رضا انٹر کالج میں تعلیم حاصل کی۔ مفتی بشیر الدین احمد، پروفیسر نسیم الدین اور ڈاکٹر محمود الٰہی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۶۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم-اے کیا اور وہیں لکچرر ہو گئے۔ ابو اللیث صدیقی کے ساتھ لسانیات پر کچھ کام کیا۔ لغت کے مسائل اور اصول سے گہری واقفیت تھی۔ آرول کے ناول کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ قائم چاند پوری پر تحقیقی کام نامکمل رہ گیا۔ کلاسیکی اور جدید ادب و شاعری نیز سرسید اور ان کے رفقا کی ادبی خدمات اور عالمی ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ بڑی متحرک اور فعال شخصیت کے مالک تھے۔ انتظامی امور میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ کراچی کی متعدد علمی ادبی انجمنوں سے بھی رابطہ تھا۔ پاکستان رائٹرس گلڈ سے گہری وابستگی تھی۔ سہ ماہی رسالہ "الفاظ" بھی ان کی ادارت میں نکلتا تھا۔ پہلے ذیابیطس کا مرض ہوا پھر ایک عرصے تک سرطان میں مبتلا رہے۔ فروری ۲۰۰۰ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تقریباً پندرہ سال کا ایک بیٹا ہے۔

(۱۴) حفیظ میرٹھی : کہنہ مشق شاعر تھے۔ ۱۹۲۲ء میں کرت پور (ضلع بجنور) کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اپنی ننھیال میرٹھ میں ہوش سنبھالا اور وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ ۱۹۴۱ء سے میرٹھ کچہری میں ملازمت شروع کی اس کے بعد فیض عام انٹر کالج میں ہیڈ کلرک ہو گئے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ تمام عمر جماعت اسلامی سے وابستہ رہے۔ کلام میں بھی مذہبی اور انقلابی فکر نمایاں ہے۔ ایمرجنسی کے دوران ۱۹۷۷ء میں قید و بند کی صعوبت بھی اٹھائی۔ آخری زمانے میں بھی مالی دشواریوں میں گرفتار رہے لیکن خودداری کا دامن نہ چھوڑا۔ ۱۹۹۵ء میں یوپی کے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے ایک لاکھ روپے کی مالی امداد منظور کی تو اسے قبول نہیں کیا۔ ۲۴؍ دسمبر کو اہالیان میرٹھ نے جشن حفیظ میرٹھی کا انعقاد کر کے ان کی خدمات کے اعتراف میں ایک لاکھ روپے کا نذرانہ پیش کیا تو اسے اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے بے سہارا لڑکیوں کی شادی پر خرچ کر دیا۔ ۷۸ سال کی عمر میں ۷؍ جنوری کی شب میں میرٹھ میں انتقال ہوا۔ تدفین عید کے دن بعد نماز ظہر عمل میں آئی۔ دو شعری مجموعے "شعر و شعور (۱۹۷۰ء) اور "متاع آخر شب (۱۹۸۶ء) شائع ہو چکے تھے۔ کلیات حفیظ میرٹھی ابھی کچھ ہی دن پہلے منظر عام پر آیا ہے اور غالب اکیڈمی نے ان کی شخصیت اور فن پر بھی ایک کتاب شائع کی ہے۔

(۱۵) خلیل منظری : کرناٹک کے افسانہ نگار تھے۔ اصل نام خلیل احمد تھا۔ ۱۳؍ ستمبر کی صبح کو انتقال ہوا۔ افسانوی مجموعہ "دامِ خیال" اور تاریخی ناول "خاک وطن خون شہیداں" کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کے تعاون سے شائع ہوا۔

(۱۶) دانیال لطیفی : سپریم کورٹ میں وکیل تھے۔ اردو کے شیدائی اور اردو تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ اصل نام الما قمر الدین تھا۔ جسٹس بدر الدین طیب جی کے نواسے تھے۔ ۱۵ر مارچ ۱۹۱۷ء کو ممبئی میں پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ اپنے زمانے کے مشہور مقرر اور خطیب تھے۔ آکسفورڈ میں ایڈورڈ ہیتھ کو تقریری مقابلے میں شکست دی تھی۔ جو بعد میں برطانیہ کا وزیر اعظم بنا۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں تا عمر کوشاں رہے۔ اردو رسم خط کی تبدیلی کے سخت مخالف تھے۔ ۷ ار جون کو دہلی میں انتقال ہوا۔

(۱۷) راجندر ملہوترہ : انبالہ کی معروف شخصیت اور اردو کے شیدائی تھے۔ تیس سال قبل شام بہار ٹرسٹ کے نام سے ایک ادبی تنظیم قایم کی تھی جس کے زیر اہتمام انبالہ میں ہر سال مشاعرہ ہوتا تھا۔ قومی اردو کونسل دہلی کے رکن بھی رہ چکے تھے۔ تقریباً دو مہینے سے صاحب فراش تھے۔ ۱۵ر اپریل کی صبح کو انبالہ میں انتقال ہوا۔

(۱۸) راز لائل پوری : شاعر تھے، اصل نام دھنپت رائے تھا۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۲۰ء کو لائل پور (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ صاحب ہوشیار پوری سے تلمذ تھا۔ اردو کلام کے تین مجموعوں (۱) آئینہ راز (۲) راز و نیاز (۳) کائنات راز کے علاوہ دیوناگری میں بھی تین مجموعے نور صداقت، راز کی آواز اور "یادگار راز" شائع ہو چکے ہیں۔ ساتواں مجموعہ "افشائے راز" اندرجیت گاندھی نے مرتب کیا تھا اور اسکی اشاعت کے لیے دہلی اکادمی نے مالی تعاون کی منظوری دی تھی لیکن ابھی یہ شائع نہیں ہوا ہے۔ راز لائل پوری طویل عرصے سے علیل اور صاحب فراش تھے دہلی اردو اکادمی اور ساہتیہ اکادمی سے انہیں پنشن مل رہی تھی۔ ۱۳ر مئی کو ۸۰ سال کی عمر میں دہلی میں انتقال ہوا۔

(۱۹) رحمٰن مذنب : منٹو کی روایت کے افسانہ نگار تھے۔ تصنیف و تالیف میں عمر گزاری۔ "تیلی جان"، "رام پیاری" اور "بالاخانے" افسانوی مجموعے ہیں۔ ۸۴ سال کی عمر میں لاہور میں انتقال ہوا۔

(۲۰) سعید انجم : ناروے (شمالی یورپ) میں مقیم اردو کے مشہور افسانہ نگار تھے۔ اردو زبان و ادب کے روغ کے لیے وہاں بہت کام کیا تھا۔ اوسلو (ناروے) سے کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں دوستوں سے ملنے اور ایک شام افسانہ میں شرکت کے لیے آئے تھے وہیں دماغ کی نس پھٹ جانے سے ۲۳ر اپریل کو انتقال ہو گیا۔ دو افسانوی مجموعے "سب اچھا ہوگا" (۱۹۸۶ء) اور "سوتے جاگتے خواب" (۱۹۹۴ء) شائع ہو چکے ہیں مغرب کے اردو افسانوں کا ایک جامع انتخاب ۱۹۹۹ء میں شائع کیا تھا۔ قطب شمالی سے متعلق سفرنامہ "آدھی رات کا سورج" بھی لکھا تھا۔

(۲۱) سلام سندیلوی : محقق، نقاد اور شاعر تھے۔ ۱۵ر فروری ۱۹۱۹ء کو سندیلہ (ہردوئی) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے اردو رباعیات پر پی۔ ایچ۔ ڈی اور "اردو شاعری میں منظر نگاری" کے موضوع پر ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ فارسی، ہندی اور سنسکرت سے بھی اچھی واقفیت تھی۔ ۱۹۵۹ء میں شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے اور ریڈر کے عہدے سے رٹائر ہوئے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں عمر بسر کی۔

آخری دور میں بینائی رخصت ہو گئی تھی، اس لیے خانہ نشین ہو گئے تھے۔ ۱۶ر اکتوبر کی شب میں گورکھپور میں انتقال ہوا۔ تصانیف کی تعداد سو سے زائد ہے جن میں چند یہ ہیں :

(۱) اردو رباعیات (۲) اردو شاعری میں منظر نگاری (۳) ادب کا تنقیدی مطالعہ (۴) ادبی اشارے (۵) ساغر و مینا (شاعری) (۶) نکہت و نور (شاعری) (۷) شام و شفق (رباعیات) (۸) مہر و ماہ (رباعیات)۔

(۲۲) سید ارتضا عزمی : حیدر آباد (سندھ) کے اہم شاعر تھے۔ کلام میں کلاسیکی رنگ نمایاں تھا۔ شعری مجموعہ "چہرہ نما" ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔

(۲۳) سید حامد حسین : محقق، نقاد اور ممتاز ادیب تھے۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں معاشیات اور ۱۹۵۷ء میں انگریزی میں ایم۔اے کیا اور درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ ایک عرصے تک بھوپال میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ ای۔ایم فارسٹر کی ناول نگاری پر مقالہ لکھ کر آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۳ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ قائم رکھا۔ ۵۷ سال کی عمر میں ۲۶-۲۷ر اکتوبر کی درمیانی شب میں اندور میں انتقال ہوا۔ چند اہم تصانیف یہ ہیں : (۱) اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات و مصطلحات (۲) اردو ترجمہ اسرار خودی (۳) تحقیق اور حاصل تحقیق (۴) نثر اور انداز نثر (۵) اردو، ہندی : دانشوروں کی نظر میں (۶) لفظوں کی انجمن میں (۷) جدید ادبی تحریکات۔ اس کے علاوہ ماہنامہ کتاب نما (مکتبہ جامعہ دہلی) کا خصوصی شمارہ "مشرقی علوم والسنہ پر تحقیق" (جولائی ۱۹۷۸ء) بھی مرتب کیا تھا۔ "نقد بجنوری" کی مصنفہ ڈاکٹر حدیقہ بیگم ان کی اہلیہ ہیں۔

(۲۴) سیف بھساولی : خاندیش کے مشہور شاعر تھے۔ ریلوے کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد خاموش زندگی گزار رہے تھے۔ ۷۷ سال کی عمر میں جولائی میں انتقال ہوا۔ شعری مجموعہ "شگفتِ گل" شائع ہو چکا ہے۔ شاہد لطیف (فیچر ایڈیٹر روزنامہ انقلاب) ان کے بڑے بیٹے ہیں۔

(۲۵) شفیق الرحمٰن : صاحب طرز ادیب، منفرد طنز و مزاح نگار، افسانہ نویس اور مترجم تھے۔ ۹ر نومبر ۱۹۲۰ء کو کلانور (ضلع روہتک) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں لاہور سے ایم۔بی۔بی۔ایس کرنے کے بعد انڈین میڈیکل سروس میں شامل ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آرمی میڈیکل کور میں شامل ہو کر میجر جنرل کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۳ر ستمبر ۱۹۸۰ء سے ۴ر نومبر ۱۹۸۶ء تک اکادمی ادبیات پاکستان کے چیرمین رہے۔ اڈنبرا میڈیکل سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند بھی حاصل کی تھی۔ ۱۹ر مارچ کو راولپنڈی میں ۷۹ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ چند اہم تصانیف یہ ہیں :

(۱) شگوفے (۲) کرنیں (۳) لہریں (۴) مدوجزر (۵) پرواز (۶) حماقتیں (۷) مزید حماقتیں (۸)

پچھتاوے۔ اس کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کا سفرنامہ 'دجلہ" لکھا اور انگریزی ناول HUMAN COMEDY کا ترجمہ "انسانی تماشہ" کے عنوان سے کیا۔ پیروڈی بھی لکھی، مثلاً قصہ چہار درویش، قصہ حاتم طائی، سفرنامہ سندباد جہازی، قصہ علی بابا، تزک نادری عرف سیاحت نامہ ہند وغیرہ۔

(۲۶) شہاب جعفری: شاعر تھے، متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زبردست حامی تھے۔ ۲ر جنوری ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ دہلی یونیورسٹی کے خالصہ کالج میں اردو کے استاد رہ چکے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ کافی دنوں سے بیمار تھے اور تنہائی کی زندگی گزارتے تھے۔ کیم فروری کو ۶۷ سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب دہلی میں انتقال ہوا۔ صبح کو ان کی لاش گھر میں پائی گئی۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہوا:

چلے تو پاؤں کے نیچے کچل گئی کوئی شے
نشے کی جھونک میں دیکھا نہیں کہ دنیا ہے

(۲۷) طاہر شادرنی: پاکستان کے ممتاز ماہر تعلیم، ادیب، محقق اور شاعر تھے۔ ساری عمر درس وتدریس میں بسر کی۔ ۸۴ سال کی عمر میں مئی کے آخری ہفتے میں انتقال ہوا۔

(۲۸) ظہیر الدین ثاقب عباسی: شاعر اور ادیب تھے۔ سہ روزہ "دعوت" (دہلی) سے عرصے تک وابستہ رہے۔ بہت دنوں سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ ۲۹ر جولائی کو انتقال ہوا۔

(۲۹) ظہیر مشرقی: نقاد اور مترجم تھے۔ اصل نام ظہیر الحق اور کلکتہ وطن تھا لیکن پاکستان چلے گئے تھے۔ انگریزی، فارسی، اردو اور بنگلہ پر یکساں عبور تھا۔ انگریزی اور بنگلہ تراجم وقتاً فوقتاً انجمن ترقی اردو کراچی کے رسالہ "قومی زبان" میں شائع ہوتے تھے۔ ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کی شخصیت اور شاعری پر ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا جو سہ ماہی "مشاہیر" کراچی کے خصوصی شمارے میں شائع ہوا۔ ۲۱ر جنوری کو مختصر علالت کے بعد ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

(۳۰) عبدالرحمٰن ناصر: اردو ڈکشنری بورڈ کراچی میں گذشتہ پندرہ سال سے بحیثیت اسکالر مامور تھے۔ اور اردو لغت نویسی کا اچھا تجربہ رکھتے تھے۔ ایک ابھرتے ہوئے نقاد کی حیثیت سے مختلف رسائل میں مضامین لکھنا شروع کیا تھا۔

(۳۱) عزیز جھانسوی: صحافی تھے۔ ۱۹۵۳ء میں مسلم انٹر کالج کرتپور میں لکچرر ہوئے تھے اور اسی شہر کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ ۱۱ر مئی کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔

(۳۲) عزیز مرادآبادی: افسانہ نگار اور شاعر تھے۔ ۱۹۶۸ء میں مسلم انٹر کالج کرتپور میں لکچرر

ہوئے تھے اور اسی شہر کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ ۱۱ر مئی کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔

(۳۳) عشرت کرتپوری : شاعر تھے۔ احسان دانش سے تلمذ تھا۔ غزلوں کے دونوں مجموعوں (۱) "کاکلِ صبح" اور (۲) "شاخِ برہنہ" پر یوپی اردو اکادمی سے انعام مل چکا تھا۔ "پاک زمین ناپاک قدم" ان کی طویل نظم ہے جو ہند، پاک جنگ کے دوران شائع ہوئی۔ مختلف شعرا کی نظموں کا انتخاب "صبحِ بنارس" کے نام سے کیا تھا۔ کافی عرصے سے بیمار تھے۔ ۲۰ر ستمبر کی صبح کو غازی آباد کے ایک نرسنگ ہوم میں انتقال ہوا۔ آبائی وطن کرتپور میں سپردِ خاک کیے گئے۔ نصرت گوالیاری ان کے شاگرد ہیں۔ پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔

(۳۴) علی سردار جعفری : مشہور ترقی پسند شاعر، افسانہ نگار، ڈراما نویس، نقاد، مترجم، صحافی اور دانشور تھے۔ ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء کو بلرام پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ دہلی علی گڑھ اور لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ترقی پسند تحریک کے ایک پرجوش اور سرگرم کارکن تھے اور تمام عمر نظریاتی طور پر اس تحریک سے وابستہ رہے۔ تعصب، تنگ نظری اور جبر و استحصال کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی اور اپنی شاعری کے ذریعہ صلح کُل اور امن و آشتی کا پیغام دیا۔ ۱۷ سال کی عمر میں افسانہ نگاری سے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا لیکن بہت جلد شعر و سخن کے میدان میں آگئے۔ ۱۹۸۳ء میں افسانوی مجموعہ "منزل" اور نظموں کا پہلا مجموعہ "پرواز" ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد نئی دنیا کو سلام (۱۹۴۸ء)، خون کی لکیر (۱۹۴۹ء)، امن کا ستارہ (۱۹۵۰ء)، ایشیا جاگ اٹھا (۱۹۵۲ء)، پتھر کی دیوار (۱۹۵۳ء)، ایک خواب اور (۱۹۶۵ء)، پیراہنِ شرر (۱۹۶۶ء)، نئی دنیا کو سلام اور جمہور (۱۹۷۲ء) اور "لہو پکارتا ہے" (۱۹۷۸ء) جیسے اہم شعری مجموعے شائع ہوئے۔ تنقیدی تصانیف میں ترقی پسند ادب، اقبال شناسی، مخدوم محی الدین اور پیغمبرانِ سخن (کبیر، میر، غالب) شامل ہیں۔ "لکھنؤ کی پانچ راتیں" ان کا سوانحی رپورتاژ ہے جو ان کی نثر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ رسالہ "گفتگو" ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا جو اردو کے قابلِ ذکر رسالوں میں شمار ہوتا ہے۔ لاہور "بس یاترا" کے دوران وزیرِ اعظم ہند، سردار کی نظم "سرحد" اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ترقی پسند شعرا میں فیض کے بعد کسی بھی شاعر کو اتنی شہرت اور مقبولیت نصیب نہ ہو سکی جتنی سردار جعفری کو حاصل ہوئی۔ انھیں بہت سے اعزازات و انعامات سے بھی نوازا گیا جس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے آنریری ڈی۔لٹ کے علاوہ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، اقبال سمان، اقبال میڈل، پدم شری اور گیان پیٹھ ایوارڈ شامل ہیں۔

۸۶ سال کی عمر میں BRAIN TUMER کے سبب یکم اگست کو ممبئی کے اسپتال میں انتقال ہوا اور اسی روز جوہو قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

(۳۵) علی نواز وفائی : سندھ (پاکستان) کے نامور ادیب اور شاعر تھے۔ ۱۹۲۵ء میں سکھر میں پیدا ہوئے اور ۲۸ر مئی کو کراچی میں انتقال ہوا۔ نامور عالم اور محقق دین محمد وفائی کے صاحبزادے تھے۔

(۳۶) عین رشید : شاعر، ادیب اور مترجم تھے۔ مغربی بنگال پولیس میں ہوم گارڈ کے ڈائرکٹر جنرل تھے۔ اپنی نظموں کا ترجمہ بنگلہ میں "آبلوسی بھابھنا" کے نام سے شائع کیا اور غالب کے کلام کا شکتی چٹوپادھیائے کے تعاون سے بنگالی میں ترجمہ کیا اردو کلام کا مجموعہ زیر ترتیب تھا۔ ۱۰ ستمبر کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوا۔

(۳۷) فوق کریمی : شاعر اور محقق تھے۔ اصل نام محمد یوسف تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے "انڈین نیشنل کانگریس اور سر سید" کے موضوع پر ایم۔فل (اردو) اور "سر سید کے سیاسی افکار" پر پی۔ایچ۔ڈی کی تھی۔ "اسباب بغاوت ہند" (مصنفہ سر سید) مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ اردو ہفت روزہ "ترجمان" کے مدیر تھے۔ ۷۵ سال کی عمر میں ۱۹ فروری کو حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہوا۔

(۳۸) قمر جمیل : اردو کے معروف نقاد، ادیب اور شاعر تھے۔ یکم مئی ۱۹۳۱ء کو غازی آباد میں پیدا ہوئے۔ ایک عرصے تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ "دریافت" کے نام سے ادبی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ "جدید ادب کی سرحدیں" دو جلدوں میں حال ہی میں شائع ہوا۔ "خواب نما" اور "چہار خواب" کے نام سے دو شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ نثری نظم کے قابل ذکر شاعر تھے۔ طویل علالت کے بعد ۲۸ اگست کو انتقال ہوا۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے :

ایک پتھر جو دست یار میں ہے پھول بننے کے انتظار میں ہے

(۳۹) قیصر عثمانی : شاعر اور ادیب تھے۔ تصانیف میں پرچھائیوں کا دیس، یادوں کا سفر، یادیں ہی یادیں، یادوں کے سائے وغیرہ شامل ہیں۔ ۸۱ سال کی عمر میں ۱۴ جولائی کو انتقال ہوا۔ پسماندگان میں بیوہ، چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

(۴۰) کلیم عثمانی : معروف غزل گو اور پاکستان کے مشہور فلمی نغمہ نگار تھے۔ لاہور میں انتقال ہوا۔

(۴۱) کیول سوری : افسانہ نگار، شاعر اور نقاد تھے۔ اعلیٰ سرکاری عہدے سے سبکدوشی کے بعد دو سال تک دہلی اردو اکادمی کے مشیر رہے۔ ۶۶ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ پسماندگان میں بیوہ، ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔

(۴۲) مجروح سلطانپوری : مشہور ترقی پسند غزل گو اور فلمی نغمہ نگار تھے۔ اصل نام اسرار الحسن خاں تھا۔ ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اعظم گڑھ، فیض آباد اور الہ آباد میں تعلیم حاصل کی۔ لکھنؤ سے طبابت کی سند حاصل کی لیکن اس پیشے سے ذہنی مناسبت نہ تھی۔ ۱۹۴۴ء میں بمبئی پہنچے اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ ساڑھے تین سو سے زائد فلموں کے لیے تقریباً ڈھائی ہزار نغمے لکھے اور اس سلسلے میں انہیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ ملا۔ فلمی نغمہ نگار کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ درجے کے غزل گو بھی تھے۔ غزل کی فنی نزاکتوں کی پاسداری اور اپنے تیز و تند لہجے کی وجہ سے بھی انہوں نے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ سیاسی موضوعات سے زیادہ دلچسپی تھی لیکن معاشرتی

زندگی کے دیگر مسائل کا بھی خوبصورتی سے احاطہ کیا۔ ۱۹۵۲ء میں شعری مجموعہ "غزل" شائع ہوا، اور اب تک اس کے تقریباً نو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ انھیں اقبال سمان، غالب ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ، عالمی اردو کانفرنس ایوارڈ اور ہندی ساہتیہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۲۴-۲۵ رمئی کی درمیانی شب میں انتقال ہوا۔ ان کے یہ دو اشعار بہت مشہور ہوئے۔

ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح — بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں

رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ — دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوش بہار

(۴۳) **محمد اسلم خاں (پروفیسر)** : اردو فارسی کے ادیب تھے۔ ۱۹۶۹ء سے دہلی یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف و مرتب تھے۔ "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" (مصنفہ ڈاکٹر سید عبد اللہ) کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ ۱۶ ر اگست کو انتقال ہوا۔

(۴۴) **محمد مرتضیٰ صدیقی (پروفیسر)** : مشہور دانشور تھے۔ جامعہ عثمانیہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے بعد کیلی فورنیا یونیورسٹی (امریکہ) سے پوسٹ ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی۔ حضرت غوث الاعظم کے خطبات پر کام کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی فلسفے پر کتابوں کے علاوہ اردو اور انگریزی میں کئی کتابیں لکھی تھیں۔ گذشتہ بیس سال سے ریاض یونیورسٹی (سعودی عرب) میں پروفیسر تھے۔ ۴ ر اکتوبر کو وہیں انتقال ہوا۔

(۴۵) **محمد منظور حسن** : بزرگ صحافی تھے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۹ء تک روزنامہ "رہنمائے دکن" (حیدر آباد) کے ایڈیٹر رہے۔ ۸۴ سال کی عمر میں ۱۳ ر اگست کی شب میں حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ پسماندگان میں بیوہ، چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

(۴۶) **محمود نشتری** : اندور کے مشہور شاعر، نشتر اندوری کے بھتیجے اور مقصود نشتری و مسعود نشتری کے بھائی تھے۔ ۷ ر جون ۱۹۴۳ء کو رانی پور (اندور) میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ر اپریل کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوا۔ درج ذیل شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) عکس خیال (۱۹۸۱ء)، (۲) انا (۱۹۹۳ء)، (۳) احساسِ غزل (۱۹۹۵ء)، (۴) دریا، ساحل، ریت (دیوناگری میں) (۱۹۹۸ء)۔

(۴۷) **مرزا شکور بیگ** : حیدر آباد کے مشہور نعت گو اور مزاحیہ شاعر تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے گریجویٹ تھے۔ عملی زندگی کا آغاز وکالت سے کیا تھا۔ قانون ساز اسمبلی کے لیے ۱۹۵۲ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر حسن پرتھی سے اور ۱۹۶۲ء میں ورنگل سے منتخب ہوئے تھے۔ نعتیہ کلام کے دو مجموعے "گلدستۂ نعت" اور "خوشبوئے نعت" شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ "ترانہ"، "سدا بہار"، "خوشبوئے درود" اور "لذتِ قریہ" بھی ان کی یادگار ہیں۔ ۹۳ سال کی عمر میں ۲۲ ر اگست کی صبح کو حیدر آباد میں انتقال ہوا۔

(۴۸) **مرزا محمد منور (پروفیسر)**: نقاد، محقق، دانشور اور اقبالیات کے ماہر تھے۔ اردو، انگریزی اور عربی میں مجموعی طور پر ۳۸ کتابوں کے مصنف تھے۔ طویل علالت کے بعد ۷۷ سال کی عمر میں ۷/فروری کو لاہور میں انتقال ہوا۔

(۴۹) **مظفر علی سیّد**: مشہور نقاد، محقق، مترجم اور شاعر تھے۔ تاریخی نام مظفر حسین تھا۔ ۱۹۲۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم-اے کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۸ء تک لاہور، گوجرانوالہ اور کراچی کے کالجوں میں انگریزی کے استاد رہے۔ پھر پاک فضائیہ کے شعبۂ تعلیم میں ونگ کمانڈر مقرر ہوئے۔ عرصے سے پھیپھڑے کے سرطان میں مبتلا تھے۔ ۲۸/جنوری کو لاہور میں انتقال ہوا۔ تنقید میں انھیں محمد حسن عسکری کا جانشین سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۹۹ء میں ان کی اہم تصنیف ''تنقید کی آزادی'' (دستاویز مطبوعات لاہور) پر ہجرہ ایوارڈ ملا تھا جو پاکستان کا سب سے بڑا ادبی انعام ہے۔ انھوں نے ڈی-ایچ-لارنس کی فکشن پر تنقید کے ترجمے کئے۔ ناول فن و فلسفہ، ان کی اہم کتاب ہے۔ دوسری کتاب 'معاشرہ شناسی' مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ انگریزی کے متعدد شعرا کی اہم نظموں کے ترجمے بھی کئے۔

(۵۰) **(حاجی) معین الدین احمد**: اردو کے شیدائی اور اڑیسہ اردو لائبریری (کٹک) کے بانی تھے۔ ۱۹۳۴ء میں بہار، اڑیسہ ADMINISTRATIVE SERVICE سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۹ء میں سبکدوش ہونے کے بعد اردو زبان و ادب کے فروغ کے مقصد سے کٹک میں اردو لائبریری آف اڑیسہ قائم کی جس کے زیر اہتمام ماہانہ مشاعروں اور ادبی مذاکروں کا سلسلہ قائم ہوا۔ انہوں نے اردو فاؤنڈیشن کی بھی بنیاد رکھی اور اردو میں امتیازی نمبروں سے پاس ہونے والے طلبا و طالبات کو اس کے ذریعہ وظیفہ دینے کا انتظام کیا، اور ۱۹۹۲ء میں اردو لائبریری، زمین، عمارت اور تمام اثاثہ کٹک میونسپل کارپوریشن کو تفویض کر دیا۔

(۵۱) **مفتی شریف الحق امجدی**: ممتاز عالم دین اور جامعۃ الاشرفیہ مبارک پور (اعظم گڑھ) کے صدر مفتی تھے۔ نزہۃ القاری شرح بخاری تقریباً پانچ ہزار صفحات اور نو ضخیم جلدوں میں لکھی جسے علمی شاہکار کا درجہ حاصل ہوا۔ ستر ہزار سے زائد فتاویٰ اور اردو میں تقریباً بیس کتابوں کے مصنف تھے۔ ۱۱/مئی کو بعد نماز فجر ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

(۵۲) **منظر کاظمی**: معروف افسانہ نگار اور کریم سٹی کالج جمشید پور (جھارکھنڈ) کے پرنسپل تھے۔ پہلا افسانہ ''زہر کی پوٹ'' ۱۹۵۹ء میں رسالہ جام نو (دھنباد) میں شائع ہوا تھا۔ کئی مہینے سے پھیپھڑے کے کینسر میں مبتلا تھے۔ ۵۹ سال کی عمر میں ۱۲/اگست کی شام کو انتقال ہوا۔ تین کتابیں ''شہید امن''، ''ہم جنگل کی طرف لوٹ رہے ہیں'' اور ''لکشمن ریکھا'' (افسانوی مجموعہ) شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ چار کتابیں ''یاترا'' (افسانے)، ''سرسری اس

جہان سے گذرے'' (سوانحی خاکہ)، اردو غزل کا اسلوب (تحقیقی مقالہ) اور تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ اشاعت کے لیے تیار ہے۔ متعدد ریڈیو ڈرامے بھی لکھے اور سید منظر امام کے اشتراک سے چینی حملے کے خلاف لکھے گئے افسانوں کا ایک مجموعہ ''ہمالیہ کے آنسو'' ۱۹۶۳ء میں مرتب کیا تھا۔ حال ہی میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے منظر کاظمی کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب ''منظر نامہ'' شائع کی ہے جو متعدد قلم کاروں کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

(۵۳) ڈاکٹر منور حسین: شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جواں مرگ استاد، ایک ابھرتے ہوئے محقق، نقاد اور صحافی تھے۔ ۴۴ سال کی عمر میں مختصر سی علالت کے بعد اپنے بہت سے شاگردوں، دوستوں اور اہل خاندان کو سوگوار چھوڑ کر ۲ ار تمبر کی درمیانی شب میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ میت آبائی وطن کی مٹی کے حوالے ہوئی۔

یکم جولائی ۱۹۵۹ء کو قصبہ پر الطیف (ضلع کھگڑیا، بہار) کے ایک علمی اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ جامعۃ الفلاح سے ۱۹۷۴ء میں عالمیت اور ۱۹۷۶ء میں فضیلت کی سند حاصل کی۔ ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی-اے آنرز اور ۱۹۸۶ء میں ایم-اے (اردو) کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اسی دوران علی گڑھ میگزین (اردو) کے ایڈیٹر رہے۔ بیچلر آف تھیالوجی (B.T.H) کی سند بھی فرسٹ پوزیشن کے ساتھ حاصل کی۔

مولوی چراغ علی کی علمی خدمات پر مقالہ لکھ کر ۱۹۸۸ء میں ایم-فل کی سند حاصل کی۔ ۱۹۹۷ء میں یہ مقالہ خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں یو-جی-سی سے انہیں جونیئر فیلوشپ ملی اور ''اردو میں علمی نثر (۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک، سماجی علوم کے حوالے سے)'' پر نہایت جامع اور وقیع مقالہ لکھ کر ۱۹۹۲ء میں پی-ایچ-ڈی کی سند حاصل کی۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۹۴ء کو شعبہ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے۔ تقریباً دو درجن تحقیقی وتنقیدی مضامین اور تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ ماہنامہ ''رفتار'' کے مدیر تھے اور دہلی کے ماہنامہ ''اردو بک ریویو'' کی مجلس ادارت سے بھی وابستہ تھے۔

ڈاکٹر منور حسین ایک لائق اور محنتی استاد تھے۔ اپنی ذمہ داریوں کو نہایت خوش دلی، لگن اور سلیقے سے انجام دینے کے قائل تھے۔ کلاسیکی ادب، تاریخ اور مذہبیات پر ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ شعر فہمی اور ادب فہمی کی غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ تحقیق وتنقید سے خاصا شغف تھا۔ تہذیب وشائستگی، سادگی وشرافت اور محبت واخلاص کا ایک اہم جیتا جاگتا نمونہ تھے۔

خدا بخشے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(۵۴) مہر گیرا: جدید شاعر تھے۔ ستر سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ''لہو کا لمس'' ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

(۵۵) میر عابد علی سعید شہیدی: حیدرآباد کے بزرگ شاعر تھے۔ شاعری کا ملکہ اپنے والد شہید یار جنگ (میر مہدی) سے ورثے میں پایا تھا۔ چھوٹی بحروں میں عمدہ غزلیں کہتے تھے۔ نجم آفندی سے تلمذ تھا۔ ۹۰ سال کی عمر میں ۱۴/مئی کو حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے رشید شہیدی بھی شاعر ہیں اور بیٹی حنا شہیدی بھی حیدرآباد کی مشہور شاعرہ ہیں۔

(۵۶) نسیم منان: شاعر، ڈراما نگار اور صحافی تھے۔ درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ گذشتہ بارہ سال سے ''شولاپور'' سے ہفت روزہ ''انور قمر'' پابندی سے نکالتے رہے۔ بچوں کے ادب سے متعلق بکثرت لکھا۔ اس سلسلے کے تین مجموعے ''ہنستے گیت''، ''رسیلے گیت'' اور ''سریلے گیت'' شائع ہو چکے ہیں۔ ڈراموں میں ''ڈھیلی کھاٹ''، ''بہار آنے تک''، سوسُنار کی ایک لوہار کی (سہ بابی ڈرامہ)۔ اس کے علاوہ آگ، گڑبڑ گھوٹالا، شکنجہ اور فیصلہ (یک بابی ڈرامے) مقبول ہوئے۔ کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ جولائی میں انتقال ہوا۔

(۵۷) نورالحسن ہاشمی (پروفیسر): کہنہ سال محقق، نقاد اور شاعر تھے۔ ۲۱/اگست ۱۹۱۱ء کو سندیلہ (ہردوئی) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ سے ۱۹۲۹ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا، پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۳۳ء میں بی-اے اور ۱۹۳۵ء میں انگریزی میں ایم-اے کیا۔ ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم-اے اردو کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں دلی کے دبستان شاعری پر مقالہ لکھ کر ۱۹۴۳ء میں پی-ایچ-ڈی کی سند حاصل کی۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۳ء تک لکچرر رہے۔ ۱۹۴۴ء میں دلی کالج میں استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر کی مستقل جگہ پر تقرر ہوا جہاں ۱۹۶۳ء میں ریڈر اور ۱۹۶۵ء میں پروفیسر ہوئے اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ستمبر ۱۹۷۴ء میں سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے دوران لکھنؤ سے ۱۹۴۹ء میں فارسی میں ایم-اے کیا اور اردو کلیات ولی کی تدوین پر ڈی-لِٹ کی سند حاصل کی۔ تقریباً ۱۷ کتابوں کے مصنف و مرتب تھے۔ کلاسیکی ادب اور تحقیق سے گہرا لگاؤ تھا۔ نوطرز مرصع (تحسین) اور کلیات ولی کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ کلیات حسرت دہلوی، بکٹ کہانی (باشتراک مسعود حسین خاں)، مثنوی طوطی نامہ، مثنوی سراپا سوز، فسانۂ اعجاز اور ایک نادر روزنامچہ بھی مرتب کیا۔ تنقیدی تصانیف میں ''ادب کیا ہے'' اور ''ادب کا مقصد'' خاصی مقبول ہوئیں۔ احسن فاروقی کے اشتراک سے ناول کی مبادیات اور تاریخ پر ''ناول کیا ہے'' لکھی۔ برنارڈ شا کی تصنیف ''کینڈیڈا'' اور ہیرن شاہ کی کتاب THE DEVELOPMENT OF POLITICAL IDEAS کا اردو میں ترجمہ کیا۔ عروض کے ماہر تھے۔ ''اندرونم'' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ ہندی اردو لغت اور لغت القوافی تالیف کی۔ نصابی کتابوں میں بچوں کے لیے اردو قاعدہ، ریختۂ ولی، ریختۂ غالب اور انتخاب سب رس (ملا وجہی) مرتب کیا تھا۔ رسالہ جامعہ دہلی اور فروغ اردو لکھنؤ کے مدیر بھی رہے۔ لکھنوی تہذیب کا عمدہ نمونہ تھے۔ ان کی شرافت، نیک نفسی اور حسن اخلاق

کے بھی قائل تھے۔ علمی حلقوں میں ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، میر اکادمی، ارم ایجوکیشنل سوسائٹی سے ایوارڈ ملے۔ صدر جمہوریہ ہند نے فارسی خدمات پر انعام دیا۔ وہ یوپی اردو اکادمی کے نائب صدر اور صدر بھی رہے۔

۸۹ سال کی عمر میں ۲۸ رنومبر کو صبح ۹ بجے لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

پروفیسر آل احمد سرور نے ان کی یاد میں شعر کہے :

وہ کم سخن تھا قلم بولتا رہا اس کا

کتاب پڑھتا رہا صاحب کتاب ہوا

چلا گیا کہ مقدر سبھی کا جاتا ہے

رہے گا یاد کہ عالم میں انتخاب ہوا

(۵۸) نوشاد نوری: بنگلہ دیش میں اردو کے مشہور نظم نگار تھے۔ شعری مجموعہ ''راہ و رسم آشنائی'' کچھ ماہ پہلے ان کے رفیق علیم اللہ صدیقی نے کلکتہ سے شائع کرایا تھا۔ کافی دنوں سے حلق کے کینسر میں مبتلا تھے۔ ۷۰ سال کی عمر میں ۷ ارجولائی کو ڈھاکہ میں انتقال ہوا۔

(۵۹) ہارون رشید: اردو کے سرگرم صحافی اور مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کے زبردست حامی تھے۔ غازی پور میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجوشن کے بعد ہفت روزہ بلٹز (اردو) سے وابستہ ہو گئے اور جب اس کی اشاعت بند ہو گئی تو ۱۹۹۵ء سے ممبئی کے مشہور اخبار ''انقلاب'' کے مدیر بنے اور اس کے سنڈے ایڈیشن میں ان کے لکھے ہوئے اداریے بے حد مقبول ہوئے۔ ان اداریوں کا ایک مجموعہ ''مرا نور بصیرت عام کر دے'' شائع ہو چکا ہے۔ کافی دنوں سے ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھے۔ ۵۷ سال کی عمر میں ۴ مارچ کی شب میں ممبئی کے جسلوک اسپتال میں انتقال ہوا۔ پس ماندگان میں ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔

(۶۰) حاجی انیس دہلوی: یہ ۳۰ دسمبر ۲۰۰۰ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اصل نام نعمت اللہ تھا۔ حاجی عنایت اللہ کے بیٹے تھے۔ ۷ دسمبر ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ ''نرالی دنیا'' ڈائجسٹ اور ''رہبر'' نام سے ہفتہ وار اخبار نکالا۔ ماہنامہ ''فلمی ستارے'' ''خواتین کا رسالہ'' ''باجی'' اور سہ ماہی ''ایوانِ ادب'' بھی ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ شاعری میں استاد رسا دہلوی کے شاگرد تھے۔ شعری مجموعہ ''قدم بہ قدم'' اور نعتیہ کلام کا مجموعہ ''دستِ دعا'' ان کی یادگار ہیں۔ ۳۱ دسمبر کو قبرستان مہندیان دہلی میں دفن ہوئے۔ کفایت دہلوی، ناصر دہلوی اور سمیع دہلوی ان کے بیٹے ہیں۔

Deptt. of Urdu, Aligarh Muslim University,
Aligarh- 202 002

جوہر سیوانی کی شاعری

(جوہر ظرافت کی روشنی میں)

ظریفانہ شاعری میں زیادہ تر مقصد سے عاری مسخرگی، پھکڑپن اور عریانیت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ آج کے مزاحیہ شعرا کا مزاج نفاست طبع کی کمی کے باعث یا شے لطیف کی کمی کے سبب یا مطالعہ و مشاہدہ کے فقدان کی وجہ سے عدم توازن کا شکار نظر آتا ہے۔ اس میں کچھ تو شعرا کی اپنی طبعی افتاد کا قصور ہے اور زیادہ تر ماحول اور سماج کے مطالبے کا۔ بہر حال آج کی مزاحیہ شاعری پھبتی، ہجو، تفنن اور شوخی کی چہار دیواری میں مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ اگر کبھی کبھی مزاحیہ شاعری میں بلیغ مقصدیت نظر آ جاتی ہے تو سماعت چونک پڑتی ہے۔ جہاں تک چٹکیاں لینے کی بات ہے تو یہ سنجیدہ شاعری میں بھی اکثر نظر آ جاتی ہے لیکن وقت کے تقاضوں، سماج کی خامیوں اور علامتی انسانوں کی حماقت پر عریانی اور فحاشی سے دامن بچائے ہوئے بھرپور طنز کرنا آج کل جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس مرتبے کو سطحی شاعری یا شاعر نہیں پا سکتا۔ یہ بڑا اپتا مارنے کا کام ہے۔ اس کے لئے قوت مشاہدہ، ادراک اور مسائل کے ہمہ جہت پہلوؤں پر نظر ضروری ہے۔

جوہر سیوانی کو مزاحیہ شاعری ورثے میں ملی تھی۔ خود ان ہی کے الفاظ میں:

> ''میرے والد مرحوم جناب یوسف سیوانی اپنے دور کے ایک مستند ظرافت نگار شاعر تھے۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر انور حسین (انور سیوانی) ڈی۔اے۔وی کالج سیوان میں صدر شعبۂ اردو و فارسی تھے۔ ان ہی دونوں بزرگوں کے سایۂ عاطفت میں میرا بچپن گذرا اور میرے شعور نے آنکھیں کھولیں''۔

اُن کے بڑے بھائی انور سیوانی کی یادگار کے طور پر بزم انور کی ماہانہ نشستوں میں ان کی شاعری کو پروان چڑھنے کا خوب خوب موقع ملا۔ خود بہار عمومی حیثیت سے اور سیوان خصوصی طور پر مزاحیہ شاعری کے لئے بڑا اُپجاؤ تھا۔

جوہر صاحب نے سماج کی دکھتی رگ پر بھی انگلی رکھی ہے۔ وہ فطرتاً ایک استاد تھے۔ سماج کی کمزوریوں پر دل کڑھنا فطری بات تھی۔ امرجنسی کے زمانہ کی ''برکات'' بھی ان کے پیش نظر رہیں اور انہوں نے اسے بھی موضوعِ سخن بنایا۔ ''بہ فیضِ امرجنسی'' بڑی کامیاب نظم ہے۔ اس میں عام زندگی کے تلخ حادثوں کو قہقہوں میں اُڑانے کا بڑا اچھا سلیقہ جانتے تھے۔ ان کی ایک غزل، جس کا عنوان' .... تو غزل ہوتی ہے' ان ہی کے حسب حال نہیں بلکہ ہر سنجیدہ شاعر کے حسب حال ہے۔ تلخیوں کو قہقہوں میں اُڑانے کا حوصلہ لائقِ ستائش ہے۔

جوہر سیوانی کی مزاحیہ شاعری میں نوحے بھی مل جاتے ہیں۔ انہوں نے سماج، حکومت اور ماحول کی عصبیت سے بھرپور ذہنیتوں پر بڑے اثر آفریں نوحے کہے ہیں۔

بخشا گیا مقام ہر اک چیز کو مگر

اردو ہی کا مقام ابھی زیرِ غور ہے

گلستاں پر مساوی حق ہے دونوں کا مگر یارو

عجب تقسیم ہے یہ آم اُن کا گٹھلیاں میری

خود انہوں نے اپنا نوحہ بھی کہا ہے:

بیگم کو میری چھوڑ کر دو سالیوں کو لکھ دیا

میرے خسر نے اپنا گھر آدھا اِدھر آدھا اُدھر

سیاسی لیڈروں پر مزاحیہ شعرا کا خاص کرم ہوتا ہے اور سچ پوچھئے تو جمہوریت، سیاست اور الیکشن کو ہندوستان سے نکال دیا جائے تو مزاحیہ شاعری کے پچھتر فیصد موضوعات ختم ہو جائیں گے۔ مزاحیہ شاعری میں یہ چیزیں اپنی پوری تابانی سے ہیں۔ بدحواسیاں، قلابازیاں، خوبصورت وعدے، ردعمل کے طور پر توڑ پھوڑ، نیتاؤں کے در پر بھیڑ بھاڑ، ابن الوقتی، تقریر دلپذیر، الفاظ کی بازیگری اور جلسے جلوس کے رنگارنگ تماشے —— ان میں سے ہر ایک چیز مزاحیہ شاعری کا موضوع بنی ہے ''جوہرِ ظرافت'' میں ان سب پر بڑی فنی چابکدستی سے خیال آرائی کی گئی ہے۔

یوسف ناظم

ہمیں غصہ کیوں نہیں آتا

علم نفسیات کے ماہرین کا غصہ ایک اچھی عادت ہے اور جب یہ آئے تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ہے۔ یہ ماہرین کہتے ہیں کہ غصہ کی شدت کو معتدل کرنے کی کوئی ترکیب آزمانا جیسے اگر آپ کھڑے ہوں تو بیٹھ جائیں یا منھ ہی منھ میں کچھ پڑھیں۔ یہ ساری ترکیبیں غیر فطری، نامناسب اور قابل اعتراض حرکتیں ہیں۔ یوں بھی یہ سوچنے کہ بیٹھنے کی جگہ تو ملتی نہیں، آدمی لیٹ کیسے جائے گا۔ منھ ہی منھ میں پڑھنے کا کسی وقت وہ ہوتا ہے جب دل ٹھنڈا ہو۔ اسی لئے آدمی عام طور پر کسی بات پر سوچتے ہیں تو ٹھنڈے دل سے سوچتے ہیں۔ غصے کے عالم میں تو دل خاصا گرم رہتا ہے یعنی یوں سمجھیے تقریباً آتشیں ہوتا ہے۔ ایسے عالم میں اسے کیسے یاد آسکتا ہے کہ اسے کیا ورد کرنا چاہیے۔ غصہ اعضائے جسمانی اور خاص طور پر اعصاب کو تقویت پہنچاتا ہے بلکہ بعض ماہرین نفسیات تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان کی شہ رگ پر بھی اس کے اچھے اور دیرپا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ غصہ کو نہ صرف فطرت انسانی کا ایک جزو اعظم مانا گیا ہے بلکہ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ حیوانوں کو بھی اس نعمت سے سرفراز کیا گیا ہے جس کی مثال وہ لوگ یہ دیتے ہیں کہ گایوں اور بھینسوں میں غصے کے جراثیم بکثرت پائے جاتے ہیں اور جب بھی یہ دونوں موٹی گردنوں والی مخلوقات غصہ سے بے قابو ہو جاتی ہے تو فی الفور دودھ کے مقررہ کوٹے میں سے کافی دودھ چرا لیتی ہیں اور غریب گوالے کو عین وقت پر پانی کی تلاش میں وہاں مٹکوں، برتنوں اور بالٹیوں کی قطار لگی ہوتی ہے اور اسے بھی ان گایوں بھینسوں کی طرح غصہ آجاتا ہے۔ صبح سویرے کا غصہ کیا جاتا ہے کافی فرحت بخش ہوتا ہے اور اسے آسانی سے بیگمری میں اتارا جا سکتا ہے۔ (غصہ بھی کبھی باہر سے آنے والی سواری کی طرح ہوتا ہے جسے اپنے گھر میں اتارنا ہی پڑتا ہے)۔

غصہ ہماری دلچسپی کی چیز رہا ہے اور ہم برسوں تک غصہ سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ ایک وقت تو ہم نے ایسا بھی گزارا ہے کہ غصہ کی آمد کا انتظار ہی نہیں کیا اور مسلسل غصے ہی میں رہے۔ ہمارے ایک شناسا ممتاز علی خاں بھی ہمیں یاد ہیں۔ غصے کے بہت شوقین تھے اور انھوں نے شادی بھی غصہ ہی میں کی تھی ورنہ ان کے ہاتھ میں شادی کی لکیر تھی ہی نہیں۔ اور غصہ بھی انھیں اسی بات پر تھا کہ یہ لکیر گئی کہاں اور انھوں نے طے کیا کہ وہ ہاتھ میں لکیر تو نہیں پیدا کر سکتے لیکن ایک بیوی تو پیدا کر سکتے ہیں۔ (یہاں پیدا کرنے سے مراد تلاش کرنا ہے الفاظ کے لغوی معنی پر نہ جائیے) اور اب تو ماشاءاللہ ممتاز علی خاں کے گھر میں حاصل شدہ بیوی کے علاوہ ایک امتیاز علی بھی ہیں اور ایک شہناز بھی۔ موجودہ حالات میں اتنا غصہ کافی

ہے۔ ہم بھی جیسا کہ ہم نے عرض کیا ایک عرصے تک غصے کے عالم میں رہے۔ بس شب و روز یہی عالم تھا کہ ایک رنگ جا رہا ہے اور اور جو رنگ بھی آتا تھا چوکھا آتا تھا۔ ان دنوں سب سے زیادہ بار ہماری ناک پر پڑتا تھی کیونکہ ہمارا غصہ رہتا وہیں تھا۔ ناک نقشہ ہمارا برا نہیں تھا۔ اس لئے ناک تھی بھی اونچی۔ جس کا فائدہ یہ تھا کہ غصہ ہمیشہ نمایاں رہتا تھا۔ کئی دن بعد ہمارے ایک قریبی دوست نے ہمیں بتایا کہ ہم ناک میں سوئی لگوالیں (غالباً نیڈلنگ Needling کا لفظ استعمال کیا تھا) ہم چونکہ غصے میں تھے اس لئے ہم نے اپنے دوست کا مشورہ قبول فرمالیا اور ڈاکٹر سنگھ کے مطب میں جا کر اپنی ناک کی تصحیح کروالی۔ نیڈلنگ کا یہ ہنر ہمیں فن کتابت سے ملتا جلتا نظر آیا۔ فن کتابت میں تو غلطیوں کا ہونا ضروری ہے لیکن نیڈلنگ قطعیت کا فن ہے اور اس کی پروف ریڈنگ کا سوال ہی نہیں ہوگا۔ اسے حرف آخر سمجھ کر قبول کر لینا چاہئے۔ نیڈلنگ کو ہم نے بہت کارآمد چیز پایا ہے اور ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم اس کی تعریف و توصیف میں ایک قصیدہ لکھیں۔ نیڈلنگ خاص طور پر اُن شاعروں کے لئے بہت ضروری ہے جو مشاعروں میں اپنا کلام ناک کے ذریعے نشر کرتے ہیں۔ لیکن تفصیل پھر کبھی۔ اس وقت تو ہم صرف یہی کہیں گے کہ اس فن کو مقبول عام بنانے کی خاطر ہر اس شخص کو جدو جہد کرنی چاہئے جسے اپنی ناک عزیز ہو۔ ہم تو سمجھتے ہیں سوئی لگوانے کی ضرورت ہر اُس شخص کو ہے جو سیاست کے میدان میں مصروف اور برسرِ کار ہو۔ سیاست کا میدان بجائے خود ایک گُرہ بن گیا ہے۔ اس کرۂ ارض پر ایک کرۂ خود غرضی کا ضروری تھا۔ وہ وجود میں آچکا ہے۔ ادب کی طرح سیاست میں بھی کئی اصناف ہیں مثلاً صنف زرگری۔ حصول زر کے لئے اب جو گُر استعمال کیا جاتا ہے اس گُر کا انگریزی نام اکسٹارشن (Extortion) ہے۔ جس طرح پولس چوکی پر کسی ناکردہ گناہ ملزم سے حقیقت اگلوائی جاتی ہے اُسی طرح سیاست کے میدان میں مصروف لوگوں کو اپنے ممدوح سے پیسہ اگلوانا پڑتا ہے۔ اس لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل ہر شخص کی انگلی ٹیڑھی ہے۔ سیدھی انگلی سے یوں بھی پہلے کبھی کوئی کام ہوا ہے؟ سیدھی انگلی کو اب بذریعہ سیاست، ٹیڑھی انگلی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اکسٹارشن کو ملک کے دوسرے علاقوں میں کیا کہا جاتا ہے ہمیں معلوم نہیں ہے۔ لیکن ہم جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں اسے ہفتہ وصولی کہا جاتا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے یہ ترکیب ہمیں زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔ اسے غلط العوام سمجھ کر قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس ہفتہ وصولی کی بھی کئی شاخیں ہیں۔ اغوا اور حبس بیجا جیسے اعمال بھی اس شق میں آتے ہیں۔ اسے عملی تنقید کی طرح عملی سیاست کہا جاتا ہے اور اس عمل کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں حصہ لینے والا ہر شخص، ہمیشہ غصے میں رہتا ہے۔ غصہ آدمی کو چونکہ سرگرم عمل رکھتا ہے اس لئے سیاست کے میدان میں کبھی جمود نہیں آتا۔ ہر سیاست داں کرپشن (بدعنوانی) کا سخت مخالف ہوتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس کی لسانی مخالفت کے بغیر بدعنوانی کا جاری رہنا ممکن نہیں ہے۔

ہم یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ ہمیں غصہ کیوں نہیں آتا ہے۔ یہ اس لئے نہیں آتا ہے کہ اب اس میں فائدہ کچھ نہیں

ہے۔ آدمی کو حالات سے سمجھوتا کر لینا چاہئے اور خاص طور پر جب حالات مزاحیہ اور فکاہیہ ہوں۔ پہلے یہ صرف انشائیہ ہوا کرتے تھے یعنی ان میں کچھ ہوتا نہیں تھا سوائے سطروں کے۔ بین السطور تو ہوتے ہی نہیں تھے۔ انشائیے میں بین السطور کہاں سے آئیں گے۔ سابقہ سیاست بازی ضرور تھی لیکن یہ راست بازی تھی۔ راست بازی بھی بھلا کوئی بازی ہوئی۔ اس سے تو شطرنج کی بازی اچھی ہوتی ہے۔ اس میں آدمی کچھ سوچتا تو تھا۔ موجودہ صورتحال میں آدمی چوکنا رہتا ہے اور صبح اُٹھ کر پہلے اخبار میں یہ دیکھتا ہے کہ پٹرول اور ڈیزل میں قیمت کا اضافہ ہوا یا نہیں اور ہوا تو قیمت، قوتِ برداشت سے باہر نکلی یا نہیں۔ آدمی کی سمجھ میں آگیا ہے کہ بنیادی قیمت پٹرول ہی کی ہوتی ہے۔ اس میں اضافہ ہو جاتا ہے تو چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ پھول ہو یا پھول گوبھی، معمولی گھاس ہو یا کوئی چیز خاص الخاص۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جائے گی تو پٹرول ہی استعمال ہوگا۔ اکانومی (Economy) کا یہ نکتہ سرکار کی سمجھ میں آگیا ہے۔ جب یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا تو ہمیں غصہ آتا تھا کہ اتنی معمولی سی بات سرکار کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہی ہے۔ قیمتیں ایک جگہ رکی رہیں تو شبہ ہوتا تھا کہ وقت تو کہیں رک نہیں گیا۔ اب ہمیں اگر غصہ کبھی آیا تو صرف اس بات پر آتا ہے کہ یہ 'افراطِ زر' کیا چیز ہے۔ آج تک ہمارا بینک بیلنس تو دور رہا ہماری جیب میں کبھی 'افراطِ زر' کی صورت نہیں پیدا ہوئی بلکہ اب تو کبھی پینٹ یا شرٹ سلواتے ہیں تو اپنے درزی سے کہہ دیتے ہیں کہ جیبیں دو یا تین سے زیادہ نہ ہوں۔ ان میں رکھنا ہی کیا ہے اور چور جیب تو بالکل نہیں چاہئے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ ہماری پتلونوں پر زخم کا نشان اسی جگہ ہوتا تھا جہاں عموماً یہ چور جیب آویزاں کی جاتی تھی۔ وہی جگہ ان لوگوں کی توجہ کا مرکز رہتی تھی جو اس پر اپنا ہنر آزماتے ہیں۔ آخر یہ لوگ بھی پینٹ پہنتے ہوں گے جو کوئی نہ کوئی درزی ہی سیتا ہوگا۔ (ہوسکتا ہے کہ یہ ان کا خاندانی درزی ہو) اس لئے ان سب لوگوں کو معلوم رہتا ہے کہ نشانہ کہاں لگانا ہے۔ پتلونوں میں اب سب سے زیادہ غیر محفوظ جیب بھی چور جیب ہے۔ شروع شروع میں افراطِ زر بھی اسی جیب میں ہوا کرتا تھا۔ اب افراطِ زر کی ماہیت چونکہ ہماری سمجھ میں آگئی ہے اس لئے غصے کے آنے کی یہ وجہ بھی جاتی رہی۔ یوں بھی اب چھوٹی موٹی وارداتوں پر لوگ اپنا وقت اور ہنر ضائع نہیں کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو ایک زمانے میں اپنا تقریباً روزانہ کا طریقہ حیات بنا لیا تھا کہ کام سے فارغ ہو کر جب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو تقریباً بسورتے ہوئے داخل ہوتے اور افراد خاندان جن میں بیوی یعنی ان کی اپنی بیوی پیش پیش ہوتیں، کے پوچھنے پر مری ہوئی آواز میں سب کو مطلع فرماتے کہ ٹرین سے سفر کرنے کے دوران ان کی وہ جیب جو افراطِ زر سے لبریز تھی، راستے میں کہیں کٹ گئی اور یہ اُن کی تنخواہ کا دن ہوتا۔ خبر سن کر سننے والوں کی جن میں ان کی اپنی بیوی پیش پیش ہوتیں، صورتیں یک لخت اُتر جاتیں اور ہر کسی کی آنکھوں کے سامنے اس کا ایک نہ ایک مسئلہ منہ پھاڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ لیکن جب ان مبینہ وارداتوں میں بھی افراطِ زر کی صورت پیدا ہو گئی تو چند ذہین بیویوں نے اندر ہی اندر اپنے خفیہ ذرائع سے حقایق کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں کی اور انہیں اُن کی ذاتی اسکاٹ لینڈ خفیہ

ٹیم نے بتا دیا کہ عین تنخواہ کے دن شوہر کی جیب کہاں جا کر کٹتی ہے۔ جیبیں کٹنے کی خبریں سن کر ہمیں بھی غصہ آتا تھا، اب نہیں آتا کیوں کہ اب تنخواہیں بالعموم راست بینک میں بھیجی جانے لگی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مشاغل میں مصروف ہنر مند لوگوں نے کساد بازاری کی وجہ سے خود ٹرینوں میں سفر کرنا ترک کر دیا ہے۔ وہ غصے میں صرف چلتی ٹرینوں پر پتھر پھینکنے لگے ہیں۔ اطبا نے بتایا ہے کہ چلتی ٹرین پر پھینکنے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور اس کا فایدہ وہی ہوتا ہے جو فصد کھلوانے سے ہوا کرتا تھا۔

ہمیں اب غصہ اس لئے بھی نہیں آتا کہ عوام کے اُن مشاغل میں جو آمدنی کا ذریعہ تھے، ان کے محافظوں نے خود ہی حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ یہ تقسیم کار بھی ہے اور اشتراک بھی۔ اگر ملک کے سارے باشندے شانہ بہ شانہ ان مشاغل میں حصہ لینے لگیں تو کسی کو غصہ کیسے آسکتا ہے۔ گنگا جب بہہ رہی ہو، خواہ وہ الٹی ہی کیوں نہ بہے، سب کو ہاتھ دھو لینا چاہئے۔ کنارے پر کھڑے رہ کر صرف لہریں گننے کا فایدہ کیا ہے۔

غصے کے بارے میں ہم نے کئی اقوال پڑھے ہیں جو ہمیں از بر تو نہیں ہیں لیکن کبھی کبھی یاد ضرور آجاتے ہیں۔ ان میں سے ایک قول جو اس وقت ہمیں یاد آرہا ہے یہ تھا کہ اگر کوئی شخص بہت غصے میں ہو اور تمہیں بُرا بھلا کہہ رہا ہو تو ٹوکو مت۔ تم ٹوکو گے تو اُس کے غصے میں مزید اضافہ ہوگا اور وہ تمہیں بُرا بھلا کہنے کے بعد کی منزل تک جانے میں تکلف نہیں کرے گا۔ یہ قول ہمیں بہت پسند آیا تھا اور ایک مرتبہ ہم نے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ہم کئی دن تک گھر کے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ اس سانحے کے بعد ہم نے اپنے مزاج میں ٹھنڈک پیدا کر لی۔

یوں بھی غصہ اب اُس آمد کی طرح ہو گیا ہے، جو شاعری کے لئے 'مہمیز' ہوا کرتا تھا۔ موجودہ حالات میں مضامین خیالات آورد کے پابند ہو گئے ہیں۔ آپ شاید یقین نہ کریں لیکن ہم نے ایک صاحب حیثیت شاعر دوست کے گھر کے پھاٹک پر 'آمد' کی تختی کی جگہ 'آورد' کی تختی لگی دیکھی ہے اور 'رفت' کی تختی کی بجائے 'برآمد' کی تختی۔ آپ کو یقین نہیں آیا نا۔ لیکن آپ خود جا کر کلنٹن روڈ پر دیکھ لیجئے۔ ویسے کلنٹن روڈ کا نیا نام ہمیں معلوم نہیں ہے۔

ہمیں اب بھولے سے کبھی غصہ آیا تو صرف اس بات پر آتا ہے کہ اس کی جنس کیوں بدل گئی ہے اور غصہ غصّی ہو کر رہ گیا ہے اور غصّہ بھی بھلا کوئی آنے یا لانے کی چیز ہے نہ آمد کی نہ آورد کی۔

ظفر کمالی

ادب اور سی بی آئی

کچھ عجب اردو ادب کا حال ہے — نثر ہو یا شاعری فٹ بال ہے
ہر طرف جاری ادب کا میچ ہے — پگڑیوں کا بھی اچھلتا کیچ ہے
ہیں ادب میں بھی گھٹالے اس قدر — سلطنت اردو کی ہے زیر و زبر
نور پر ظلمت نے قابو پا لیا — ماہ کامل کو گہن ایسا لگا
شرم ہے کوئی نہ جس کو لاج ہے — اس کے سر پر عظمتوں کا تاج ہے
تھامنے جس کو نہیں آیا قلم — ہاتھ میں اس کے ادب کا ہے علم
جن کا رتبہ ہے ادب میں مثلِ زاغ — وہ بھی سورج کو دکھاتے ہیں چراغ
بن گئے گھس پیٹھیے سارے امام — سب جنھیں کرتے ہیں جھک جھک کر سلام
من ترا حاجی بگویم کا ہے زور — بلبلیں تو چپ ہیں کوؤں کا ہے شور
کوئی کہتا ہے کہ میں سقراط ہوں — کوئی کہتا ہے او بقراط ہوں
شاعروں کی جس قدر ہیں ٹولیاں — بولتی ہیں ایک جیسی بولیاں
ہو رہی ہے خوب نثری شاعری — شاعری کے نام پر ہے واعری
فاعلاتن فاعلن سے بیر ہے — جہل کی ان کے اسی میں خیر ہے
ہیں ہمارے جو مدیران کرام — ان کے ہاتھوں میں ادب کی ہے لگام
ہو گئے ڈالر کے وہ ایسے اسیر — مل نہیں سکتی کہیں جس کی نظیر
خاص نمبر چھپتے ہیں زردار پر — فن سے بے بہرے کسی فن کار پر
آ گئیں جس کو ذرا تک بندیاں — اس پہ بھی گوشے نکلتے ہیں یہاں
جو غزل بر سفارش میں لکھے — وہ سبھی نامی رسالوں میں چھپے
تاج دارِ فن کا ملتا ہے خطاب — ایسے ویسے بن گئے عالی جناب
دیکھ لو نظریں اٹھا کر چار دانگ — دے رہے ہیں ہر طرف چوزے ہی بانگ
جتنے چوزے ہیں وہ فن میں فرد ہیں — میر و غالب ان کے آگے گرد ہیں

بن گئے کتنے سخن کے تاجور
سر پہ عظمت کا لگا کر پوسٹر

جو تھے گونگے وہ اذاں دینے لگے
کشتیاں خشکی میں ہی کھینے لگے

دار نہیں پھانسی کا جب کوئی رہا
ہر طرف شور انا الحق ہے بپا

دس ہزاری تھیسس اب بکنے لگی
گائے جو بھی بانجھ تھی بیکنے[1] لگی

در بغل تھیسس کی ہے کھاتا بہی
اور گلیوں میں صدا ہے "لے دہی"

جو کہ بیڑی چھاپ ایک قوال تھا
مستحق وہ بھی مقالے کا بنا

شاد کے گھر میں تھے کتنے جانور
لکھ کے اس پر بن گیا اک ڈاکٹر

مٹھیوں میں درہم و دینار گرم
سرقۂ بالجبر کا بازار گرم

روز چھپتا ردّیوں کا ڈھیر ہے
یوں ادب کے نام پر اندھیر ہے

بے خیالوں میں ابھی تک جو کتاب
تبصرے اس پر لکھیں عزت مآب

شعری مجموعوں کی پھیلی ہے وبا
جس کی بوٗ سے پُر تعفن ہے فضا

چاہیے تھا جن پہ ہونا شرمسار
ان پہ اترایٹ کا ہے سر میں خمار

مفت پڑھنے کو کوئی راضی نہیں
بن گئے دولھا مگر قاضی نہیں

رسم اجرا کا مرض بھی عام ہے
سکۂ کاسد کا لگتا دام ہے

ناشتے کا خوب تر ہے اہتمام
جس میں شامل ہے خوشامد کا قوام

باندھ کر احباب تعریفوں کے پُل
صاحبِ تصنیف کو دیتے ہیں جُل

مل گئے جب ان کو ڈالر اور ریال
بے کمالوں کو بتایا با کمال

اسپِ تازی اس کو لکھا تھا جو خر
پھر بھی کہلائے وہی انصاف ور

ہیں کھلے اردو ادارے چار سوٗ
نام پر ہے کام کے اللہ ہوٗ

وہ رقم ملتی ہے جو سرکار سے
خرچ ہوتی ہے عجب اطوار سے

"محفلِ غیبت" سجاتے ہیں کبھی
شامِ قوالی مناتے ہیں کبھی

رکھ دیا لکچر کسی دن یار کا
یعنی موقع نقد کاروبار کا

جشنِ حالؔی جشنِ غالبؔ جشنِ میرؔ
جن میں شامل ہو گئے منکر نکیر

ایک دن میں بن گئی بزمِ فلاح
آ گئے کرنے منسٹر افتتاح

1۔ بیکنا۔ ایک مقامی لفظ بہ معنی حمل قرار پانا۔ (ط-ک)

لاش پر اردو کی ہوتا ٹھاٹ ہے ٹوک دے جو اس کو دھوبی پاٹ ہے
حق تھا جن کا نام ان کے کٹ گئے سارے انعامات یوں ہی بٹ گئے
مستحق منہ دیکھتے ہی رہ گئے "دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے"
بھائی بندوں سے کمیشن مل گیا سوٹ جاڑے کا نہیں تھا سل گیا
پڑھ لیا اردو زباں پر فاتحہ کر لیا لیکن محل اپنا کھڑا
جس قدر ہیں آج درباری ادیب بن گئے ہیں خود ہی اردو کا نصیب
دم ہلاتے ہیں جو آقا کے حضور خار و خس کے ڈھیر کو کہتے ہیں طور
کرتے رہتے ہیں جو کرسی کا طواف غیرتوں کا خون ہے ان کو معاف
ہو رہے ہیں روز ہی سمپوزیم بے بھرم آتے ہیں بن کر محترم
جس کو کرسیِ صدارت مل گئی وہ سمجھتا ہے وزارت مل گئی
سج گئی جب مرغ اور ماہی کی میز جام کی گردش ہوئی کچھ اور تیز
تب ادب کے فیصلے ہونے لگے داغ زخموں کے سبھی دھونے لگے
ہیں حقیقت میں جو نادانِ ادب جاری کرتے ہیں وہ فرمانِ ادب
جو کہ دانشور کو "دعنشور" لکھے اس کی ہی دانش کے ڈنکے پٹ گئے
علم کی تہمت جسے بھی لگ گئی ناقدِ اعظم بنا وہ شخص بھی
ناقدوں کے گھر تو برسا خوب دھن لگ گیا اردو ادب کو گرچہ گھن
نام پر تنقید کے لکھ کر ٹریش[1] ہو رہا ہے یوں ادب بھی خوب کیش
فکر کے لنگڑے بھی یوں بڑھنے لگے شہرتوں کے بانس پر چڑھنے لگے
مال مغرب سے در آمد کر لیا مشرقی لیبل دیا اس پر لگا
دے رہے ہیں اصطلاحوں کا فریب ان کے رخصت کیوں نہ ہوں صبر و شکیب
گرد ان کے چاپلوسوں کا ہجوم ایک جاہل کو کہیں بحرِ علوم
ناقدِ اعظم کی جے جے کار ہے اس طرح ان کا بھی بیڑا پار ہے
ہیں یہاں ایسے بھی افسانہ نویس دو ٹکے ہے جن کے افسانوں کی فیس
وہ بھی یہ کہنے لگے ہیں ٹھونک خم ہم نہیں ہیں گورکی چیخف سے کم
ذہن پر منٹو ہوا جس کے سوار جنسیت کا چڑھ گیا اس کو بخار

1- Trash

نقل غیبی کی کوئی کرتا ہوا / شہرتوں کی حرص میں مرتا ہوا

جان سے بیدی کے ہے چمٹا کوئی / کافکا کی گود میں سمٹا کوئی

اپنے ہاتھوں سے لکھیں خود کو عظیم / گھاس چرنے کو گئی عقلِ سلیم

آج کل ہے دورِ ما بعدِ جدید / ہو گئے کتنے ہی اس رہ میں شہید

ہر قدم پر ہے غدر جیسا سماں / چینٹیوں کو پر نکل آئے یہاں

ہے سفر ناموں کے جوبن پر نکھار / نام پر فن کے فقط گرد و غبار

پڑھ کے تاریخی کتابیں آٹھ دس / دل میں ہے سیاح بننے کی ہوس

ہند کے باہر نہیں رکھا قدم / ہاتھ میں لے کر چلے لٹھ کا قلم

آنکھوں دیکھا حال دنیا کیا نے / راجدھانی چین کی، پیرس نے

بی بی سی لندن کا دفتر قاہرہ / ڈائرکٹر جس کی بی بی طاہرہ

ناشتہ تو کر لیا ایران میں / چائے پینے چل پڑے جاپان میں

آئے استقبال کو صدام بھی / ساتھ ان کے سیکڑوں خدام بھی

جونیئر بش کی زیارت بھی ہوئی / ٹونی بلیئر سے شرارت بھی ہوئی

الغرض جو ہیں سفر نامہ نگار / ایک سچ میں جھوٹ ان کے دس ہزار

اپنے قاری کو سمجھ کر بے وقوف / جھوٹ کا آنکھوں میں جھونکیں وہ سفوف

ان سفر ناموں کو پڑھ لیں آپ اگر / دل کہے دنیا سے کر جاؤ سفر

خود نوشتوں کا ہے جاری سلسلہ / جھوٹ کی ہے چھوٹ جن میں برملا

عظمتوں کا ہے قصیدہ ہر ورق / پڑھ کے روشن جس کو ہوں چودہ طبق

پیٹ میں ایسے پڑھاکو ہو گئے / جیسے لٹریچر کے ڈاکو ہو گئے

پالنے میں تھے ابھی حضرت کے پانو / مارتے تھے نیطشے، ہیگل کو داؤ

بولتے تھے بات اک اک تول کر / پی گئے تھے فلسفہ بھی گھول کر

گوئٹے تھا ان کا اک ادنا غلام / تھامتا تھا ان کے گھوڑے کی لگام

ان کا ہی دربان افلاطون تھا / جسم میں اس کے بھی فاسد خون تھا

ان کے گھر بھرتا تھا پانی سارتر / باندیاں دھوتے تھے جتنی کارتر

دوست دادا کا تھا جن کے شیر شاہ / ان کے ہی گھر لی ہمایوں نے پناہ

جن کے دم سے وہ ہوئے تھے معتبر
وہ بھی لٹکے ان کے دار طنز پر

تھے جو ظالم ہو گئے مظلوم وہ
جو گرہ کٹ تھے ہوئے معصوم وہ

لوٹتے ہیں دوسروں کی آبرو
جو بھی اچھا ہو اسی پر "آخ تھو"

گھڑکیاں مجروحؔ کو سردارؔ کو
دھمکیاں عابد رضا بیدارؔ کو

ڈالتے ہیں بھنگ وہ ہر رنگ میں
جھونکتے ہیں یوں ادب کو جنگ میں

وہ محقق ذہن ہے جن کا اجاڑ
کھود کر چوہیا نکالیں وہ پہاڑ

ذوقؔ کو کس سن میں آیا تھا بخار
روز غالبؔ کتنی لیتے تھے ڈکار

جھومتے تھے دردؔ کیسے حال میں
کیوں نمک وہ ڈالتے تھے دال میں

اک محقق نے تو یہ ثابت کیا
تھے ولیؔ کے میرؔ رشتے میں چچا

دوست ضاحکؔ تھے میاں چرکینؔ کے
تھے بھتیجے وہ کلیم الدینؔ کے

داغؔ کے استاد تھے عبد الصمدؔ
جن کی مالک رامؔ نے کھودی لحد

ایک دہشت گرد تھے قاضی ودودؔ
خوب پڑھتے تھے ادب کا وہ درود

مرثیہ غالبؔ کا خسروؔ نے لکھا
شیخ سعدیؔ نے جسے رو رو پڑھا

شادؔ کی تصنیف ہے "آبِ حیات"
مثنوی حالیؔ کی "یادوں کی برات"

لکھ گئے ہاترنگؔ "نیرنگِ خیال"
جس کی فاروقیؔ نے کھینچی خوب کھال

تھے جمیلِ مظہریؔ جاپانؔ کے
جن کے دادا جان تھے سیوانؔ کے

گو نہیں **معلوم** مطلب متن کا
چاہیے اعزاز بھارت رتن کا

چند ایسے ماہر اقبال ہیں
لوگ کہتے ہیں کہ نور لال ہیں

ڈومنی پر بھی اگر کچھ لکھ دیا
ماہر غالب وہ کہلانے لگا

طفل مکتب ماہر فن ہو گئے
موم کے پتلے تھے آہن ہو گئے

جو ممولے تھے بنے شہباز وہ
پر نہیں لیکن کریں پرواز وہ

ہے یہی اردو کا قصہ مختصر
ہے ادب کی ناک میں دم اے ظفر

بن گئے جتنے بھی پربت رائی سے
جانچ ہو ان سب کی سی بی آئی سے

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

فیضانِ عُرفی

(عرفیؔ کے چار اشعار کی تضمین)

آزاد! دل کا راز بیاں کس طرح کروں — کچھ اور شے ہے یہ نہ فسانہ نہ ہے فسوں

بیگانہ عقل سے ہو، نہیں ہے یہ وہ جنوں — راحت اسے ہنسی میں نہ رونے میں ہے سکوں

"آن خستہ ام کہ در تپ صفرا و جوش خوں

فصادش آتشِ جگر و شعلہ نشتر است"

ہے یوں تو مجھ کو اپنے کمالِ سخن پہ ناز — لیکن در اصل اس کا سبب ہے مرا نیاز

پنہاں مری نوا میں ہے جو سوز جو گداز — عُرفی کے ایک شعر سے کھلتا ہے اس کا راز

"کوتہ کنم عبارت و معنی کنم دراز

آن بلبلم کہ نغمہ زنِ باغ حیدر است"

بھٹکا نہ راہِ عشق سے اب تک مرا قلم — سنتا رہا نوائے خموشی کے زیر و بم

منزل کی سمت ہی یہ بڑھاتا رہا قدم — لکھتا رہا فقط مدحِ معدنِ کرم

"آن رہ نوردِ وادیِ بیت المقدسم

کو را صدائے شہپرِ جبریل رہبر است"

اے دل! کہاں سے آئی نسیم بہارِ عشق — شعلہ جو بن گیا ہے بھڑک کر شرارِ عشق

لفظوں میں آسکے گا نہ اب اعتبارِ عشق — ہے آج نورِ عشق جو کل تک تھی نارِ عشق

"آن ہدہدم کہ در چمنِ لالہ زارِ عشق

تاجش ز شعلۂ شجرِ طور بر سر است"

●

A-25, Government Quarters,
Ghandhi Nagar, Jammu Tawi - 180 004

تیسرے ہزارے کا قصیدۂ المیہ

(ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کی نذر)

عجب سر تال سے آراستہ ہے سازِ فکر و فن
نوائے حسن میں چھم چھم صریرِ عشق میں چھن چھن

تجوِ لفظ و معنی سے ہوئے اوراق بھی روشن
بجز صلوٰۃ کیا ہے سینۂ الفاظ کی دھڑکن

لسانِ صاحبِ نعمت کی ہر اک بات بھی کندن
کہاں ادراک کا کاسہ کہاں عرفان کا مخزن

حصارِ چشم سے بڑھ کر نہیں ہے کوئی بھی مامن
میسر ہر گھڑی ہے پتلیوں کو یار کا درشن

نظر کی پرورش پلکوں کے سائے میں ہوئی ایسی
طوافِ روئے جاناں کے لئے مخصوص ہیں نین

مزامیرِ سخن کو لحن داؤدی سے نسبت ہے
تواجد میں سماعت ہے تو رقصاں یار کی چتون

مکمل ذات ہی کو دید کی توفیق ملتی ہے
ہیں چشمِ ظاہر و باطن برائے لذتِ گفتن

بلا کی شان پیدا ہو گئی ہے حور پیکر میں
ملا ہے جب سے رخ پر اس نے میرے اشک کا ابٹن

گل و لالہ لب و رخسار کے ہم شکل کیا ہوں گے؟
رگِ جاں کے لہو سے تر بہ تر جب تک نہ ہو گلشن

نہ ہو جب دسترس میں تو شمار اس کا ہے دلدل میں
نہ ہو جب پیار کے قابل تو پھر کس کام کا جیون

مجھے منظور ہے دوزخ ہی جنت کے تعیش سے
تجلس کر دا نغبائے معصیت بن جاتے ہیں کندن

بہ وقتِ نزع بھی پھرتا رہا آنکھوں میں اک چہرہ
بہ وقتِ دفن بھی بجتے رہے پازیب اور کنگن

مجھے بھی دفن کرنا کوئے محبوبِ الٰہی میں
جہاں ہے غالب و خسرو کو حاصل یار کا دامن

تشنگ کا سنپولہ دل کی بانبی سے نکل آیا
کرشمہ رقصِ طاؤس طریقت کا ہے کیا ویدن

مسلماں حمد میں مصروف، ہندو نعت خوانی میں
محمدؐ کا نہیں ہے بُت پرستوں کا خدا دشمن

خدا والوں میں جب سے مہرشی ہم بن کے بیٹھے ہیں
ہمیں مغموم پا کر گا رہی ہے جوگیا جوگن

بڑھاپا بزمِ خوباں میں جوانی جنگ میں گذری
ہوا تھا حیف ستیاناس بالک ہٹ سے بالکپن

رتن کو ہم جتن کرتے، برتتے وقت پر ہمدم
نہ دن یہ دیکھنا پڑتا نہ ضائع ہوتے تن من دھن

برت کر دیکھ لینا اک نہ اک دن ٹوٹ جائیں گے
ہے دل جامِ سفالیں دست و پا ہیں کانچ کے برتن

دلِ دردآشنا کو گوشت کی اک قاش مت سمجھو
یہ من موہن، یہ من سوہن یہ من درپن، یہ من جیون

میں جب تک خون میں تھا باپ کے عیسیٰ تھا موسیٰ تھا
گذرگاہِ خدائے دو جہاں میں تھا مرا مسکن

چھلانگ ایسی لگائی میں نے سوئے جنت حوا | جہاں نو ماہ تک حاصل ہوئے آداب مستحسن
چمک اس کی دمک ایسی تھی دامان کواکب میں | مہکتے تھے اسی کے عطر سے جنت کے پیراہن
ولادت جب ہوئی میری نظر نے پھول برسائے | تھا مستقبل کو حاصل میرے ماضی کا نکیلا پن
کراماً کاتبین ایسے معلم بن گئے میرے | سرا سر بو علی سینا کا ہمسر تھا مرا بچپن
میں بچپن میں پپیہا تھا جوانی میں بنا کوئل | بڑھاپے میں مگر اوٹن کبوتر بن گیا ہے من
بہتر سال میں اک سال بھی خنداں نہیں گذرا | سماعت کے کہاں قابل تھے میرے نالہ و شیون
کچھ اس انداز سے سب نے چلائے طنز کے نشتر | بدن تو صاف بچ نکلا مگر من میں پڑے روزن
وہ کیسی انکساری تھی وہ کیسی جاں ستانی تھی ؟ | دریدہ تھا دہن اس کا خمیدہ تھی مری گردن
ہمارے خون میں تھے موجزن دس سال دس بچے | وہ نکلے نو مہینوں بعد بن کر باپ کے ولن
وہ کوفہ ہے وطن اپنا پرائے ہوں کہ اپنے ہوں | گلوں میں ناگ کے پھن ہیں پھلوں میں ہیں وہ اندرائن؟
صدی اکیسویں کی تیسرا ایسا ہزارہ ہے | کوئی ناگن کوئی ڈائن کوئی لچھمن کوئی راون
کوئی بھی جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ نہیں کہتا | کہ عالم اور جاہل ایک ہی تھالی کے ہیں بینگن
یقیناً قابلِ لاحول ہے ماحول ہی سارا | سمجھنا ہے محال اب کون رہبر کون ہے رہزن
ہر اک سنگِ لحد کو سب نے سِل بٹا بنایا ہے | ہر اک تربت کی مٹی بن گئی سب کے لئے منجن
"گلوں سے خار اچھے ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں" | بہ ظاہر بھی نظر آتا نہیں اپنوں میں اپنا پن
کچھ ایسے مولوی ہیں باپ کو نوکر سمجھتے ہیں | نظام درسگاہی سے چلے بن کر چھری چھتن
بہت مایوس ہو کر ہم نکل جاتے ہیں جب گھر سے | پکڑ کر ہم کو لے جاتے ہیں کھانے کے لئے پچشن
ادب کی سرزمیں پر بے ادب لوگوں کا قبضہ ہے | ہے روئی شاعری ان کی قلم ان کے لئے بیلن
زمیں کے حکمرانوں کو میسر سیکڑوں نعمت | دلوں پر حکمرانی کرنے والوں کے لئے کھرچن
تصادم مندر و مسجد میں اور ہندی و اردو میں | بری ہے ان بکھیڑوں سے فقط جنگل کا ویرپن
وہاں لے کر چلا ہے توسنِ فکرِ رسا مجھ کو | جہاں ہے میرے استقبال کو شب خون کا ساجن[1]

بہ وقتِ گریہ منہ دستِ دعا سے ڈھانپ لیتا ہوں
زمانہ سن رہا ہے کاوشؔ کو طوعاً و کرہاً

---

1 سرسوتی سمان

جذب گوپال پوری مرحوم

امن کے لئے جنگ

خوب ہی لہرا رہے ہو حق کا پرچم آفریں!
آفریں! اے طالبانِ امنِ عالم آفریں!

امن کی خاطر لڑائی چھیڑتے آتے ہو تم
چار آنکھیں تو کرو کیا ہے جو شرماتے ہو تم

جب کہ اپنے کو مسیحائے زماں کہتے ہو تم
پھر بھلا تخریب کے دھارے میں کیوں بہتے ہو تم

روندتے جاتے ہو پیہم، پھر بھی یہ بکواس ہے
آدمی کی جان گویا جنگلوں کی گھاس ہے

دعوتیں ہیں متصل دنیا کو قتل و خون کی
تابہ کے طغیانیاں یہ سطوت ملعون کی؟

کھائے جاتا ہے جہاں کے استخواں عفریتِ جنگ
اور مرے جاتے ہو تم بہرِ خیالِ نام و ننگ

کب تلک آخر یہ زورِ آگیں سیاست کب تلک
زہر کے ساغر کو بتلاؤ گے شربت کب تلک؟

ڈھونڈتے ہو سرخوشی کی لہر دیپک راگ میں؟
اور جنت کو جہنم کی دہکتی آگ میں؟

وقت بیداری کے ہنگاموں میں لذت خواب کی؟
شعلہ ہائے تند کی لپٹوں میں خنکی آب کی؟

شعلۂ خورشید میں سرد و خنک تاروں کی روح؟
چشم ہائے سیل اور دامن میں فواروں کی روح؟

فتنہ آلودہ خزاؤں میں بہاروں کا مزاج؟
ژالۂ تخریب فطرت میں پھواروں کا مزاج؟

رہنمائی کی ہوس گمراہ کن شیطان سے؟
خواہش تعمیر اکڑتے اینڈتے طوفان سے؟

تتلیوں کا حسن اور چمگادڑوں کے روپ میں؟
چاندنی کی دلفریبی چلچلاتی دھوپ میں؟

مجلسِ ماتم کے اندر محفلِ شادی کا رنگ؟
دشت میں گلزار کا، مدفن میں آبادی کا رنگ؟

نغمہ سنجی کی طلب میدانِ گیرودار میں؟
شعر کی درخواست شاعر سے بھرے بازار میں؟

رحم کی امید کج فہمو! خم شمشیر سے؟
کام لینا چاہتے ہو ہار کا زنجیر سے؟

لیکن اے دل دادگانِ فکرِ امنِ روزگار
غیر ممکن ہے خزاں کے ساتھ پیوندِ بہار

سچ بتانا کیا نہیں آگاہ تم اس راز سے
اس لڑائی کا کوئی رشتہ ہے حرص و آز سے؟

آسمانِ جور پرور سے نہیں آئی ہوئی
یہ بلا تم پر تمہاری ہی تو ہے لائی ہوئی

اس مصیبت سے رہائی کی ہے بس تدبیر ایک
یوں تو نسخے اور بھی ہیں، ہے مگر اکسیر ایک

چار سُو طرحِ مساوات و اخوت ڈال دو
دل کے سانچے میں دماغِ خود پسندی ڈھال دو

ورنہ ننگِ خواجگی و بندگی کے ساتھ ساتھ
امن کے گوہر کو پا سکتے نہیں ہرگز یہ ہاتھ

جب تلک باقی ہے یہ تفریقِ آقا و غلام
روزِ روشن پر یوں ہی چھائی رہے گی تیرہ شام

الحذر! اے بندگانِ نفس و آقایانِ دہر
اٹھ چکی ہے سینۂ عالم میں آزادی کی لہر

کون ہے جو انقلابِ دہر سے ٹکر لے سکے
کس میں قوت ہے کہ طوفاں کے طمانچے کھا سکے

تم بھی انساں ہو ہمیں بدبخت انسانوں کی طرح
ننگوں، بھوکوں، مفلسوں، بے ساز و سامانوں کی طرح

پھر تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ سلطانی کرو
ہم جہاں گردی کریں اور تم جہانبانی کرو؟

توڑ دو للہ رشتہ برتری کا توڑ دو
چھوڑ دو ہاں اب ہمیں حالت پہ اپنی چھوڑ دو

فکر خود کرلیں گے اپنے دردِ بے درماں کی ہم
کیا کریں امید تم سے عیسیٰ دوراں کی ہم

باقر مہدی
ممبئی

پہلی کہانی

کتنے دن، کتنی راتیں
سوچ رہا ہوں
کیا تھی وہ—کون تھی وہ
آج مجھے کچھ یاد نہیں!

(۲)

بجلی چمکی بادل گرجے
اور کہانی کی ننھی ننھی بوندیں
سادے کاغذ پر ٹپکیں
گیند نے مجھ کو کھیل سکھایا
چڑیوں نے بولی بخشی
میں تتلا کر کچھ بولا
میری دادی خوشی سے بولی
"اب تو مجھ سے باتیں کر"
میں نے پہلا لفظ کہا
آج مجھے وہ یاد نہیں
کانوں میں کتنے لفظ جمع تھے لیکن
ہونٹ پہ آتے ڈرتے تھے

فرش پہ لیٹ کے میں نے دیکھا
اڑتے بادل گرج رہے ہیں
شاید میں نے ذہن میں سوچا
بوندوں کی بھی ایک کہانی ہوتی ہے
بادل، بجلی چڑیاں پیڑ
سب نے مجھے آوازیں دیں
میں ڈر کر—دادی کے گود میں بیٹھا
اس نے مجھ کو پیار سے دیکھا—بولی
تو ساری باتیں سن سن کر—اک دن "شاعر" بن جائے گا

میں کیا کہتا—حیرت سے سب کو تکتا تھا
"دودھ پی کر—غوں غوں کرتے ہو
سمجھے تم کیا کہتے ہو!
میں نے آنکھیں بند کیں اور سو سا گیا
خواب میں کوئی پری نہ آئی
میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا
پھول پرندے—مجھ کو سوتا دیکھ کے
ہنستے ہیں—میں بھی ہنسا

(۳)

پہلی کہانی صفر سے آگے جانے لگی
ایک صفر تھا اس نے مجھے گلے لگا اور بولا

"جینا ہے صفر سے آگے مت جانا!
بھوتوں کی یہ دنیا ہے
ننھے بچے پھول ہیں لیکن
بڑھ کر وہ مرجھا جاتے ہیں
اور—شہروں کی کالی کالی سڑکوں پر
مارے مارے پھرتے ہیں
ٹھوکر کھا کر مر جاتے ہیں
میں نے رو رو کر دادی کو جگایا
بھولے—کچھ تو بولو
میں کیا کہتا—چپ چپ
پھر سو بھی گیا
میری کہانی بن نہ سکی
آج تلک بے نام رہی!

مختصر نظمیں

ظہیر غازی پوری
ہاشمیہ کالونی پکمل، ہزاری باغ

اپنے خول سے نکلیں

وقت!
کالی سیاست کی
سرکش نوازش پہ ممنون
اک بے ضرر راہرو

آدمی!
پیلی امید کے
پیکر ناتواں پر
کہیں سرخ نقطے
ابھی ڈھونڈتا ہے

لکیریں!
ہیں خم دار رستوں کی
سفاکیوں پر
ابھی نوحہ خواں

ہوا کہہ رہی ہے
کہ ہم مضطرب پتھروں کے
تقاضوں کو سمجھیں
ذرا خول سے اپنے نکلیں!

کالی زبان

پھول
صحنِ نظر میں اگر
برق پاشی کریں
تو سمجھ لو
کہ پھر
آسماں کی طرف سے
کوئی پیکرِ بے بدن
منتشر فکر کے ربط و ترتیب کے
واسطے آئے گا
اور سرکش ارادوں کی
کالی زباں
کاٹ لی جائے گی!

انتباہ

گلاب کی پنکھڑی پہ
رکھ کر
دہکتا شعلہ
مزاج پوچھے گا
جب بھی کوئی
تو خوں فشاں آندھیاں
اٹھیں گی
شعور اب
کوئی بند کمرہ نہیں
کہ اس میں
گزندگی ہر سیہ روایت
فروغ پائے

خون اور آگ

صفحہ صفحہ
تو لکھا ہوا ہے
لہو کا فسانہ
سلگتے مکاں
جلتی لاشیں
بلکتے فرشتے
نُچی ساڑیاں

اور روندے ہوئے
جسم شیشہ صفت
کمسنی کے!

اے ہوائے تر و تازہ
تو پھر
وہی چیختی ساعتیں
اپنے ہمراہ لے آئی ہے

اب ورق
کوئی سادہ نہیں
حاشیہ حاشیہ
خون ہے
آگ ہے
حرف سفاک ہے
اب کہاں میں سمیٹوں تجھے
لوحِ جاں جل چکی!

شارق عدیل

لہولہان لبوں پر صدا اُبھر آئی

بہت دنوں سے لہوزار ہے وطن کی زمیں
بہت دنوں سے فلک بھی اداس ہے میرا
بہت دنوں سے مری بیٹیوں کے جسموں نے
نیا لباس، نئی خوشبوئیں نہیں دیکھیں
بہت دنوں سے مرے ننھے سے فرشتوں کی
شرارتوں کو ترستی ہیں شہر کی گلیاں
بہت دنوں سے یہ معمول بن گیا ہے یہاں
جوان بیٹے مرے جب بھی شہر جاتے ہیں
پلٹ کے کتنے ہی ان میں سے گھر نہیں آتے
بہت دنوں سے یہی ہولناک سے منظر
مری نگاہوں میں پنجے گڑائے بیٹھے ہیں
مگر یہ سچ بھی زمانے پہ آشکارا ہے
کسی بھی لمحہ مرا حوصلہ نہیں ٹوٹا
تمہارے ظلم کی سب انتہائیں شاہد ہیں
کہ میں نے صبر کا دامن کبھی نہیں چھوڑا
مرا یقیں ہے مرا صبر جب بھی ٹوٹے گا
تو تم کو وادیٔ اقدس کو چھوڑنا ہوگا
یقین رکھو کہ اس جنگ کے سمٹنے پر
خود اپنے جبر کی شرمندگی کو اوڑھے ہوئے
تمہیں خود اپنی ہی تاریکیوں میں کھونا ہے

P.O. Marehra,
Distt. ETAH-207 401 (U.P)

شاہد کلیم

واپسی

سلگتی دھوپ میں اک موڑ پر کھڑا ہوں میں
پلٹ کے میری طرف دیکھتا نہیں کوئی
میں کیا ہوں، کون ہوں، یہ پوچھتا نہیں کوئی
نہ جانے کون سی دنیا میں آگیا ہوں میں

لہو کا رنگ بھی دن کی طرح سفید ہوا
ہر ایک سمت ہے قدروں کی ٹوٹ پھوٹ کا شور
ہر اک قدم پہ ہے رسموں کی ٹوٹ پھوٹ کا شور
میں کیا ہوں، کون ہوں، یہ کوئی کیسے جانے گا

پُرانے شہر کی جانب ہی لوٹ جاؤں گا
تجلیوں میں نہایا ہوا یہ شہر حسیں
مری نگاہ کو تو ذرا بھی بھاتا نہیں
ہزار بار پکاروگے میں نہ آؤں گا

ردائے کہنہ میں یہ تن لپیٹ لوں گا میں
اب اپنے آپ میں خود کو سمیٹ لوں گا میں

Doodh Katora, Ara - 802 301

نظام ہاتف

جنگل کی تہذیب شہر سے بہتر ہے

پرندوں کا وہ جوڑا اُڑ کے اک جنگل سے آیا تھا
یہاں اس شہر میں نقشہ نرالا دیکھ کر وہ
عجب حیرت میں، استعجاب میں تھا
وہ نر مادہ سے کہتا "یہ کوئی اندھیر نگری ہے"
یہاں سب کچھ ہے اُلٹا پلٹا !
وہ دیکھو !"

اشارہ اس نے اک رکشہ کی جانب یوں کیا
دو شخص ہیں اک شخص کی رکشہ میں بیٹھے ہیں
وہ ہیں آرام سے
جب کہ وہ رکشہ والا محنت سے
پسینے میں ہے لَت پَت"
وہ مادہ بڑبڑائی
"بات سچ ہے! ہم کہیں جاتے ہیں تو دونوں ہی اُڑتے ہیں
پروں کو دونوں استعمال کرتے ہیں
یہ ہے مخلوق کیسی
ڈھو رہا ہے ایک !
ہم جنسوں کو دو دو کو !
ہمارا تو پرندہ کوئی بھی ایسا نہیں کرتا
ہر اک اُڑتا ہے اپنے ہی پروں سے
پرندہ کوئی بھی دیگر پرندے کو بٹھا کر پیٹھ پر اپنی نہیں اُڑتا

ہر اک کھاتا ہے اپنی ہی کمائی
ہر اک کو اپنا کیڑا خود پکڑنا، خود ہی کھانا ہے
مگر یہ کیا زمانہ ہے
کہ یہ تو واقعی اندھیر نگری ہے مرے راجہ !
چلو جلدی یہاں سے لوٹ جائیں اپنے جنگل کو
کوئی یہ کہہ رہا تھا 'یہ ترقی یافتہ لوگوں کی بستی ہے !
وہاں جانا نہیں! خطرہ وہاں ہر ہر قدم پر ہے"
تبھی فائر ہوا
اور نر پرندہ ڈھیر ہو کر گر پڑا نیچے
اکیلی رہ گئی مادہ تو لوٹ آئی
سہاگ اپنا وہ کھو کے
اور بیوہ ہو کے لوٹ آئی
وہ کہتی تھی
کہ جنگل ہی کی جو تہذیب ہے، وہ سب سے بہتر ہے

●

116-B, Railway Station Colony, Muradabad - 244 001

پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان

عصر حاضر کی ایک علمی شخصیت

عجائبات عالم میں کچھ تو مادی مظاہر ہیں جنہیں بہ چشم سر دیکھا جا سکتا ہے، کچھ وہ ہیں جن کے اسرار و رموز سمجھنے کے لیے علم ہی نہیں تجربہ و مشاہدہ بھی شرط ہے۔ ان میں سے ایک اعجوبہ یہ بھی ہے کہ طلوع اسلام کو ابھی نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ علوم و فنون کی مختلف شاخوں میں نہایت تیزی سے پیش رفت ہونے لگی۔ مذہبی علوم تفسیر، حدیث، فقہ، سیرۃ اور مغازی وغیرہ کے علاوہ جن علوم میں مسلمانوں نے خصوصی دلچسپی لی اور ان میں نہایت تیزی کے ساتھ اضافہ کیے، ان میں فن طب بھی شامل ہے۔ چونکہ اس کی فلسفیانہ اساس یونانی حکماء کی تصانیف پر رکھی گئی تھی، اس لیے آج بھی طبیب کو "حکیم" کہا جاتا ہے۔ اسے مسلمانوں کی علمی رواداری یا دیانتداری ہی کہیں گے کہ انہوں نے یونانی حکمائے طب کے ابتدائی رشتے کو فراموش نہیں کیا اور اُسے طب یونانی ہی کہتے رہے، حالانکہ وہ اپنی ترقی یافتہ شکل کے بعد بجا طور پر "طب العرب" کہے جانے کا حق رکھتی تھی۔ مگر اب حیرت یا افسوس اس پر ہے کہ طب یونانی نہ یونان میں رہی، نہ یوروپ میں، نہ ممالک عربیہ میں۔ آج تک یوروپ اور بعض عرب ممالک میں بھی اس کا رواج ممنوع ہے۔ حالانکہ ایلوپیتھی میں طب و جراحت کی بنیاد بھی حنین بن اسحاق، ثابت بن قرۃ، محمد بن زکریا الرازی، شیخ الرئیس بو علی سینا، ابن نفیس، داؤد انطاکی اور ابو القاسم الزہراوی جیسے عبقری طبیبوں اور علم تشریح کے ماہروں نے فراہم کی ہے۔

طلوع اسلام کے بعد علم طب میں بحث و تحقیق کا بیشتر کام مسلم علماء نے کیا ہے اور ان کی کتابیں عربی یا فارسی زبانوں کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔ اس فن کو ابتدا میں عباسی دربار خلافت سے جو سرپرستی ملی اس سے بہت پیش رفت بھی ہوئی۔ لیکن بعد کی صدیوں میں اس سے نقصان بھی ہوا کہ صرف ظل الٰہی کے مزاج ہمایونی کی نگہداشت یونانی اطبا کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ دوسرا نقصان مذہبی علما کی غلط اندیشی سے ہوا کہ انہوں نے مذہب، اخلاقیات اور مسائل طبیہ مثلاً تشریح البدن کے رشتوں کو خالص اخلاقی اور مذہبی زاویے سے دیکھا حالانکہ یہ قطعاً غیر ضروری اور غیر متعلق تھا۔ اس طرح فن جراحت کو بہت نقصان ہوا اور وہ عملی طب کے ساتھ ساتھ قدم نہیں بڑھا سکا۔ سست رفتار ہو گیا اور جراحوں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آ گیا۔ بعد کے زمانے میں ایلوپیتھی نے فن جراحت کو ترقی دی حالانکہ موجودہ سرجری کی بنیاد بھی طب العرب کے مسلم حکما کی رکھی ہوئی ہے اور آج بھی آپریشن میں استعمال ہونے والے بعض آلات وہ

ہیں جن کی ابتدائی شکل قدیم اطبا کی کتابوں میں مل جاتی ہے۔ اس کے باوجود عہد وسطی میں خصوصاً عہد مغلیہ میں ہندوستان میں نامور اطباء پیدا ہوتے رہے جن کے علمی اور تحقیقی کارنامے آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد روز مائل بہ زوال ہے۔ سلطنت مغلیہ کے خاتمے کے بعد طب کی پیش رفت بھی رک گئی تھی اور روایتی طبیبوں کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے پیش رو حضرات کی بیاضوں اور قرابادینوں سے نسخے تلاش کریں اور انہیں اپنے کسب معاش کا ذریعہ بنائیں خود ان میں ایجاد و اجتہاد کی صلاحیت نہ رہی تھی، علمی اور تحقیقی جذبہ سرد پڑ گیا تھا۔ لیکن اللہ تعالی نے اس فن شریف کی بقا اور تحفظ کے لیے دہلی کے خاندان شریفی میں حکیم محمود خاں مرحوم اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم، نیز خاندان عزیزی لکھنؤ میں حکیم عبدالعزیز، حکیم عبدالحلیم اور حکیم عبداللطیف فلسفی جیسے علماء پیدا کر دیے جنہوں نے فن طب کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کیا اور اس فن شریف کا چلن ختم نہیں ہونے دیا جو مسلمانوں کی علمی میراث اور ان کی ثقافت کا ایسا مظہر تھا جس کو عام انسانوں کی خدمت کے لیے مسلمانوں کی کوشش کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اور ان حضرات کے مابعد آنے والی نسل میں حکیم عبدالحمید دہلوی مرحوم اور ان کے بھائی حکیم محمد سعید شہیدؒ نے عملی طب کو مقبول عام بنانے میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ نظری سطح پر طب یونانی میں بحث و تحقیق کے دروازے بھی کھلے اور اس میدان میں جن اطبا نے نہایت بیش قیمت علمی خدمات انجام دیں اُن میں پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن کا نام سب سے نمایاں ہے۔

پروفیسر سید ظل الرحمٰن عہد وسطی کے ہندوستان میں ایک نہایت قدیم علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں علوم اسلامیہ اور فن طب دونوں کی بڑی مستحکم روایت عہد سلطنت سے رہی ہے۔ اگر کوئی فن خاندانی ورثے کے طور پر ملا تو اُس میں بڑی برکت ہوتی ہے، ذاتی کوشش و کاوش سے اُس میں جو اضافہ کیا جائے وہ اُس روایت کو اور بھی نہ صرف شاندار بلکہ جاندار و پائدار بنا دیتا ہے۔ اس زمانے میں یونانی طب کے بہت سے کالج کھلے ہوئے ہیں، اُن سے علم طب کی سندیں لے کر نکلنے والے بھی کچھ کم نہیں، مگر اس کا ایک پہلو ایسا ہے جسے دیکھ کر کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوتی کہ علم طب کے اکثر سند یافتہ خود کو حکیم کی بجائے ڈاکٹر کہنا اور کہلوانا پسند کرتے ہیں اور بیشتر علاج بھی ایلوپیتھی کی پیٹنٹ دواؤں سے کرنے لگے ہیں۔ مفردات سے علاج کرنے والے طبیب معدودے چند ہیں، وہ بھی کہیں دیہات و قصبات ہی میں مل سکتے ہیں۔ حکیم سید ظل الرحمٰن کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ طب یونانی میں "شرک" کے مرتکب نہیں ہوئے، اطباء سلف کے معیاروں سے فن کی عملی اور نظری خدمت کرتے رہے ہیں۔ ان کا یہ رویہ کسی عصبیت اور تنگ نظری کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ طب یونانی میں تمام علمی اور فنی مسائل کا حل موجود ہے اور انہیں اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کی روشنی میں بھی جانچا پرکھا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل تعریف

اور اک

ہے کہ وہ طب یونانی کو جامد فن نہیں مانتے، اُس کی جدلیاتی اور حرکی قوت کے قائل بھی ہیں مؤید بھی۔ انہوں نے تجدید طب کے موضوع پر جن خیالات کی تبلیغ اور اشاعت کی ہے وہ اُن کے آزاد خیال اور ترقی پسند مفکر ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

حکیم سید ظل الرحمٰن کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ عربی اور فارسی مصادر سے براہ راست استفادہ کرتے ہیں، انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہونے سے پہلے دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ سے سندِ فراغت حاصل کی تھی۔ آج بہت ہی کم طبیب ایسے ہیں جو عربی فارسی مصادر سے کما حقہٗ واقفیت رکھتے ہوں۔ اُنہیں قدیم مخطوطات کا بھی ذوق ہے اور علوم شرقیہ کی بیشتر بڑی لائبریریوں میں محفوظ طبی مخطوطات کا جائزہ لیتے رہے ہیں۔ یہی نہیں انہوں نے خود بھی اپنے ذاتی ذخیرے میں تین سو سے زائد نادر قلمی نسخے جمع کر رکھے ہیں اور اپنے گھر کو ایک چھوٹا سا میوزیم بنالیا ہے جسے اب اپنے ذاتی سرمائے سے ایک ریسرچ سنٹر میں تبدیل کر رہے ہیں۔

حکیم سید ظل الرحمٰن میرے بہت ہی عزیز دوست ہیں۔ وہ اپنے اخلاق اور کردار میں بھی ایک مثالی شخصیت ہیں۔ اُن سے میرا تعارف اُس زمانے میں ہوا جب وہ طبیہ کالج گلی قاسم جان دہلی میں لکچرر ہوئے اور پانچ یا چھ سال تک دہلی میں مقیم رہے۔ اُس زمانے میں اُن سے تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی، اُسی زمانے میں انہوں نے بڑے شوق اور انہماک سے ایک طبی رسالہ ''الحکمۃ'' جاری کیا تھا جو پانچ سال تک پابندی سے شائع ہوتا رہا اور طبی حلقوں میں نہایت معیاری اور معتبر تحقیقی رسالہ سمجھا جاتا تھا۔

اُنہوں نے سخت محنت اور دیدہ ریزی سے علمی دنیا میں اپنا منفرد مقام بنایا ہے۔ اُن کی تقریباً دو درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے ہر کتاب اپنے موضوع پر قابلِ استناد ماخذ مانی گئی ہے۔ اسکے علاوہ ان کے متفرق تحقیقی مضامین کی تعداد بھی ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے۔ انہوں نے متعدد قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کر کے فن طب کی نمائندگی کی ہے اور اطبائے سلف کی فنی خدمات سے دنیا کو روشناس کرایا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں بیرونی ممالک میں جا کر بھی ہندوستان میں فن طب کی ترویج و ترقی کا تعارف کرانے اور اس فن کا اعتبار بڑھانے کے مواقع ملے ہیں۔ وہ ہندوستان کے پہلے طبیب ہیں جنہیں کلاسیکی زبانوں میں علمی شغف کا سب سے بڑا قومی اعزاز یعنی صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ''سندِ امتیاز'' لائف پنشن کے ساتھ دیا گیا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی ان کا ایک امتیاز ہے کہ انہوں نے ۳۵ سے زیادہ کتابوں پر عالمانہ مقدمے لکھے ہیں جنہیں اب یکجا کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ مقدمے خود متنوع موضوعات پر ہیں اور ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ پروفیسر موصوف نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ بعض مضامین جو نسبتاً تفصیل سے لکھے گئے ہیں وہ حکیم ظل الرحمٰن کے مطالعے

وسعت اور گہرائی کے علاوہ اسکی شہادت بھی دیتے ہیں کہ انہوں نے فن طب کے مختلف علمی اور اصطلاحی پہلوؤں کا کتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان موضوعات پر علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو کس طرح کھلے دل سے سراہا ہے۔

فن طب کے سوا اسلامیات اور ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ پر بھی وہ شناسانہ نظر رکھتے ہیں۔ تاریخ طب، علم الادویہ اور تشریح البدن کے میدان میں تو شاید ہی اس برصغیر میں کوئی ان کا مدمقابل ہونے کی جرأت کر سکے۔ انہوں نے جو مقدمے حمام، ثابت بن قرۃ، تاریخ طب اور سوانح حکیم سید کرم حسینؒ پر لکھے ہیں وہ کوئی سرسری تحریریں نہیں بلکہ خود فکر و نظر اور بحث و تحقیق کا بہترین نمونہ ہے۔

یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خوش نصیبی تھی کہ اسے حکیم عبد اللطیف فلسفی مرحوم جیسے حاذق طبیب کی خدمات حاصل رہیں اور یہ فلسفی مرحوم کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں حکیم سید ظل الرحمن جیسا سعادتمند اور سچا علمی ذوق رکھنے والا شاگرد ملا، جس نے خاندان عزیزی کی فنی خدمات کو بھی زندہ کر دیا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ کسی قوم قبیلے یا خاندان میں ایک ہی شخص ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس کی حیثیت شمع محفل کی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک شمع کی لو ظلمت کا نقاب چیر کر ہمیں سب حاضرین کے چہرے دکھادیتی ہے اسی طرح کسی فنی یا روحانی سلسلے یا علمی خانوادے کی ایک ہی شخصیت کے وسیلے سے پورے سلسلے یا خانوادے کا تعارف ہو جاتا ہے اور اس کی ماضی کی خدمات بھی روشنی میں آجاتی ہیں۔

حکیم سید ظل الرحمن کی علمی خدمات سے ان کے اپنے خانوادہ علمی کی قابل رشک تاریخ بھی روشنی میں آئی اور ہندوستان میں کئی صدیوں تک اطبانے جو نظری اور عملی خدمات انجام دی تھیں ان پر غور و فکر کے دروازے بھی کھلنے لگے۔ اب ان کے حسن خدمت پر وظیفہ یاب ہونے کا زمانہ قریب سے قریب آرہا ہے، ہمیں یہ امید ہی نہیں یقین ہے کہ ان کی علمی خدمات کی نہ صرف رفتار بلکہ معیار و مقدار میں بھی اضافہ ہوگا، اس کے لیے ہم ان کی صحت اور سلامتی کی دل سے دعا کرتے ہیں۔ حفظه الله و ابقاه و اوصله الی أسنی الاهداف العلمیه۔

پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان
ایک مایۂ ناز شخصیت

حکیم سید ظل الرحمن صاحب عہد وسطیٰ کے ایک قدیم علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں اس خاندان میں علوم اسلامیہ اور فن طب کی بڑی مستحکم روایت عہد سلطنت سے چلی آرہی ہے۔ آپ کے جد محترم حکیم حاجی سید محمد کرم حسین مرحوم ایک جید عالم، حاذق طبیب اور ممتاز ادیب وشاعر کی حیثیت سے مشہور تھے، انہوں نے "تجارہ" میں "دواخانہ شفاء الامراض" کے نام سے ایک دواخانہ کی بنیاد رکھی جس نے ۵۷ سال تک بڑی خاموشی سے اعلیٰ طبی خدمات انجام دیں۔ انہوں نے علوم طب اور مذہب پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ایک واسطے سے ان کا طبی سلسلہ حکیم احسن اللہ خان وزیر اعظم سلطنت مغلیہ سے ملتا ہے۔ تقسیم ہند کے قزاقانہ اور خونی ماحول نے تجارہ اور الور کے اکثر خاندانوں کو پاکستان ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیا لیکن حکیم سید کرم حسین نے اپنا وطن چھوڑنا گوارانہ کیا چنانچہ تجارہ سے رختِ سفر باندھ کر بھوپال منتقل ہوئے۔ جہاں ان کے خاندان کی ایک شاخ پہلے سے آباد تھی۔

حکیم سید کرم حسین کی وفات پر ان کے لائق فرزند حکیم سید فضل الرحمان ان کے جانشین ہوئے انہیں اپنے والد کا علمی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ حکیم سید ظل الرحمن کے والد حکیم حاجی سید فضل الرحمان اور تایا حکیم حاجی سید عتیق القادر دونوں بڑے کامیاب معالج اور رمز آشنائے فن تھے۔ ان دونوں حضرات کی مرتب کردہ مشہور کتاب "اصولِ صحت" ہے۔ حکیم سید عتیق القادر نے رسالہ "مسیحائے زماں" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔

حکیم سید ظل الرحمن کی ولادت یکم جولائی ۱۹۴۰ء کو بھوپال میں ہوئی۔ ابھی چند سال ہی کے تھے کہ سر سے والدہ ماجدہ کا سایۂ عاطفت اٹھ گیا۔ والد گرامی اور عم مکرم کی آغوش شفقت میں پرورش پائی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم تجارہ اور بھوپال میں حاصل کی۔ اس کے بعد علوم عربیہ ودینیہ کے لیے دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ اور وہاں پانچ سال قیام کے دوران عربی، فارسی اور دینی علوم پر عبور حاصل کیا اور ۱۹۵۴ء میں وہاں سے عالمیت کی سند حاصل کی۔

دار العلوم ندوۃ العلما میں قیام کے دوران شاہ حلیم عطا، مولانا اویس نگرامی، مفتی محمد سعید اعظمی، مولانا

محمد اسحاق سندیلوی، مولانا عمران خان ندوی، مولانا محمد اسباط اور دور حاضر کے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں علی گڑھ تشریف لائے اور مسلم یونیورسٹی میں اجمل خان طبیہ کالج میں داخلہ لیا اور امتیاز کے ساتھ بی۔یو۔ایم۔ایس (B.U.M.S) کیا۔ جہاں انہیں شفاء الملک حکیم عبداللطیف جیسے نامور طبیب کا قُرب حاصل رہا۔ آپ ان خوش قسمت شاگردوں میں سے ہیں جن پر اساتذہ کو ناز تھا۔ آپ کے استاد شفاء الملک پروفیسر حکیم عبداللطیف بڑے وثوق واعتماد کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ اپنی تصانیف اور کارہائے نمایاں کی طرح اپنے تلامذہ کی وجہ سے بھی زندہ وتابندہ رہتے ہیں۔

ابتدا ہی سے کتب بینی کے شوقین تھے۔ گھر کے علمی ماحول کے علاوہ دار العلوم ندوۃ العلماء اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے اداروں نے آپ کے ذہن وفکر کی وسعت ورفعت کو جلا بخشی۔ طبیہ کالج سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد ایک سال تک ہاؤس فزیشین اور دو سال تک ڈیمانسٹریٹر رہے۔ آپ علی گڑھ میں زمانۂ طالب علمی سے ہی مختلف عہدوں پر فائز رہے مثلاً ہاؤس مانیٹر، کامن روم سکریٹری، طبی سوسائٹی کے نائب صدر اور طبیہ کالج میگزین کے ایڈیٹر۔ آپ کو ہر میدان میں ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ پروفیسر مختار الدین احمد سابق صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے لکھا ہے: ''حکیم سید ظل الرحمان صاحب کا شمار طبیہ کالج کے ممتاز طالب علموں میں ہوتا تھا ان کا پہلا کارنامہ علی گڑھ طبیہ کالج کا ''شیخ الرئیس نمبر'' تھا جو کہ ان کی ادارت واہتمام میں ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا جس کو علمی اور طبی حلقہ میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ برصغیر میں طب کے خالص علمی رسالہ کی کمی محسوس کرتے ہوئے ۱۹۶۵ء میں ماہنامہ ''الحکمت'' دہلی سے جاری کیا۔ جس کی ادارت کے فرائض چھ سال تک انجام دیئے۔ طبی اکادمی دہلی کی نظامت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس صوبہ دہلی اور بھوپال کے جنرل سکریٹری بھی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک جامعہ طبیہ دہلی میں بحیثیت لکچرار درس وتدریس میں مصروف رہے۔ جون ۱۹۷۰ء میں سنٹرل کونسل آف ریسرچ ان انڈین میڈیسین اینڈ ہومیوپیتھی کے زیر اہتمام علی گڑھ میں ملک کے پہلے لٹریری ریسرچ یونٹ (اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ) میں ریسرچ آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طب یونانی میں ہندوستان کے پہلے پوسٹ گریجویٹ شعبہ علم الادویہ کا قیام عمل میں آیا تو آپ بحیثیت ریڈر جنوری ۱۹۷۳ء میں اس سے منسلک ہوئے اس وقت پروفیسر حکیم عبدالحسیب صاحب مرحوم چیئرمین تھے پھر ان کے بعد آپ کا چیئرمین کے عہدے پر تقرر ہوا۔ جنوری ۱۹۸۳ء میں آپ پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۸۵ء تک آپ نے صدر شعبہ کے فرائض انجام دیئے اس کے بعد یونیورسٹی میں باری (ROTATION) کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ دوبارہ مارچ ۱۹۸۸ء میں چیئرمین مقرر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۸۸ء سے دسمبر ۱۹۹۰ء تک ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسین کے عہدے پر فائز رہے اور

اوراق گل

خدمت انجام دیتے رہے۔

ان کی صدارت کے دوران شعبہ نے غیر معمولی ترقی کی اور ایک علمی، تحقیقی اور تدریسی فضا پیدا ہوئی۔ ان کا سب سے عظیم الشان کام شعبہ علم الادویہ کی نئی عمارت کی تعمیر ہے۔ طبیہ کالج کے قیام کے بعد یہ پہلی عمارت تھی جو ان کی کوشش سے کالج میں تعمیر ہوئی۔ اس کا ذکر ان کی یادگار کے طور پر ہمیشہ کیا جائے گا۔ جدید آلات سے آراستہ لیباریٹریز کے قیام کے علاوہ سیمینار کو وسیع بنانے پر انہوں نے بھرپور توجہ دی۔ ملک کے مشہور کتب خانوں میں موجود علم الادویہ کے نایاب مخطوطات کے عکس حاصل کئے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے کلکتہ، پٹنہ، حیدرآباد اور رام پور کا سفر بھی کیا۔ اس طرح علم الادویہ کا قابل قدر ذخیرہ سیمینار لائبریری میں جمع ہوا۔ ان کی مزید توجہ سے علم الادویہ کی نصابی کتابیں بھی مرتب ہوئیں، جنہیں ان کے گراں قدر مقدموں کے ساتھ یونیورسٹی نے طبع کرایا۔ ان میں منہاج الصیدلہ، قوانین الادویہ، کتاب المرکبات اور کنز المفردات شامل ہیں جو علم الادویہ کے پورے نصاب پر محیط ہیں۔

حکیم سید ظل الرحمان کا شمار ہندوستان میں طبی موضوعات پر قلم اٹھانے والوں کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ وہ فنِ طب کے نامور محقق، مصنف اور مورخ ہیں۔ وہ جس موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ آپ کی تصانیف نے اردو کے طبی ادب میں ایک نئی روح پھونکی ہے۔ آپ کا یہ خاصہ ہے کہ آپ موضوع کی خشکی کو اپنے مخصوص انداز سے دلچسپ بنا دیتے ہیں جس سے فکر و شعور کو بالیدگی اور فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا اعتراف استاذ الاساتذہ حکیم عبداللطیف مرحوم نے بھی کیا ہے۔

قدرت نے آپ کو جودتِ فکر، دقتِ نظر اور رفعتِ تصور سے نوازا ہے۔ ڈیڑھ سو سے زائد علمی وفنی مضامین اور الحکمت کے بیش بہا شذرات کے علاوہ دو درجن سے زیادہ کتابیں اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں۔ آپ کی پہلی کتاب ''دورِ جدید اور طب'' ۱۹۶۳ء میں منصۂ شہود پر آئی۔

ان تمام خصوصیات سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ آپ نے کئی قومی وبین الاقوامی اعزازات حاصل کیے ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں صدر جمہوریہ کی جانب سے ایک بڑے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ آپ ہندوستان کے پہلے طبیب ہیں جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ متحدہ عرب امارات، ایران، پاکستان، کویت، اسپین، اردن اور شام وغیرہ کی علمی کانفرنسوں میں آپ کو شرکت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ایک مرتبہ حکیم عبدالحمید مرحوم نے کہا تھا کہ ''ان کی تصانیف کا وزن ان کے وزن سے زیادہ ہے''۔ آپ نے اپنی زندگی کو تصنیف و تالیف اور علمی کاموں کے لئے وقف کر رکھا ہے اس کا ایک ثبوت ان کی قائم کردہ لائبریری اور ابن سینا اکیڈمی بھی ہے جو علیحدہ سے ایک مضمون کی متقاضی ہے۔ حکیم صاحب اس دور کی عظیم ترین شخصیت ہی نہیں، مشرقی اقدار و روایات کا ایک پیکرِ جمیل بھی ہیں۔

فہرست تصانیف پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان

۱۔ دور جدید اور دور طب ۱۹۶۳ء

۲۔ تاریخ علم تشریح ۱۹۶۷ء

۳۔ علم الامراض (۱۹۷۱ء، ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۴ء)

۴۔ رسالہ جودویہ (۱۹۷۲ء)

۵۔ تجدید طب (۱۹۷۲ء)

۶۔ بیاض وحیدی (۱۹۷۴ء، ۱۹۹۱ء)

۷۔ مطب مرتعش (۱۹۷۶ء)

۸۔ تذکرہ خاندان عزیزی (۱۹۷۸ء)

۹۔ کتاب المرکبات ۱۹۸۰ء، ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۱ء (ہندوستان وپاکستان)

۱۰۔ صفوی عہد میں علم تشریح کا مطالعہ (۱۹۸۳ء)

۱۱۔ حیات کرم حسین (۱۹۸۳)

۱۲۔ The Azizi Family of Physicians (1983)

۱۳۔ علی گڑھ کے طبی مخطوطات (۱۹۸۴ء)

۱۴۔ قانون ابن سینا اور اسکے شارحین ومترجمین (۱۹۸۴ء)

۱۵۔ رسالہ جیفہ (۱۹۸۶ء)

۱۶۔ طب فیروز شاہی (۱۹۹۰ء)

۱۷۔ Research in Ilmul Advia (1990)

۱۸۔ رسالہ آطریلال (۱۹۹۳ء)

۱۹۔ Studies In Ilmul Advia (1996)

۲۰۔ دہلی اور طب یونانی

۲۱۔ الادویہ والاقلبیہ (۱۹۹۳ء)

۲۲۔ ایران نامہ (۱۹۹۸ء)

۲۳۔ طبی تقدمہ (۲۰۰۰ء)

۲۴۔ آئینہ تاریخ طب (۲۰۰۱ء)

۲۵۔ اسماء الادویہ (۲۰۰۱ء)

درج ذیل طلبا نے پروفیسر موصوف کی زیر نگرانی تحقیقی مقالات سپرد قلم کئے ہیں۔

۱۔ مفتی محمد طاہر	۱۹۷۵ء	قرابادین اعظم کے امتیازات اور مرتبہ کا تعین
۲۔ سید مودود اشرف	۱۹۷۵ء	جامع المفردات کی روشنی میں ابن بیطار کے اضافات
۳۔ حبیب الرحمٰن	۱۹۷۵ء	تجربات کا مطالعہ
۴۔ احتشام الحق قریشی	۱۹۷۵ء	انیسویں صدی میں علم الادویہ کا مطالعہ
۵۔ وہاب الرحمٰن	۱۹۷۶ء	تخم کتوت پر تحقیقی مقالہ
۶۔ سرور سلطان رضوی	۱۹۸۱ء	خاکسی پر تحقیقی مقالہ
۷۔ محمد اسمٰعیل	۱۹۸۱ء	دوا کے تکلیسی اثرات
۸۔ ارشاد احمد	۱۹۸۱ء	تخم ریحاں پر تحقیقی مقالہ
۹۔ نعیم احمد خاں	۱۹۸۳ء	متروک اور غیر محقق ادویہ کا مطالعہ
۱۰۔ پرویز احمد صدیقی	۱۹۸۵ء	برگ بادر نجویہ اور زوفا کا ضیق النفس پر مطالعہ
۱۱۔ نعیم الدین	۱۹۸۵ء	قرحہ معدہ پر اصل السوس کے اثرات
۱۲۔ افتخار احمد نقوی	۱۹۸۵ء	ورم کبد پر افسنتین کے اثرات
۱۳۔ محمد افروز	۱۹۸۵ء	قنبیل کا سریری مطالعہ
۱۴۔ محمد محسن	۱۹۸۵ء	ستاور کے جریان منی پر اثرات
۱۵۔ پٹھان ظہیر الدین نظام الدین	۱۹۸۶ء	ملیریا پر دواؤں کے اثرات
۱۶۔ افسر حسین خاں	۱۹۸۹ء	ورم طحال پر دواؤں کے اثرات
۱۷۔ محمد آفتاب احمد	۱۹۹۱ء	تدبیر ادویہ کا مطالعہ
۱۸۔ شارق ظفر	۱۹۹۲ء	De. addiction پر یونانی دواؤں کے اثرات
۱۹۔ محمد نفیس خاں	۱۹۹۳ء	یونانی مقوی باہ ادویہ کا مطالعہ
۲۰۔ افضل احمد	۱۹۹۵ء	بلادر کا تحقیقی مطالعہ
۲۱۔ محمد تقی	۱۹۹۵ء	خاکسی کی معیار بندی
۲۲۔ طارق احسن	۱۹۹۶ء	تریاق اربعہ کی معیار بندی اور فارماکولوجیکل مطالعہ

۲۳۔	سید شمس الاسلام	۱۹۹۷ء	جندبید ستر کا تحقیقی مطالعہ
۲۴۔	سلیم اختر	۲۰۰۰ء	یونانی دواؤں کی کریم کا دور الصدف پر سرسری مطالعہ
۲۵۔	سید غلام حیدر شاہ	۲۰۰۰ء	نبیذ پر تحقیقی مطالعہ

Ajmal Khan Tibbia College,
Aligarh - 202 002.

●

حکیم ظل الرحمان لائبریری

سیمینار کے آخری دن اتفاقاً میرے مخلص دوست حکیم سید ظل الرحمن ندوی صدر شعبہ علم الادویہ مل گئے۔ وہ تجارہ کے سادات کے ایک ممتاز اور ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور خود بھی بہت شائستہ اور اعلیٰ علمی وادبی ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے ہمراہ پہلے ان کے شعبے پھر دولت کدہ پر گیا، تھوڑی ہی دیر میں وہ مکان کے بالائی حصے پر ابن سینا علمی وطبی اکیڈمی کی ظل الرحمن لائبریری کی شاندار اور دلکش عمارت میں لوا گئے جو حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے۔ پہلے استقبالیہ کمرے میں داخل ہوا جس میں ایک چھوٹی میز، دو کرسیاں اور ایک الماری تھی جس میں تقریباً ڈیڑھ سو فاؤنٹین پن رکھے ہوئے تھے جن کو مختلف ملکوں کی کمپنیوں نے تیار کیا تھا، اس کمرے سے متصل بائیں جانب باتھ روم تھا اور دائیں جانب ایر کنڈیشن کمرہ جس میں چار سو مخطوطات اور قرآن کے نومطلا اور مذہب نسخے تھے۔ دو کمپیوٹر بھی تھے۔ پوری لائبریری کو کمپیوٹر پر لانے کی اسکیم ہے۔ اس کے بعد لائبریری کا وسیع ہال ہے اور ابھی اتنا ہی بڑا ہال اور تعمیر کرنے کا منصوبہ ہے۔

لائبریری میں فن وار بارہ ہزار سے زیادہ کتابیں بڑے سلیقے سے شیشے کی الماریوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ تاریخ طب وسائنس، سرسید تحریک، غالب واقبال اور طب یونانی پر خاص طور سے کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ ۱۰۴ غالب نمبر تھے جو غالب پر قائم اداروں میں بھی نہیں ہیں۔ ابن سینا، اپنے خاندانی بزرگوں اور اپنی اور اپنے صاحبزادے ڈاکٹر سید ضیاء الرحمن کی تصانیف کے الگ گوشے قائم کیے ہیں۔ ان کے صاحبزادے میڈیکل کے طالب علم تھے مگر انھیں عربی و فارسی کی تعلیم دلائی تاکہ وہ اس قیمتی ورثے کے جائز اور صحیح وارث بنیں۔ لائبریری میں مختلف ممالک کے ۲۶ ہزار ڈاک ٹکٹ، ڈھائی ہزار سکے، کرنسی نوٹ، وصلیاں، پینٹنگ، نادر فرامین اور ابن سینا کے متعدد اسٹیچو بھی ہیں۔ عمارت اور ارزاں بن سکتی تھی مگر کتابوں کی حفاظت اور دیمک وغیرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے گرانی کی پروا نہیں کی گئی۔ لائبریری ہال میں ۴۰ افراد کے بیٹھنے کے لئے میز اور کرسیوں کا انتظام ہے جس میں اچھا علمی اجتماع ہو سکتا ہے۔ میں ان کے خون جگر کا یہ معجزہ دیکھ کر بے اختیار بول اٹھا ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند ر تو حکیم صاحب یوں گویا ہوئے۔

مسلم یونیورسٹی سے متمول اساتذہ بھی وابستہ رہے اور اصحاب علم وذوق بھی۔ بعض نے کتابوں کا ذخیرہ بھی جمع کیا جو ان کی زندگی ہی میں یا ان کے بعد فروخت ہو گیا۔ علم کے فروغ یا نوجوان نسل کو تصنیف و تالیف میں مدد فراہم

کرنے کا کام نہیں ہوا۔ پہلے یہ طریقہ تھا کہ باہر سے جو نامور حضرات تشریف لاتے ان سے اسٹاف کلب میں لکچر دلایا جاتا۔ مولانا سلیمان ندویؒ کے بھی کئی لکچر ہوئے۔ اب یہ روایت ختم ہو گئی اور کوئی مرکز نہیں جہاں باہر سے آنے والے کے اعزاز میں نشست کی جائے۔ پہلے اساتذہ سبکدوش ہونے کے بعد اپنے اپنے وطن چلے جاتے تھے اب وہ یہیں آباد ہو جاتے ہیں۔ ان میں ہر علم و فن کے ماہرین ہوتے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کے علم و فضل سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کے لکچر کا انتظام کیا جائے۔ آج کل جو لوگ کتب خانے اور ادارے قائم کرتے یا رفاہی کام کرتے ہیں تو اس کے لئے چندے کرتے اور اپنا ایک حبہ بھی خرچ نہیں کرتے۔ حکیم صاحب پوری قوم کے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اپنی گاڑھی کمائی سے یہ اکیڈمی اور لائبریری قائم کی، تاکہ کتابوں کا یہ قیمتی اثاثہ محفوظ ہو جائے اور اس کا فیض ہمیشہ جاری رہے۔ ایسے عظیم الشان کارنامے کی مثال اس زمانے میں نہیں مل سکتی۔ (معارف اعظم گڑھ مارچ ۲۰۰۱ء)

●

ابن سینا اور ابن مسکویہ

ابو علی سینا ابھی بیس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ اپنے عہد کے تمام علوم حاصل کر کے علوم الٰہیات، طبیعیات، ریاضیات و دینیات میں اپنے زمانے میں بلند مقام حاصل کر لیا۔ ایک دن، اس زمانے کے معروف عالم ابو علی بن مسکویہ کے درس کی مجلس میں حاضر ہوئے اور تمکنت کے ساتھ ابن مسکویہ کے آگے ایک آخروٹ پھینکا اور کہا: ''اس کی سطح کی مساحت بتائیے''۔ ابن مسکویہ نے ایک کتاب کے اوراق و ابواب سمیٹتے ہوئے جو انہوں نے علم اخلاق و تربیت کے بارے میں لکھی تھی اور جس کا نام ''کتاب طہارۃ الاعراق'' تھا، ابن سینا کے آگے رکھتے ہوئے کہا: '' تم اپنے اخلاق کو درست کرو تب تک میں اس آخروٹ کی سطح کی مساحت معلوم کرتا ہوں۔ تم کو اس آخروٹ کی سطح کی مساحت جاننے سے زیادہ اپنے اخلاق کی اصلاح کی ضرورت ہے''۔ ابو علی سینا یہ سن کر اپنی بات پر بہت شرمندہ ہوئے۔ یہ جملہ ان کی زندگی میں ہمہ وقت ان کا اخلاقی راہنما بن گیا۔

(تاریخ علوم عقلی در اسلام، ص ۲۱۱)

ایران نامہ

سفر ہمیشہ سے باوجود مشکلات اور رکاوٹوں کے اولوالعزم اشخاص کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ مارکوپولو سے لے کر ابن بطوطہ اور دیگر اشخاص من جملہ سعدی کے اپنے سفر ناموں یا سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات کے تذکروں کے پڑھنے والوں کو بصیرت کا سامان فراہم کرتے رہے ہیں۔ اردو کے دو مشہور شاعروں نے سفر کو جس نظر سے دیکھا اس کا تجزیہ بہت دلچسپ ہے۔ غالب کہتے ہیں :

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گذرد ۔۔۔ زہے روانی عمرے کہ در سفر گذرد

اور آتش کا خیال ہے :

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ۔۔۔ ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

غالب کا خیال ہے کہ سفر کے دوران مناظر اور پیش آنے والے تجربات و واقعات اگر پابہ زنجیر نہ ہوں تو سفر ایک نعمت مترقبہ ہے۔ اس رویہ سے ملتا جلتا مگر قدرے مختلف آتش کا شعر سفر کی ترغیب دیتا ہے۔ اس لیے کہ باوجود ان کلفتوں کے جو پیش آتی ہیں، راستے ایسے ہم دردوں سے معمور ہیں جو آرام پہنچانے اور لطف اندوزی میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ پروفیسر ظل الرحمن کا ایران نامہ آتش کے شعر کی طرف ہماری توجہ دلاتا ہے۔

پروفیسر ظل الرحمن ایک بالغ نظر انسان ہیں جن کی اولین محبت تصنیف و تالیف ہے۔ فن طب پر متعدد کتابیں انھوں نے لکھی ہیں اور ان کی وجہ سے وہ طبی دنیا کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ انھوں نے کافی طول طویل سفر کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس نادر ٹکٹوں اور سکوں کا جو ذخیرہ ہے وہ ان کی وسیع المشربی کی گواہی دیتا ہے۔ انھوں نے فن طب پر دو متعدد طبی اداروں کی تاریخ اور ان سے وابستہ مشاہیر کے تذکروں کو ترتیب دے کر ہندوستان میں طب کی تاریخ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یہ دو مدرسہائے فکر لکھنؤ کا تکمیل الطب کالج ہے جو ۱۹۰۲ء میں نامور حکیم عبدالعزیز کی مساعی جمیلہ سے وجود میں آیا۔ دوسرا دہلی کے اطبا کی تاریخ ہے جس میں ان طبیبوں نے فن کے جو کارنامے انجام دیئے ہیں اور خدمات خلق کی ہے اس کا تذکرہ ہے۔ زیر نظر سفر نامہ جسے ایران نامہ کا نام دیا گیا ہے پروفیسر رحمن کے سفر ناموں کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ اس میں تاریخ، تہذیب و تمدن، ادب، طب اور طبی اداروں کی اتنی معلومات یکجا کر دی گئی ہیں کہ یہ سفر نامہ ہر قسم کے قاری کی دلچسپی کا سبب بن گیا ہے۔ اس سفر نامہ میں دو مقامات ایسے ہیں جو خاص طور پر ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ایک صوبہ خراسان اور اس کے مشہور مقامات اور

قابل فخر فضلا ہیں، جن کی تاریخ خاصی تفصیل سے بیان کی گئی ہے اور اس صوبہ کو عظمت بخشنے والے اکابرین ہیں جن کے کارناموں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسرا مقام شیراز ہے جو مقبول ترین فارسی شعرا کا مولد و مدفن ہے۔ ایران کے یہ دونوں مشرقی اور مغربی صوبے نہ صرف اپنی قدیم تاریخ کی وجہ سے یاد رکھے جاتے ہیں بلکہ عہد وسطیٰ میں بھی ان کے شہر اور قریے مردم خیز تھے اور باکمال اشخاص کے لازوال کارناموں کی وجہ سے ناقابل فراموش تصور کیے جاتے ہیں۔

خراسان کا صوبہ دور قدیم اور وسطیٰ میں موجودہ صوبہ سے بڑا تھا۔ خراسان میں مشہد ہے جو اہلِ تشیع کی زیارت گاہ ہے۔ زمانہ قدیم میں اس صوبہ میں ایک مشہور شہر بلخ تھا۔ جس کا آتش خانہ دنیا میں مشہور تھا۔ اسی کے متولی خاندان میں ہارون رشید کا مشہور وزیر جعفر برمکی پیدا ہوا تھا۔ یہیں نیشاپور ہے جس کے متعلق لکھا گیا ہے:

حبذا شہر نیشاپور کہ در روئے زمین

گر بہشت است ہمان است و گرنہ خود نیست

اسی نیشاپور سے نادر شاہ نے اپنی غارت گری کی ابتدا کی تھی، جس کی انتہا دلی کی تباہی سے ہوئی تھی۔ فارسی کے اکبری دور کے مشہور شاعر نظیری کی پیدائش کا اسی شہر کو شرف حاصل ہے۔ شیخ العارفین بایزید بسطامی کا یہیں مزار ہے۔ یہی عطار جیسے صوفی شاعر کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ عمر خیام نے بھی اس شہر کو شرف بخشا ہے۔ عمر خیام اپنی ریاضی دانی اور فلسفہ کی وجہ سے مشہور ہے لیکن وہ اور نظام الملک الموت کے ساحر حسن صباح کے ہم درس بھی تھے۔ خراسان ہی میں ایک اور مشہور شہر طوس ہے، جس کی مردم خیز سرزمین میں فارسی کے سب سے بڑے شاعر فردوسی کی آرامگاہ ہے اور یہیں نظام الملک مدفون ہیں۔ جنھوں نے درس نظامیہ کے ذریعہ اسلامی دنیا کے کئی شہروں میں مدرسے قائم کیے تھے۔ امام غزالی کی قبر بھی یہیں بتائی جاتی ہے۔ پروفیسر رحمن نے عطار کے مقبرہ اور فردوسی کی آرامگاہ کے مناظر بڑے لطف کے ساتھ خاصی تفصیل سے پیش کیے ہیں۔ ان مقبروں کی عالی شان اور پرشکوہ عمارتیں اور ان کی دیواروں پر لکھے ہوئے اشعار، نیز فردوسی کے مقبرہ کے اندر اور باہر دیواروں پر لکھے ہوئے اشعار اور باہر کی طرف مجسمے، شاہنامہ کے بعض مناظر بالخصوص رستم اور سہراب کی لڑائی کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے کہ ہم مصنف کے ساتھ انھیں دیکھنے میں شرکت کرتے ہوئے محسوس کرنے لگتے ہیں۔

دوسرا مقام جس کے ذکر میں فارسی ادب اور قدیم تہذیب میں دلچسپی رکھنے والوں کی توجہ منعطف ہوتی ہے، شیراز کا تذکرہ ہے۔ شیراز دو وجہوں سے محبوب ہے۔ ایک یہ کہ یہاں قدیم ساسانی شہنشاہوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور دوسرے ہندوستان میں گلستان اور بوستان کے خالق اور دیوان حافظ کے مصنف کا مولد و مدفن یہیں ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس کی آب و ہوا نے یا اس شہر کی گزشتہ عظمت نے سفر نامہ کے مصنف کو شاعر بنا دیا، مگر حقیقت یہی ہے کہ مندرجہ ذیل اقتباس اس ذہنی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جسے ہم شعرا سے منسوب کرتے ہیں: ”شیراز

طلسم وخواب کا شہر ہے۔ علم وفن اور شعر و نغمہ کا شہر ہے۔ اس کے نام میں ایسی غنائیت، ایسی دلکشی اور ایسی رعنائی ہے جو کسی دوسرے شہر کے نام سے نہیں پیدا ہوتی۔ حافظ وسعدی کی سرزمین، شاعروں اور ادیبوں کا گہوارہ، علما و مشائخ کا مسکن طبیبوں اور ہنر مندوں کا مرکز"۔

سعدی کے مقبرہ کی تفصیل بڑی دلچسپی کی حامل ہے۔ لکھتے ہیں: "شہر کے ایک کنارے پر سعدیہ ہے اور دوسرے پر حافظیہ ہے۔ دونوں شاعروں نے شہر کو اپنے دامن میں اس طرح سمیٹ رکھا ہے کہ پوری فضا حسن و جمال، رنگ وشفق اور ساز و آہنگ، سے جلوہ طراز ہے۔ سعدی کے مزار کا گنبد، دیواروں پر لکھے ہوئے گلستاں اور بوستاں کے اشعار جو خطاطی کے فن پارے ہیں اور مزار پر آویزاں قیمتی فانوس، پورے مقبرے کو ایک طلسماتی فضا بخشتا ہے"۔

حافظ کے مزار پر جو کیفیت طاری ہوئی اس کے بارے میں لکھتے ہیں: "حافظ کے مقبرہ کے گرد جو کہ کعبۂ سخن ہے طواف کرنے کا ارادہ کیا۔ مزار کا خوبصورت گنبد حافظ کے اشعار سے مزین ہے۔ دیواروں پر بھی اشعار لکھے ہوئے ہیں آرامگاہ کی لوح سنگ مرمر کی ہے۔ درمیان میں حافظ کے اشعار کندہ ہیں۔ یہ آرامگاہ حافظ کے شایان شان اور شیراز کی حسین ترین جگہوں میں سے ہے۔ حافظ نے خود اس جگہ کے بارے میں کہا تھا:

بر سر تربت ما چون گذری ہمت خواہ　　　　که زیارت گہ رندان جہان خواہد بود

نہر رکناباد اب جاری نہیں، لیکن اس کے قریب پہاڑ سے پانی کے گرنے کا منظر کسی حد تک اس کی تلافی کر دیتا ہے"۔

شیراز کے نواح میں سائرس اعظم کی آرامگاہ یا سیر گاہ ہے۔ اس کو تخت سلیماں بھی کہا جاتا ہے۔ ہخامنش خاندان کا یہ ایک عظیم فاتح گزرا ہے۔ یہ خاندان سکندر اعظم کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ ساسانی عہد میں ایران کے اس حصہ کو پھر عروج ملا۔ نوشیرواں اسی خاندان کا فرد تھا اور اپنے عدل وانصاف کی وجہ سے مشہور ہے۔ جام جمشید اسی سے نسبت رکھتا ہے۔ ان سب کا تفصیلی تذکرہ صاحب ایران نامہ کے تاریخی شعور اور تاریخ سے دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کھنڈرات کو وقت نکال کر دیکھنے جانا بذاتِ خود ثبوت ہے کہ مصنف ایک باشعور دانشوری کے آداب سے واقف ہے۔

اس سفرنامہ کی دیگر خصوصیات بھی قابل ذکر ہیں۔ مساجد کے فن تعمیر پر روشنی ڈالنا، خطاطی کے اعلا درجہ کے نمونوں کی تعریف، عمارتوں میں ٹائیلوں پر گل بوٹوں کا کام جو کاشی کاری کہلاتا ہے، کا تذکرہ، مصوری اور نقاشی کے بے مثل شاہکار کا تعارف، یہ سب چیزیں پڑھنے والے کے لئے فرحت احساس کا سبب بنتی ہیں۔ قدیم طرز کے چائے خانے جہاں قالین بچھے ہوئے فرش پر بیٹھے ہوئے اشخاص اور ان کی آزادانہ گفتگو میں، بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہیں۔

طب یونانی سے متعلق اداروں، ان میں جاری تحقیق کے معیار، استادوں اور طلبا کا تحقیق میں انہماک، تصنیف و تالیف کے اذکار بھی قابل توجہ ہیں اور خاصے تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں پر ایک واقعہ کا ذکر کریں۔ مغلیہ دور میں جس کے عروج کا زمانہ اکبر سے شروع ہوتا ہے اور شاہجہاں پر ختم ہوتا ہے۔ ایران سے روابط بہت بڑھ گئے تھے۔ ایرانی شعرا، ایرانی منتظمین بڑی تعداد میں ہندوستان کی طرف رجوع ہوئے تھے اور یہاں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی تھی۔ چنانچہ اکبر کے دربار میں شاہ عباس کے سفیر نے تحفہ جات کے ساتھ ایک رباعی پڑھ کر سنائی۔

یونان بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد	رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینۂ پُر از زر نازد	عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

جس وقت یہ رباعی سنائی گئی تو دربار میں سناٹا چھا گیا اور ہر شخص چونک اٹھا۔ اکبر نے فیضی کی طرف دیکھا، جس نے اپنے آقا کی سبکی کو برداشت نہ کرتے ہوئے فی البدیہہ یہ رباعی سنائی :

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد	دریا بہ گہر، فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد	کونین بہ ذاتِ پاکِ اکبر نازد

اس فی البدیہہ رباعی سے دربار چمک اٹھا۔ دور مغلیہ میں ایران سے جو روابط استوار ہوئے ان کا سلسلہ آج تک چلا جاتا ہے۔ اگرچہ زبان فارسی کا چلن اب کم ہو گیا ہے مگر ایران سے دلچسپی میں کمی نہیں آئی ہے۔ ایران نامہ کے مصنف کا ہمیں مشکور ہونا چاہیے کہ اس کے ذریعہ ایران کی تاریخ اور اس کے ناموران کے کارنامے ہم تک پہنچ گئے۔

Faizkada, Sir Syed Nagar,

Aligarh - 202 002 (U.P)

■■■

حالات کے زیر اثر تحقیق کو دانش گاہوں میں پناہ گزیں ہونا پڑا ہے اور ایسے ہی حالات کے تحت تحقیق کرنے والوں کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے۔ جب کہیں پناہ گزینوں کا سیلاب آتا ہے تو شہری زندگی میں بہت سے پریشان کن مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، یہاں بھی یہی ہوا ہے۔ اس کے علاوہ، عام سماجی زندگی میں جو بے ترتیبی ہے اور جاہ و منصب کی ہوس جس طرح گھیرے میں لیے ہوئے ہے، وہی صورتِ حال علمی اداروں میں بھی رونما ہوتی جا رہی ہے اور اچھے استاد اور اچھے دنیادار کا فرق گویا اٹھتا جا رہا ہے۔

رشید حسن خاں

ادبی تحقیق۔ مسائل اور تجزیہ

فہرست میکروفلم نسخہ ہائے خطی

فارسی و عربی کتابخانہ سید ظل الرحمان

مرکز مائکروفلم نور ایران۔ ہند (واقع در خانہ فرہنگ ایران نئی دہلی) نے حکیم سید ظل الرحمن صاحب کے کتابخانے کے ۲۹۰ عربی اور فارسی مخطوطات کی مائکروفلم بنائی اور پھر اس کی فہرست مندرجہ بالا عنوان سے ۱x۱+۱۲۱ صفحات میں ۲۰۰۱ء میں شائع کی۔ مذکورہ مرکز کی جانب سے شائع کردہ مائکروفلم کی یہ تیسری فہرست ہے۔ اس سے قبل مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے مخطوطات عربی و فارسی کی مائکروفلموں کی دو فہرستیں شائع ہوئی تھیں۔ کتاب کا انتساب حکیم مولانا سید غلام حسنین موسوی کنتوری (ت ۱۲۴۷-۱۳۳۲ھ) کے نام کیا گیا ہے۔

'پیش گفتار' ڈاکٹر مہدی خواجہ پیری کے قلم سے ہے جو فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہے۔ چونکہ یہ مخطوطات حکیم ظل الرحمان کے کتابخانے سے متعلق ہیں جن کا تعلق طب سے ہے اور طبی مخطوطات کی تعداد بھی سب سے زیادہ ہے (یعنی ۱۵۴) اس لئے خواجہ پیری نے اپنے پیش گفتار میں علم طب اور اس کی عہد بہ عہد ارتقا پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ فہرست میں شامل مختلف موضوعات سے متعلق مخطوطات کی تعداد کچھ اس طرح ہے :-

قرآن و علوم قرآنی	۱۲	تصوف	۱۶
حدیث	۲	اخلاق	۷
کلام و عقائد	۱۲	ملفوظات	۳
فقہ	۱۵	ادعیہ و اوراد	۱۷
انساب	۲	فلسفہ و ہیئت	۲
تذکرہ و سیر	۱	نامہ نگاری	۲
تذکرہ	۱	فرہنگ نامہ	۳
زندگینامہ	۱۰	دستور زبان فارسی و عربی	۳
معانی و بیان	۲		
دیوان و شرح دیوان، منظومہ و شرح منظومہ	۱۶		
تاریخ	۳		

علوم طبیعی	۲
طب	۱۵۴
آشپزی	۲
موسیقی	۱
چند دانش	۲

کل = ۲۹۰

اس طرح اس فہرست میں اردو کے ۲، عربی کے ۶۷، اور فارسی کے ۲۲۱ مخطوطات شامل ہیں۔ فہرست کتابہا، مولفین، مترجمین اور شارحین نیز فہرست کا تبین کے عنوانات سے تین جداگانہ فہرستیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ طبی کتابوں کے پیش نظر حکیم سید ظل الرحمان کے کتابخانے کے مخطوطات اہمیت کے حامل ہیں۔ مرکز نور نے ان مخطوطات کی مائکروفلم بناکر ایک طرف انھیں ضائع ہونے سے بچایا ہے تو دوسری طرف اس کی فہرست شائع کرکے اہل تحقیق کیلئے آسانیاں پیدا کردی ہیں تاکہ اس ذخیرے سے استفادے کی راہیں آسان ہوسکیں۔ فہرست کی اشاعت پر مرکز نور کے ذمہ دار اور پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان ہمارے شکریہ کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

●●●

فساد رُک گیا

"شکر ہے کہ اب یہاں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا"۔ توفیق نے بسکٹ کا ایک ٹکڑا منھ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اچ چھو" سیماب کو پانی سرک گیا تھا۔ وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو گیا۔

اصل میں دونوں اپنے اپنے کام کے سلسلے میں سکریٹریٹ آئے تھے مگر جس ٹیبل پر ان دونوں کا کام اٹکا تھا اس ٹیبل کا بابو (کرانی) ساڑھے بارہ بجے تک آیا ہی نہیں دونوں نے یہ اطمینان بھی کرنا چاہا کہ اگر وہ چھٹی پر ہو تو دونوں لوٹ جائیں۔ مگر اس سکشن کے بڑا بابو نے صاف صاف کہا کہ "نہیں چھٹی کی درخواست نہیں ہے۔ بڑا بابو کے یہ کہہ دینے کے بعد رکنے کے علاوہ چارہ کار کیا تھا"؟

سیماب اور توفیق نے ساڑھے پانچ بجے بھور والی ٹرین پکڑی تھی، اس ٹرین کا راجدھانی پہنچنے کا وقت بہت صحیح تھا، دفتر کھلنے کے آس پاس پہونچ جاتی تھی مگر اس دن ٹرین اپنے وقت سے دو گھنٹہ لیٹ پہنچی، نتیجتاً دونوں بھاگم بھاگ سکریٹریٹ پہنچے۔ کہیں ایک گلاس پانی پینے کا بھی موقع نہ مل سکا مگر سکریٹریٹ پہنچ کر یہ ساری بھاگ دوڑ بے معنی محسوس ہونے لگی۔ ٹیبل پر وہ بابو تو تھا ہی نہیں جس سے دونوں کا کام اٹکا تھا۔

ہال کے ایک کنارے ایک بڑا سا ٹیبل لگا ہوا تھا، اس پر ایک آدمی ذرا زیادہ بھرے پُرے انداز میں بیٹھا نظر آیا۔ اس ٹیبل کے ارد گرد دوسرے ٹیبلوں کی بہ نسبت کرسیاں بھی زیادہ تھیں، اندازہ ہوا کہ بڑا بابو یہی ہوں گے، دونوں ٹہلتے رہے۔ ایک سوا ایک کے قریب پھر بڑا بابو کے پاس گئے: "سر کوئی خبر ملی؟" بڑے بابو نے بڑی اکتائی نظر سے دونوں کو دیکھا اور پھر اس سے زیادہ اُکتائے ہوئے لہجے میں بولے: "جہاں آپ وہاں ہم۔ خبر کیسے ملے گی؟"

سیماب اور توفیق کے پاس چپ ہو جانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔

مگر اتفاق سے اسی وقت ایک اور صاحب بڑا بابو کے پاس آگئے تو بڑا بابو نے ان سے پوچھ لیا: گپتا جی۔ یادو کی کوئی سوچنا ہے؟ آئے گا کہ نہیں؟"

یادو جی آگئے ہیں نہ "اس آدمی نے لہک کر خبر دی۔

"کہاں ہے؟" بڑا بابو نے پوچھا۔

"تنک منترالئے میں گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے"۔

ادھر سے ہو کر جاتا۔ جواب دیتے دیتے آدمی کا بھیجا پک جاتا ہے"۔ بڑا بابو کی آواز بہت تھکی تھکی تھی۔

توفیق اور سیماب اس کے بعد وہاں پر ٹھہرے نہیں۔ بھوک بھی دونوں کو شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں پاس کے ایک ہوٹل میں چلے آئے۔ راستے ہی میں بات چل نکلی تو چلتے چلتے امن و قانون کا مسئلہ بھی زیر بحث آہی گیا۔ اسی پر توفیق نے لسٹ کا ایک ٹکڑا منھ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا: شکر ہے کہ اب یہاں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا۔ اسی وقت سیماب کو پانی سرک گیا تھا اور وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو گیا تھا۔ کھانسی رکی تو اس کی نظر گھڑی پر گئی۔ دو بج رہے تھے۔ سیماب جلدی سے کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا: "چلئے چلئے اب شاید بابو آ گیا ہو"۔ توفیق نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ دونوں ٹیبل کے پاس پہنچے تو دونوں ہی کی باچھیں کھل گئیں۔ بابو کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔

سیماب نے دور ہی سے نمستے پرنام کرنا چاہا مگر پھر خیال آیا کہ اس سے پہلے کی کوئی بے تکلفی کیا جان پہچان بھی نہیں ہے۔ توفیق کا انداز ٹیبل پر پہنچنے تک بہت محتاط رہا۔ دونوں ٹیبل کے پاس پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ بابو فائل دیکھتا رہا، توفیق ذرا سا کھنکارا، اس پر بھی بابو فائل دیکھتا رہا، سیماب نے بڑے رسان سے کہا: "آداب عرض"۔ مگر بابو کی نگاہ فائل سے نہ ہٹی، تب توفیق نے ذرا زور سے کہا "نمستے یادو جی"۔ اس پر یادو جی نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا مگر نگاہ فائل ہی پر لگی رہی۔

"ہم لوگ سسرام سے آئے ہیں"۔ توفیق بولا

"ہم لوگ تو گیارہ بجے یہاں پہنچ گئے تھے"۔ اتنا کہہ کر سیماب رُک گیا، اصل میں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ جملہ صحیح ہوا کہ غلط!

"آپ شاید منترالیہ میں تھے"۔ توفیق نے بات سنبھال لی۔ بابو کی غیر حاضری کو ذرا خوبصورت اور پُر وقار بنا دیا۔

"ہم لوگوں کی فائل آپ کے یہاں ہے"۔ سیماب بالآخر نفس مطلب پر آ ہی گیا۔

"کون سی فائل؟" یادو جی نے سر اُٹھائے بغیر پوچھا۔

"چھٹی بغیر تنخواہ کی"

"کہاں سے آئی ہے؟"

"ٹاؤن ہائی اسکول، سسرام سے"

"نہیں۔ یہاں کوئی فائل نہیں ہے"

"یادو جی۔ دیکھئے نا۔ وہاں کا ڈسپیچ نمبر اور تاریخ یہ ہے"۔ توفیق نے جلدی سے بیگ کھول کر ایک کاغذ نکالا۔

"وہاں کے ڈسپیچ اور تھی سے ہمیں کیا لینا دینا؟ یہاں پہنچنا چاہیے"۔ اب کے یادو جی نے سر اُٹھایا تھا۔

جب اپلیکیشن وہاں سے پندرہ دن پہلے آپ کے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجی جا چکی تو پھر اور کہاں جائے گی؟ سیماب

نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"آپ لوگ تو ایسی ایسی بات کرتے ہیں کہ آچرج ہوتا ہے"۔ یادو جی بہت تیکھے لہجے میں بولے: کہ آپ لوگ شیچھک کیسے بن گئے؟"

سیماب اور توفیق دونوں اندر اندر کھول رہے تھے مگر برداشت کرنے کے علاوہ چارہ کیا تھا۔

"کرپا کر کے یہی بتادیجئے کہ ایپلیکیشن کہاں ہو سکتی ہے"۔ توفیق بہت آہستہ سے بولا۔

"لادو لدو ادو، لدوا کے گھر پہنچادو۔ ایسی کر رہے ہیں آپ لوگ"۔ یادو جی بغل والے ٹیبل پر بیٹھے ساتھی کی طرف دیکھ کر بہت زور سے ہنسے۔ "جب آپ لوگ کو اتنا بھی گیان نہیں تو آپ لوگ سچیوالئے میں آئے کا ہے کو؟"

ادبدا کے سیماب توفیق نے ایک دوسرے کو دیکھا، شاید دونوں ہی نے کچھ کہنا چاہا اور نہ کہہ سکے۔ یادو جی پھر فائل میں گم ہو گئے تھے۔

"یادو جی!" توفیق نے عجب انداز میں یادو جی کو مخاطب کیا۔

توفیق کے منھ سے آواز نکلی تو سیماب نے بڑی تاسف بھری نگاہ توفیق پر کی، صاف محسوس ہوا کہ توفیق نے تھوک نگلا ہے، اُدھر توفیق بھی "یادو جی" کہہ کر رُک سا گیا تھا، جیسے اپنے الفاظ تول رہا ہو، پھر ذرا رُک کر بولا:

"یہاں کی کاریہ نالی کا ہمیں گیان نہیں۔ تنک آپ مارگ درشن دے دیجئے"۔

اس پر یادو جی نے گردن اُٹھائی اور بولے: ہر ڈاک ڈسپچر کے یہاں سے ٹیبل پر آتی ہے۔ ڈسپچر کے یہاں دیکھئے"۔ یادو جی کا موڈ ابھی بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا مگر آواز ذرا نرم اور مہربانی جھلکاتی محسوس ہو رہی تھی۔

دونوں ڈسپچر کے یہاں دوڑے۔ اس کا رنگ ڈھنگ بھی یادو جی سے کچھ کم نہ تھا مگر جب ۲۵ روپیہ اس کی جیب میں گیا تو اس نے رجسٹر دیکھ کر بتایا کہ "چٹھی تو دس دن پہلے یادو جی کے یہاں چلی گئی۔ دونوں پھر یادو جی کے پاس آئے اور بڑے ادب سے بولے: سر! چٹھی تو دس دن پہلے یہاں آچکی"۔ "بلائیے۔ ہری واس کو بلائیے"۔ یادو جی نے حکم دینے کے انداز میں کہا۔

جب دونوں نے ہری واس ڈسپچر تک یادو جی کا پیغام پہنچایا تو اس نے وہیں سے پکار کر کہا: "ہاں یادو جی! چٹھیا تو ستر ہے (سترہ ہی) کی تتھی میں آپ اصول (وصول) کئے ہیں نے!"

"اچھا ٹھہرئے۔ دیکھتے ہیں"۔ اتنا کہہ کر یادو جی پھر فائل دیکھنے لگے۔

سیماب اور توفیق ٹیبل کے پاس کھڑے رہے، یادو جی فائل دیکھتے رہے...... دیکھتے رہے......"

"ارے رے رے...... یہ مارا" فائل دیکھتے دیکھتے اچانک یادو جی جیسے خوشی سے اُچھل پڑے اور فائل لئے ہوئے بڑا بابو کے ٹیبل کی طرف دوڑے، اور فائل ٹیبل پر، بڑا بابو کے سامنے پٹخ کر زور سے بولے: دیکھل جائی اگر ایمیں لکھل باکی نا

ہیں کہ ....''

یادو جی فائل میں لکھی کسی خاص بات پر انگلی رکھے ہوئے تھے اور اس خاص بات یا نکتہ کے بارے میں زور زور سے بولے چلے جا رہے تھے، اور بڑا بابو ''سنیے تو، سمجھیے تو، اس کے آگے دیکھیے تو'' کر رہے تھے مگر یادو جی تو اپنی دُھن میں مگن تھے۔ اسی دُھن میں وہ بڑا بابو کے ٹیبل سے۔'' ہم تو اکرا کے منتری جی کے دکھائب .... جرور دکھائب .... اک دم دکھائب'' کہتے ہوئے اور رٹتے ہوئے ہال سے باہر نکل گئے۔

سیماب اور توفیق دونوں ہال کے بیچوں بیچ کھڑے تھے، اور دیوار گیر گھڑی میں گھنٹے والا کانٹا چار پر بکا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد لوگ اپنی اپنی کرسی پر سے اٹھنے لگے۔ ساڑھے چار بجتے بجتے پورا ہال خالی ہو گیا۔ وہ دونوں پانچ بجے تک اندر باہر کرتے رہے مگر جب پانچ بجے چپراسی تالا لگانے آگیا تو ان کو بھی باہر آنا ہی پڑا۔

''یادو جی اب اِدھر نہیں آئیں گے؟'' چپراسی جب تالا بند کر رہا تھا تو توفیق نے ایک بہت بیوقوفانہ سوال کر ڈالا۔

''اب پانچ بجے اِدھر آکے کیا کریں گے؟'' چپراسی بولا، پھر بتیسوں دانت نکال کے ہنسا: ''منترالئے سے کوئی اِدھر آتا ہے؟''

جب دونوں سکریٹریٹ سے باہر نکلے تو شام گہری ہو چلی تھی۔ ٹمپو پکڑنے کے لئے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اچانک سیماب کو جانے کیا یاد آگیا:

''توفیق بھائی...... وہ، دوپہر کو آپ کیا کہہ رہے تھے؟''

''کیا کہہ رہا تھا؟'' توفیق نے بہت اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''آپ نے شاید کہا تھا نا کہ .... اب یہاں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا''

''پتا نہیں بھائی۔ یاد نہیں آرہا ہے کیا کہا تھا''۔ توفیق کی آواز بہت جھلائی ہوئی تھی۔

چاروں طرف سے اندھیرا ان کی طرف دوڑا چلا آرہا تھا..........!!

Sir Syed Colony, New Karimaganj, GAYA (BIHAR).

■ ■ ■

زوالِ جسم

نہ چاہتے ہوئے بھی اسے واپسی کے لئے مڑنا تھا۔

پھر وہی دم گھونٹتے سناٹے کی خونخوار باہیں اسے سمیٹنے کی منتظر تھیں، جو اسے صرف سکار رہی تھیں۔

تنہائیاں بارودی سرنگوں کی طرح زمین جسم میں پھیلی ہوئی تھیں اور ناگ پھنی کے اوپر سے گزرتی اپنی مقروض سانسوں کے ساتھ وہ ریت کے ساگر میں ایک ذرۂ بے وقعت کے سمان گم ہوتے وجود کو بچالینا چاہتی تھی۔

مگر اندر کا طوفان باہر سے کہیں زیادہ تھا!

کپڑوں کی تہوں کے بھیتر تک پہنچنے والے رشتے کی گدگداہٹ تک آئی تو تھی، مگر اسے محسوسنے کا قرب کبھی حاصل نہ ہوا۔ بھوگ کا آنند بھوگنے والے سپنوں کو ساکار کرنے کا راستہ ملا تو آنند قریب نہیں تھا۔ وہ شاید اسے بھوگ کی وستو سمجھتا ہی نہیں تھا۔

' اچھا ہوتا کہ وہ پلاسٹک یا ربر کی گڑیا ہوتی۔ شوکیس میں بند بند کسی کی بے حسی کا درد تو نہ کھاتا اسے!'

وہ اکثر سوچتی اور تلملاتی۔

آنند اسے ایسا ہی کیوں تھا ؟'

یہ سوال بھی اسے دور تک چھوتا۔

اونچے لوگ اپنے اندھے قلعے میں شام کے اندھیرے سے پہلے ایک چراغ جلانے کی خاطر اٹھالاتے ہیں کہیں سے کوئی نازک شیشہ، جو پتھریلی دیواروں سے ٹکرا کر چکنا چور ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس کی جھنجھناہٹ سے بھی کوئی گوشہ بیدار نہیں ہوتا۔

کوئی تھا بھی نہیں، جس کی آرزو پوری کرنے کے لئے اس کی ضرورت پیش آتی!

مگر آنند جیسے لوگ تو بہت سا کام صرف دکھاوا کے لئے بھی کرتے ہیں۔ اس لئے لے آیا اسے تاکہ ویرانے میں پلنے والی بہاروں کو خزاں کا غم نہ ہو!

موسم کے ساتھ لباس زیب تن کرنے والوں کی بھیڑ میں جینا بھی کتنا دشوار ہوتا ہے، جہاں بھکاری کا بھرا تھیلا بھی خالی لگتا ہے!

باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی اور اندر بھیگنے کا کوئی سامان نہیں تھا۔ ملازمین اپنی کوٹھریوں میں بند ہو چکے تھے۔ بڑھتے کالے دھبے کے ہمراہ صرف وہ جاگ رہی تھی۔ رات کی پر سکون چھاتی پر سر رکھ کر سونا شاید اس کے نصیب میں نہیں تھا!

رم جھم برسات سے شرابور منظر کو آنکھوں میں بسانے، دل میں اُتارنے نکل آئی باہر برآمدہ میں۔ لیکن بھیگے منظر نے درد میں اضافہ ہی کیا تھا۔

اپنی ہی دھنوں پر ہوا رقصاں تھی اور پانی کی ہر ضرب پر پتیاں جل ترنگ بجا رہی تھیں۔ اس کے سامنے لذتوں کا ایک جہاں آباد تھا۔ مگر کچھ نہیں تھا اس کے نام! ایک بوند بھی نہیں جس کی وہ متلاشی تھی۔ وہی ایک قطرۂ آلودہ جس کی چوٹ اندر دور تک پہنچ کر رگ سنگ کے خفتہ جذبوں کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے!

جنم سے جنم تک کے سفر میں کتنے ضروری ہوتے ہیں کچھ قطرے!

وہ باؤلی سی برآمدے سے نیچے اتری اور بھیگتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔ تبھی ایک خالی رکشا قریب سے گزرا۔ اس کی پکار پر وہ ٹھہرا تو اس میں بیٹھتی ہوئی بولی، "بس چلتے رہو"۔

رکشے کے ہڈ کے باہر پڑا جسم بھیگ رہا تھا اور وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگی جا رہی تھی۔ کبھی کبھار وہ ہتھیلیوں کو باہر نکال کر پانی کو ان پر روکتی اور چہرے پر مل لیتی۔ مگر آگ ٹھنڈی ہونے کی بجائے تیز ہو گئی، جیسے پانی نہیں، پٹرول کی بارش ہو رہی ہو!

ذرا بجلی چمکی تو خیالات کے گھنے جنگل سے وہ باہر آئی اور رکشا ٹھہرانے کو کہا۔

یہ ایک نائٹ کلب تھا۔ باہر سے اونگھتا، مگر اندر سے جاگتا! اس کے کمپاؤنڈ میں کئی قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں آنند کی کار صاف دکھائی دے رہی تھی۔ رکشے سے اتر کر صدر دروازے کی طرف وہ بڑھ رہی تھی کہ رکشا والے کی آواز نے اس ٹھٹھکا دیا۔

"یہاں میم صاب! یہاں؟" وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہاں تو شہر کے وہ سفید پوش اور ان کی عورتیں آتی ہیں جو کپڑوں میں ہو کر بھی ننگے ہوتے ہیں، ایک دم ننگے"۔

اتنی دیر کے سفر میں پہلی بار اس پر نظر پڑی تھی۔ وہ اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے مضبوط گٹھے ہوئے بازو، پھٹی سینڈو میں الجھی ہوئی چوڑی چھاتی اور...... اور اس نے پُر کیف سسکاری بھری اور نچلے ہونٹ پر دانت بیٹھا لئے...... بس انگلیوں کی ہلکی جنبش اور چھپا مرد بھی بے پردہ۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو دبوچا اور جھپاک سے رکشے میں بیٹھتی ہوئی بولی۔ "واپس چلو"۔

رکشے والے کے بدن سے نکلنے والی پسینے کی بُو راستہ بھر اُسے پاگل بناتی رہی۔ خشک دھرتی پر بارش کی پہلی

چھار کے بعد مائی سے اٹھتی سوندھی گندھ کے سمان اس کے جسم کی مہک اسے زندگی کی لہروں پر اڑائے لئے جا رہی تھی کہ اس کی آواز نے اس کے تپتے خیالوں کی روانی میں بریک لگا دیا۔

"آ گیا میم صاحب!"

"او اچھا"۔ وہ ایک جھٹکے سے اتری اور تقریباً دوڑتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی .... اور جب واپس ہوئی تو وہ ایک دیو کی طرح صحن میں کھڑا اپنے بھیگے بدن کو ہاتھوں سے نچوڑ رہا تھا۔ وہ اس کے مقابل سچ مچ گڑیا لگ رہی تھی۔

"سنو"۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو سمیٹا اور لرزتی ہوئی بولی: "آج کی شب یہیں ٹھہر جاؤ"۔ اور اپنی تھر تھراتی ہوئی دونوں ہتھیلیاں اس کی طرح بڑھا دیں۔ جن میں کئی چھوٹے بڑے نوٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ آنچل نیچے ڈھلک گیا تھا اور بلاؤز کے اندر پھنسا سیلاب نکلا چلا آ رہا تھا۔ مگر وہ تو صرف اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور وہ چور بنی خود کو ننگا ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ اپنا آپ حاصل کرنے کی جنگ کا شاید خاتمہ ہونے کو تھا۔

"میم صاب!"

اس کی آنکھوں کی بڑھتی ہوئی تیز آنچ سے وہ جھلسی جا رہی تھی کہ گمبھیر آواز کی گرم سلاخیں کانوں میں اتر گئیں۔ ریگستان میں پھنسے مسافر کے لئے سراب بھی نہیں تھا۔

"میم صاب! ہر مرد کا شریر اپنی عورت کی امانت ہوتا ہے اور ہر عورت اپنے مرد کی"۔ زندگی کی کھردری چھاتی پر سر رکھ کر رونے کی تمنا بھی جاتی رہی۔

اس کے ہاتھوں میں لہراتے نوٹوں میں سے ایک بیس کا نوٹ اس نے کھینچا اور کہا۔

"بس یہی میری مجبوری ہے"۔

وقت کا آ۔ ی خنجر بھی سینے میں دھنس گیا۔

احساس کی ابھی ڈور کا کوئی سرا ملا بھی نہ تھا کہ ہوا کا ایک تیز ریلا .... اور غبار کے پھیلتے بادل میں گم ہوتی راہ کا سناٹا درد کی بے آواز چیخیں سننے کے لئے ٹھہرا نہیں تھا!

وہ سیٹی بجاتا ہوا کب کا جا چکا تھا .... مگر وہ اپنی جگہ پر کھڑی اب بھی ہانپ رہی تھی، جیسے اس نے سفر کے باقی حصے کو دوڑتے ہوئے طے کیا ہو!

Shantipuri, Motihari - 845 401
(Bihar)

غزلیاتِ فارسی

کار دل بالاست از زلفِ گرہ گیرِ شما — بستہ او را بُرد در فردوس زنجیرِ شما
کو فروغِ بخت تا بینم جمالِ اصل را — چشم و دل را میدہم تسکین ز تصویرِ شما
بو الہوس از مکر زخمی می نماید خویش را — دامنِ خود سرخ کرد از خونِ نخچیرِ شما
آہوانِ این بیابان طرفہ وجدی میکنند — التفاتی کرد شاید چشمِ رہگیرِ شما
میکند آن نرگس خوش حرف امدادِ زبان — ہست این معنی عیان از حسنِ تقریرِ شما
جز بخونِ بی گناہان نیست مایل طبع او — جوہری دارد نہایت طرفہ شمشیرِ شما

می تو آن از نامۂ مشتاقِ خود را یاد کرد
می کند از بندِ غم آزاد تحریرِ شما

◯

بی فنای خود میسر نیست دیدارِ شما — می فروشد خویش را اول خریدارِ شما
رہ نسیم نا توان را داد گلزارِ شما — بودہ ام از مدتی من نیز بیمارِ شما
من کہ باشم تا شوم در بزمِ والا باریاب — می کنم سر را فدا بر پای دیوارِ شما
صبحدم ارشاد شد البتہ شب بر می خوریم — می شناسد خوب مخلص صدقِ گفتارِ شما
گر کشد مولا غلامی را نمی باشد قصاص — این قدر از کشتنِ من چیست انکارِ شما
اندکی ترسِ جنابِ کبریا ہم لازم است — عالمی را کرد بسمل ظلمِ سر کارِ شما

جانِ من آزاد را زنجیر فرمودن چرا
ہست این دیوانہ از خود نو گرفتارِ شما

◯

می رسم امیدوارِ رحمتِ عامِ شما — قبلهٔ من بسته ام از دور احرامِ شما

می شنیدم از زبانِ سایلان نامِ شما — آمدم تا بهره ای یابم ز انعامِ شما

همچو سیاحی که در هندوستان گیرد وطن — دل اقامت کرد در زلفِ سیه فامِ شما

عیبِ سرکار از زبانِ مردمان نتوان شنید — ورنه ما را عین اکرام است دشنامِ شما

رنگِ هوشِ من ز تقریرِ صبا پرواز کرد — بوی خون می آید از اسلوبِ پیغامِ شما

نقدِ دل دادم نیم نادان که سر راهم دهم — عاشقِ جانبازم اما طالبِ بامِ شما

زادِ راهی نیست با من غیرِ یادِ دوستان — می بَرم هر جا که رو می آورم نامِ شما

گرم سازد انجمنها را ز آبِ آتشین — بادِ عمرِ مهرِ تابان روزیٔ جامِ شما

نیست عاشق را بهشتی بهتر از قیدِ بتان
از خدا آزاد خواهد سیرِ گلدامِ شما

○

دَورِ فلک به ساغرِ می کرد یادِ ما — افروخت روزگار چراغِ مرادِ ما

حاشا که ذرّه را نرسد فیضِ آفتاب — باشد به مهربانیِ او اعتمادِ ما

داریم از جنابِ تو چشمِ عنایتی — کاری کنی که راست شود اعتقادِ ما

با صد هزار زلزله از جان می رویم — آنجا که هست مثلِ توئی اتحادِ ما

شد سرنگون به چاهِ گریبانِ انفعال — بی دانشی که بست کمر بر عنادِ ما

شوخی که رم ز سایهٔ عشّاق می کند — عمرش دراز کرد به جان انقیادِ ما

شکلِ جدائیِ من و جانان بُود محال — دارد مزاجِ شیر و شکر اتحادِ ما

آزاد گشته اند خجل سروِ قامتان
از جلوهٔ صنوبرِ والا نژادِ ما

○

زندگانی می کنم افتاده بر پای شما — بوده ام هم صحبتِ زلفِ چلیپای شما

تشنگان را می کند سیراب صهبای شما — باد عمرِ خضر ارزانی به مینای شما

حاضرم در انقیاد حکم والای شما — می فشانم نقد جان یابم گر ایمای شما

شمع خاموشم چه شد کز شعلهٔ آهم نماند — هست باقی در سرِ من داغ سودای شما

از نگاهی می توان دیوانهٔ خود را نواخت — کیست جز من رونق دامان صحرای شما

آبروی خویش را در عاشقی نفروختیم — بر نتابد غیرت ما قهر بی جای شما

من کجا و باریابی در جناب مستطاب — دولتم این بس که مردم در تمنای شما

گوهر دل داشتم آن را ز خود کردم نیاز — چیست دیگر ای بتان با من تقاضای شما

قتل باید کرد بسم الله من هم حاضرم — گر چنین فرمود رای عالم آرای شما

تا قیامت صورت اخلاص من منظور نیست — یافتم ای وای این معنی ز سیمای شما

دلبران آزاد را باری چه افسون کرده اید
طور او برگشت از روز تماشای شما

○

اگر بخاطر عاطر بُود شهادتِ ما — ز دست و تیغ تو مُردن زهی سعادتِ ما

بشهد خنده بر آمیخت تُرشی دشنام — انارِ میخوشِ او بیش کرد رغبتِ ما

سزای ماست که بیداد می کنی جانان — دلیر کرد ترا شیوهٔ مروّتِ ما

ز آفتابِ قیامت دگر مترسانید — بس است سایهٔ رعنا قدی قیامتِ ما

نصیب ماست اگر این چنین چه باید کرد — که بَر جفای تو افزود حُسنِ خدمتِ ما

گشود مشتری ما گره ز دشنامی — مگر همین زرِ ناراییج است قیمتِ ما

گریستیم من و شبنم آنچنان آزاد
که گل بخونِ جگر غوطه زد ز رقتِ ما

○

کند پامال شوخیهای طفلان هوشیاران را

سپاه ناز باشد در جلو این نیسواران را
مزاج کم کسی بر الفتِ اوّل بجا ماند

بروز بیکسی سنجیده ام بسیار یاران را
قیامت می کند سنگی که از کوه بلند افتد

مبادا خشم در جنبش در آرد بُرد باران را
توان دریافت از ظلّ هما بر چهرۀ شاهان

که دولت هم سواد الجبه باشد تاجداران را
محک را زرد روئی می شود از امتحان حاصل

مکن از آزمودن منفعل ناقص عیاران را
بُود آزاد نقدِ خاکساری قیمتِ انسان

نمی ارزد نسب بی بندگی والا تباران را

○

نمی آید اگر از دست خوبان مهربانیها زمن هرگز نخواهد کرد گل جز جانفشانیها
نگاه یار دارد تکیه بربازوی خود داری نمی افتد بجایی با کمال نا توانیها
مرا از هیچ کس گردِ ملالی نیست بر خاطر که طبع نازک من بر نمی دارد گرانیها
ز طرز شوخی آن نرگس بیمار دانستم توان کردن بزور نا توانی پهلوانیها
ادای مدعا نوعی که باید کرد خاموشی لب گوهر نشان ما نثار بی زبانیها
ترا ای ماه بر سر منزل من گر گزر افتد کند از فیض بالیدن زمینم آسمانیها

غلام حلقه در گوش توام هر چند آزادم
سرت گردم مرا از تست چشم قدر دانیها

○

پروفیسر وارث کرمانی

دیوا شریف، بارہ بنکی

غزل

این تضاد ای دل دران محبوب بی ھمتا چرا

این قدر قاتل چرا باز این قدر زیبا چرا

گاہ نا امید گرداند گہی امیدوار

خاطرم را میکند آخر تہ و بالا چرا

فکر را از جلوۂ رنگین گلستان میکند

روح را مہجور می دارد خداوند چرا

آنکہ با شعرش بہ اوج کہکشاں کردی سفر

آخرش در شہر خود بگذاشتی تنہا چرا

خاک را نسبت کجا با عالم پاک ای صبا

درمیانِ لالہ و گل روی یار ما چرا

رخ بسوی قُم کند وارثؔ چو بگذارد نماز

صبح میدانی کہ رو گردان شد از کعبہ چرا

غزل

خداوندا چنان کن بی خبر در عشق خود ما را
که نشناسد دل بی تاب ہرگز دین و دنیا را

من از نادیدنت سرگشتہ ام ہر جا چہ ناز است این
که در ہر جائی و پوشیده می سازی زمن جا را

مده جز درد عشق خویشتن ای لیلی عالم
درین صحرای پُر وحشت من مجنون و شیدا را

اگر خواہم ز اوصافِ جمالت شمه ای گویم
شوم حیران بگویم فہم انسان را کجا یا را

ز شادی تا دمِ مُردن به پیراہن نمی گنجم
دمی گر چون قبا در بَر کشم آن قد رعنا را

تو بیزاری و دشمن پُر ستمکاری و ناچاری
چہ سازم گر نه ہر دم سر کنم این وای ویلا را

خدا وندا مگردان نا امید از دولت وصلش
طفیلِ و احسانِ خود انیسؔ زار و رسوا را

فہیمؔ جوگاپوری
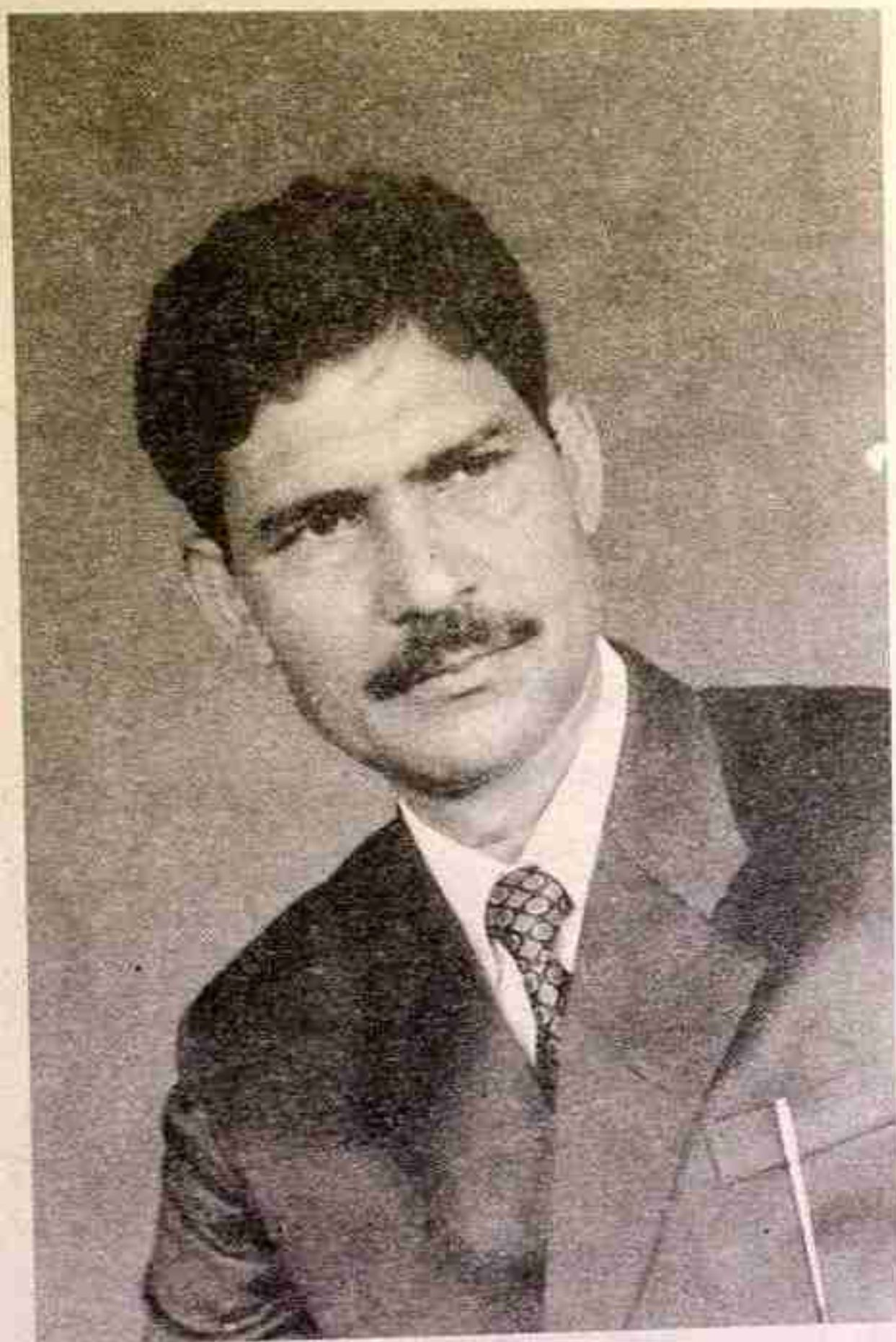
شہرت ملے سخن کو تو یہ مان لو فہیمؔ
یہ دین ہے خدا کی تمہارا ہنر کہاں

ڈاکٹر ظفر کمالی

فہیمؔ جوگاپوری - احوال و انتخاب کلام

نام محمد حفظ الرحمن صدیقی تخلص فہیمؔ ۔ ابن رحیم اللہ صدیقی ابن مبارک حسین ابن شیخ اکبر حسین۔ خاندانی روایت کے مطابق آباواجداد کا تعلق شاہ جہاں کے بیٹے دارا کی فوج سے تھا۔ اورنگ زیب سے لڑائی میں شکست کھانے کے بعد جب دارا قتل کر دیا گیا تو فہیمؔ کے اجداد، جن کا مستقر نواح آگرہ تھا، وہاں سے ہجرت کر گئے اور مختلف نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے سیوان سے پچیس کلومیٹر شمال مشرق میں جوگاپور نام کی بستی میں سکونت اختیار کی۔

فہیمؔ کے دادا مبارک حسین پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور والدین کے چہیتے تھے۔ یہ چمپارن میں انگریزی عمل داری میں ملازم تھے۔ لوگ داروغہ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس زمانے میں خوش حال گھرانوں میں بالعموم ایک اولاد کو پہلوانی سکھائی جاتی تھی جسے مقامی زبان میں "پوسوا پہلوان" کہتے تھے۔ مبارک حسین ایسے ہی پہلوان تھے۔ ان کی تین شادیاں ہوئیں۔ پہلی بی بی سے دو لڑکے، دوسری سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی اور تیسری سے بھی ایک لڑکا اور ایک لڑکی کی پیدائش ہوئی۔ فہیمؔ کے والد رحیم اللہ صدیقی دوسری اہلیہ کے بطن سے تھے جو نوادہ نزد مانجھا گڑھ کی رہنے والی تھیں۔

رحیم اللہ صدیقی کانپور گن فیکٹری میں ملازم تھے۔ تعلیم گھریلو تھی لیکن انگریزی لکھ پڑھ لیتے تھے۔ بزرگوں کی صحبت کی وجہ سے مذہبی معلومات وسیع تھی۔ یادداشت اچھی اور صاف گوئی فطرت تھی۔ پابند شرع تھے۔ خلاف شریعت کاموں پر بڑے بڑوں کو ٹوک دینے میں عار نہ تھا۔ شاعر نہیں تھے لیکن شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ حالیؔ اور اقبالؔ کے کافی اشعار ازبر تھے۔ اپنے پسندیدہ اشعار مختلف ڈائریوں میں نوٹ کرتے رہتے تھے۔ ۹ر اگست ۱۹۸۸ء کو جوگاپور میں انتقال ہوا۔ ان کی شادی نوادہ نزد مانجھا گڑھ ضلع سارن حال ضلع گوپال گنج میں محمد صدیق کی صاحبزادی معصوم جنت سے ہوئی۔ خوش دامن کا نام رقیب النساء تھا۔

معصوم جنت کے بطن سے پانچ بچے تولد ہوئے جن کے نام بالترتیب یوں ہیں:

(۱) آسیہ خاتون (۲) حبیب الرحمن صدیقی (۳) عبد الرحمن صدیقی (۴) محمد حفظ الرحمن صدیقی (۵) حبیبہ خاتون۔ آسیہ خاتون کی شادی ہرپور نزد بوہریا عبد المناف سے ہوئی۔ حبیب الرحمن صدیقی نے ندوے سے عالم اور دیوبند سے فضیلت کی سند حاصل کی۔ ساتھ ہی لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ ان دنوں

دلی میں مقیم ہیں اور اپنا کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ چلاتے ہیں۔ عبید اللہ صدیقی نے ندوے سے عالم فاضل کیا اور سہارن پور سے تخصص کی ڈگری حاصل کی۔ فی الوقت دبئی میں درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔ حبیبہ خاتون کی شادی موضع بھاوانزوجا موبازار محمد سلیم اللہ سے ہوئی۔

نسیم ۱۹۵۵ء میں اپنی ننھیال نواوہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کی سند میں تاریخ پیدائش ۲۹؍ مارچ ۱۹۵۶ء درج ہے جو درست نہیں ہے۔ نسیم کی پیدائش کی صحیح تاریخ اور مہینے کا تعین اب دشوار ہے۔ ان کے والد نے جس ڈائری میں اپنے بچوں کی پیدائش کی تاریخیں لکھ رکھی تھیں وہ دیمک کی نذر ہوگئی۔ نسیم کی والدہ کا کہنا ہے کہ یہ اگہن کے مہینے میں تولد ہوئے تھے اگر اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر ماہِ ولادت نومبر - دسمبر قرار دیا جاسکتا ہے۔

نسیم نے ابتدائی تعلیم کانپور میں اپنے والد کے ذریعے حاصل کی جہاں وہ ملازمت کے سلسلے میں گن فیکٹری کی کالونی ارما پور اسٹیٹ میں رہتے تھے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد جوگا پور مکتب میں درجہ دوم میں داخلہ ہوا۔ ہشتم سے نہم تک کی تعلیم بڑہریا ہائی اسکول میں حاصل کی۔ ۱۹۷۱ء میں مادھو پور ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ والد کی خواہش تھی کہ نسیم کالج کی تعلیم گھر رہ کر حاصل کریں جب کہ یہ باہر پڑھنا چاہتے تھے۔ جب والد نے ان کی بات قبول نہیں کی تو یہ کانپور چلے گئے۔ طبیعت سیمابی تھی۔ کانپور میں ٹائپنگ اور ڈرائیوری سیکھی لیکن چمڑے کے کارخانے میں ملازمت شروع کی۔ ۱۹۷۳ء میں بی۔ایس۔ایف میں بحال ہوئے۔ ۹؍ مئی سے ملازمت کی ابتدا ہوئی۔ ٹریننگ کے سلسلے میں چھ ماہ گوالیار، اس کے بعد بنگلور گئے۔ جولائی ۱۹۷۴ء میں پہلی تقرری Zunhe Boto (ناگالینڈ) میں ہوئی۔ ۱۹۷۵ء میں چوراچاند پور (منی پور) تبادلہ ہوا۔

نسیم فٹ بال، باسکٹ بال اور والی بال یکساں طور پر کھیلتے تھے۔ ٹریننگ کی مدت میں ہی فٹ بال بٹالین ٹیم میں چن لیے گئے۔ بعد میں باسکٹ بال کی ٹیم کے کوچ نے انھیں اپنی ٹیم میں شامل کر لیا جس میں انھوں نے ترقی کی۔ ہندوستان کے مختلف گوشوں گوہاٹی، شیلانگ، جالندھر وغیرہ میں باسکٹ بال کھیلتے رہے۔ دورانِ ملازمت ہی تعلیمی خواہش نے پھر انگڑائی لی چنانچہ انھوں نے ۱۹۷۵ء میں زیڈ۔اے اسلامیہ کالج سیوان سے آئی۔اے اور یہیں سے ۱۹۷۹ء میں بی۔اے کا امتحان پرائیوٹ طور پر دیا اور دونوں میں دوسرے درجے میں کامیاب ہوئے۔ اعلا تعلیم حاصل کرنے کے خیال سے چودہ اگست ۱۹۷۹ء کو نوکری سے استعفاد دے دیا اور اسی سال ستمبر کے آخر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو ایم۔اے میں داخلہ لیا۔ نسیم اس ارادے سے علی گڑھ گئے تھے کہ ایم۔اے کرنے کے بعد ریسرچ کریں گے لیکن وہاں جاکر دیکھا کہ لوگ ریسرچ کرنے کے بعد بھی بے کار گھوم رہے ہیں، لہٰذا تعلیم سے دل برداشتہ ہوئے۔ درگا پوجا کی تعطیل میں یہ علی گڑھ سے لکھنؤ آئے جہاں حسین آباد میں ان کے آبائی گانو کے ایک صاحب کا چھوٹا سا پرائیوٹ کارخانہ تھا۔ ان کے پاس سرمائے کی کمی تھی۔ ان کی خواہش ہوئی تو یہ اس کے حصے دار بن

گئے۔ کاروبار میں دلچسپی بڑھی تو تعلیمی سلسلہ ترک کر کے اسی میں مصروف ہو گئے۔ بعد میں لکھنؤ کے ہی کاظمین محلے میں اپنا علاحدہ کارخانہ قائم کیا۔ جون ۱۹۸۱ء میں اپنے سابق حصے دار کے ہاتھوں کارخانہ فروخت کر دیا اور گھر چلے آئے۔ چند مہینے کے بعد کھاڑی ملکوں میں نوکری کے خیال سے بمبئی گئے۔ بمبئی جانے کے دوسرے روز ہی کویت کی ایک تیل کمپنی کے لیے ان کا انٹرویو ہوا اور یہ منتخب کر لیے گئے۔ ابھی پرواز میں دس بارہ روز باقی تھے کہ اچانک یرقان میں مبتلا ہوئے اور بمبئی کے سائن اسپتال میں بھرتی کیے گئے۔ وہاں افاقہ ہونے کے بجائے حالت دن بدن بگڑتی گئی۔ گوپال گنج کے ایک صاحب جن کا نام محی الدین تھا، انھیں ان کے گھر پہنچا گئے۔ مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں چھ مہینے لگ گئے۔ بیماری کے عرصے میں ہی پلٹو حاطہ کے ایک پرائیوٹ ہائی اسکول میں اردو کے معلم بنائے گئے۔ وہاں سے علاحدگی کے بعد رام نگر چمپارن سے سکھوے کی لکڑی جامو بازار میں سپلائی کرنے لگے۔ یہ کام چند مہینے کیا پھر سیوان میں بونیا موڑ پر اسکوٹر کی ایجنسی لی۔ یہ ایجنسی تقریباً دو برس رہی۔ اس کے بعد دکان کو اسپیئر پارٹس میں تبدیل کر دیا اور دم تحریر ''رحمٰن آٹو ٹریڈرس'' کے نام سے یہ سیوان کی مشہور دکانوں میں سے ایک ہے۔

شادی ۲۵ رنومبر ۱۹۸۰ء کو موضع لال سریا بتیا ضلع مغربی چمپارن میں نکہت آرا بنت نور بصر سے ہوئی۔ عقد مولوی علی اکبر نے پڑھایا جو موضع پپرا ضلع گوپال گنج کے رہنے والے تھے۔

فہیم کو بچپن سے ہی شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ اشعار یاد کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۷۱ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدا میں جو غزلیں کہیں وہ دو ڈائریوں میں محفوظ تھیں جو ضائع ہو گئیں۔ ۱۹۷۵ء میں پہلی نظم بی۔ ایس۔ ایف کے میگزین ''پرہری'' (ہندی) میں چھپی۔ بی۔ ایس۔ ایف کی نوکری کے دوران میں سات آٹھ مہینے تو کھیل کی نذر ہو جاتے تھے اس مدت میں اشعار برائے نام کہتے تھے۔ چھٹیوں میں بھی یہی حال ہوتا۔ دو ڈھائی مہینے ڈیوٹی انجام دینی ہوتی تو پہاڑی کے اوپر تعیناتی کرا لیتے اور خیالوں میں کھو جاتے تھے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ اور ناصرؔ کاظمی سے متاثر ہوئے۔ ابتدا میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ۱۹۹۵ء میں کوثرؔ سیوانی سے مشورۂ سخن شروع کیا۔ ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

فہیم صاحب دراز قد (چھ فٹ دو انچ) اور جامہ زیب انسان ہیں۔ رنگ گندمی اور زبان شیریں ہے۔ خوراک اتنی کم ہے کہ اگر کوئی خوش خوراک ان کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ جائے تو بیچارے کو بھوکا اٹھنا پڑے۔ بڑے صاف گو ہیں یہاں تک کہ تجارت میں بھی سچ کی پاسداری کرتے ہیں۔ تصنع سے پرہیز اور خوشامد پسندی سے نفرت ہے۔ مزاج میں ضبط کا مادّہ کم ہے۔ ناگواری کی صورت میں جامے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مذہبی خیالات کے ہیں لیکن کلین شیو رہتے ہیں۔ پردے کے بڑے قائل، روزے پابندی سے رکھتے اور پائی پائی کا حساب کر کے زکات نکالتے ہیں۔ ارادے کے باوجود نماز کی پابندی نہیں ہو پاتی۔ تبلیغی جماعت کے اجتماعات میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ شرک و بدعت

سے متنفر رہتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں اپنے والد کے نام پر جوگاپور میں مدرسہ قائم کیا جس کے سکریٹری بھی ہیں۔ تاش کے بڑے شوقین۔ سننے میں آیا ہے کہ کبھی بازیاں بھی لگ جاتی ہیں۔ فرصت کے اوقات میں کبھی پڑھتے تو کبھی ٹیلی ویژن سے دل بہلاتے ہیں۔ پسندیدہ شہر لکھنؤ، پسندیدہ رنگ سفید اور پسندیدہ غذا دودھ دہی ہے۔ دوستوں کا بڑا لحاظ اور خیال رکھتے ہیں۔

پندرہ بیس برس قبل ایک مقامی مشاعرے میں سیاہ شیروانی میں ملبوس اناؤنسری کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کتابوں کے بھی بڑے شوقین ہیں۔ سیوان شہر میں ان کے علاوہ کسی اور شاعر کو آرڈر دے کر کتابیں منگواتے میں نے نہیں دیکھا۔ کلاسیکی اور جدید شعرا کے مجموعے منگاتے رہتے ہیں۔ نہ صرف منگاتے بلکہ پڑھتے بھی ہیں۔ اشعار یاد رکھنے کے معاملے میں حافظہ بڑا کمزور ہے۔

سیوان شہر کے آزاد نگر (شیخ محلہ) میں اپنا ذاتی مکان ہے۔ لان میں جھولا بھی ہے اور مختلف پھولوں خصوصاً گلاب کے پودے بھی۔ ڈرائنگ روم بڑا سجا سجایا جس سے ان کے جمالیاتی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ازدواجی زندگی بھی بڑی خوشگوار ہے۔ اہلیہ شہر میں خواتین کی تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتی ہیں۔ بچے چار ہیں: (۱) شہلا رحمان صدیقی (۲) زیبا رحمان صدیقی (۳) ضیاء الرحمان صدیقی اور (۴) فیض الرحمان صدیقی۔ سب کے سب بڑے مہذب اور خوش اطوار۔ فہیم انجمن ترقی اردو سیوان کے صدر ہیں لیکن خود ان کے بچے اردو سے زیادہ دلچسپی نہیں لیتے اور نہ ان کی دکان کے بورڈ پر اردو موجود ہے۔

ان کے گھر پر تقریباً ہر مہینے شعری نشست ہوتی ہے جس کے لیے بیشتر طرح دی جاتی ہے۔ ۱۹۹۰ء سے اس سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ شعری نشست میں شہر کے شعرا حضرات ہی شریک ہوتے ہیں مضافاتِ شہر کے نہیں۔ جوہر سیوانی کے زمانے میں یہی نشستیں زیادہ باقاعدہ اور بڑے پیمانے پر ہوتی تھیں۔

فہیم صاحب کی زندگی بہت مصروف ہے۔ لکھنے پڑھنے اور شعر و سخن کا وقت بھی انھیں کم ملتا ہے۔ دن بھر کا وقت بزنس میں صرف ہو جاتا ہے۔ دکان پر گاہک بھی خیال کی رفتار سے آتے ہیں۔ ان میں ایک پیاری ادا یہ ہے کہ سب کی بات بہت توجہ سے سنتے ہیں۔ لوگوں سے بڑی خاکساری سے ملا کرتے ہیں۔ احباب کی ضیافتِ طبع سے کبھی غافل نہیں رہتے۔ جنھیں ناپسند کرتے ہیں وہ بھی ملنے آ جائیں تو جبیں پر ناگواری کی شکن نہیں ابھرتی۔ زمانے کے سرد و گرم سے بخوبی واقف ہیں اس لیے مصلحت پسندی سے بھی کام لیا کرتے ہیں۔ دل کے تقاضوں سے بھی بے خبر نہیں۔ آغازِ جوانی میں ایک عشق کا اقرار کیا۔ تفصیل پوچھی تو ہنس کر ٹال گئے۔ علمی معاملات میں دوسروں کے جلد قائل نہیں ہوتے۔ نرگسیت کے شکار تو نہیں لیکن قدرے انانیت پسند ہیں۔ ان کی انانیت کو سمجھنا بھی ذرا مشکل ہے۔ ان میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ آواز میں بڑا کرارا پن ہے۔ شعر جوش

ملیح آبادی کے لب و لہجے میں سناتے ہیں۔ مشاعرے میں اگر کسی نے ہوٹ کرنے کی کوشش کی تو اسے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیتے ہیں۔ غزل سنانے میں سامعین کی پروا بھی نہیں کرتے۔ انداز یہ ہوتا ہے کہ سننا ہے تو سنو ورنہ بھاڑ میں جاؤ۔ راقم الحروف کی موجودگی میں گوپال گنج کے ایک کل ہند مشاعرے (۲۰۰۰ء) میں اناؤنسر نے انھیں "مردانہ شاعر" کہہ کر سامعین سے متعارف کرایا تھا۔ یہ عملی انسان ہیں۔ ایک وسیع حلقے میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ صاحبان اقتدار تک بھی پہنچ ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے۔

شعری شہرت کے معاملے میں فہیم جوگاپوری اتاولے پن کا شکار نہیں۔ وہ صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے فنی رموز و نکات پر توجہ صرف کرتے ہیں۔ انھیں جذبات و احساسات کو فن کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر آتا ہے۔ وہ معلوم سے نامعلوم منزلوں کا سفر طے کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں وہ معنوی تہہ داری تو نہیں جو فن کو دو آتشہ بناتی ہے لیکن سادہ بیانی میں بھی انھوں نے جا بجا اپنے فنی امکانات کے خوبصورت اور کامیاب نمونے پیش کیے ہیں۔

فہیم کی غزلوں میں جہاں روایت کی پاسداری جھلکتی ہے وہیں ان کی ذہانت و ذکاوت بھی جھانکتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں عصری حسیت کروٹیں لیتی نظر آتی ہے۔ ان میں معنوی ابعاد کے ساتھ فکری جہتوں کی جھلک بھی ہے اور تجربے کی روشنی بھی۔ آج کی زندگی نام نہاد آزادیوں کے باوجود جس جبر مسلسل کا شکار ہے، مایوسیوں اور محرومیوں کے سائے جس تیزی سے دراز ہوتے جا رہے ہیں، ارباب اختیار و اقتدار کی مہربانیوں سے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنے کا چلن جس طرح زور پکڑ رہا ہے، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت نے جو اخلاقی بحران کھڑا کر دیا ہے، فہیم نے ان تمام سلگتے مسائل سے آنکھیں چار کی ہیں اور فن کے اس خارزار سے سلامتی کے ساتھ گزرے ہیں۔

فہیم ان شاعروں میں ہیں جو حالات کے سامنے سپر انداز نہیں ہوتے بلکہ باطل قوتوں سے پنجہ آزمائی کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اگر اہل باطل کو اپنے خنجر پر ناز ہے تو انھیں اپنے سر پر غرور ہے۔ وہ اپنے حرف سے نوک سناں کو اور لفظ سے تلوار کی کاٹ کو شرمسار کرتے ہیں۔ وہ طوق و سلاسل کا بھرم توڑنے کے لیے جہاں مظلوموں کو اپنی طاقت آزمانے کی دعوت دیتے ہیں وہیں یہ بھی کہتے ہیں ؎

جاگے حیات جس سے وہی انقلاب ہے
اے محشر خیال یہ محشر اٹھا کے دیکھ

وہ جہاں قتل کے جشن میں خود کو نیزے پہ اچھالنے کی باتیں کرتے ہیں وہیں جوشِ انا پر آنچ آنے کی صورت میں بے خودی کے جال پھینکنے سے بھی احتراز نہیں کرتے۔ ان کے اندر آگ سے حنائے زندگی لینے کا سلیقہ بھی ہے اور چراغ

شام بجھنے کی صورت میں دل کو جلانے کا ہنر بھی۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ نادار کے آنسو حویلیوں کی بنیادیں ہلا دیتے ہیں تو فن کار کے اشکوں کو حشر بپا کرتے دیر نہیں لگتی۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ نعیم کا ذہن ترقی پسندانہ بھی ہے اور قدرے باغیانہ بھی۔ ان کے تیور کہیں تیکھے ہو جاتے ہیں لیکن یہ تیکھا پن ایک حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ ان کے یہاں رکھ رکھاؤ کی کیفیت بھی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ یہ نہ کہتے ۔

میں بھی ہوں عاشق ترا اے گردشِ لیل و نہار

آ کے اس اجڑے نگر میں بن سنور میرے لیے

نعیم کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ رجائیت پسند ہیں۔ غالب کو تو اپنی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر نظر آتی تھی لیکن نعیم اس کے برعکس بگاڑ میں بناؤ کا سامان دیکھ لیتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ شبِ تاریک کے بطن سے ہی صبح کی کرن پھوٹے گی۔ وہ ہر اچھے فنکار کی طرح اعلا انسانی قدروں پر بھی یقین رکھتے ہیں۔

آدمیت احترامِ آدمی　　　　باخبر شو از مقامِ آدمی

کے وہ بھی قائل ہیں۔ لہٰذا آدمی ہونے پر انھیں فخر نہیں بلکہ غرور ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ وہ کائنات کو کھلی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے دامن میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی اور ان دونوں کے امتزاج سے اپنے فن کا گلستاں تعمیر کرتے ہیں۔

میں نے نعیم کے یہاں روایت کی پاسداری کی بات کہی ہے۔ یہ خیال رہے کہ روایت سے استفادے کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ یہاں اجمالاً کہنا چاہوں گا کہ ابھی ان کے یہاں اس استفادے کا عمل ادھورا ہے۔ اپنا راہبر نہیں پہچاننے کی وجہ سے وہ ہر راہ رو کے ساتھ چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس صورت حال سے انھیں چھٹکارا پانا ہوگا۔ وہ دماغ پر بھروسہ کچھ کم کریں اور دل کی آواز پر توجہ دیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ ترقی کا سفر زیادہ تیزی سے طے کریں گے۔ ان کا فن ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہے۔ ابھی انھیں رد و قبول کی بہت سی منزلیں طے کرنا باقی ہیں۔

انتخابِ کلام

اے محشر خیال یہ محشر اٹھا کے دیکھ　　　　جاگے حیات جس سے وہی انقلاب ہے
میں سر اٹھا رہا ہوں تو خنجر اٹھا کے دیکھ　　　　خنجر پہ تجھ کو ناز تو سر پر مجھے غرور

سنی ہے ہم نے وہیں کائنات کی دھڑکن　　　　دل و نظر کی جہاں سانس رکنے لگی ہے
وہ اک ادائے تغافل حیات کا مدفن　　　　وہ اک ادائے تبسم حیات کی جنبش

ڈوبے رہے ہیں اشک میں تا عمر اے خدا
ہم نے کوئی نماز پڑھی ہے نہ بے وضو

اپنی حالت کا اب احساس ہوا ہے ایسے
جیسے چیچر کوئی برسات میں چھانے نکلے
شعر کہتے ہیں جسے بات وہیں ختم ہوئی
ہم تو بس میر کی اک رسم نبھانے نکلے

وہ جب رکے تو زمانے کی چال بڑھ جائے
وہ جب چلے تو زمانہ رکا رکا سا لگے

جب دیکھتے نہ تھے تو نظارہ تھا چار سو
اب دیکھنے لگے تو نظارہ نہیں رہا

قطروں نے مل کے بحر کو خاموش کر دیا
ہیں حرف چپ تو لفظ کوئی بولتا نہیں

اندھیرے ہر طرف بڑھنے لگے تھے
تماشا دیکھتے کب تک اجالے

وہ حرف ہوں کہ نوکِ سناں بھی ہو شرمسار
وہ لفظ ہوں کہ کاٹ میں تلوار سا لگے

ہر عمل کا تو صلہ ہے اسی دنیا میں نسیمؔ
آدمی کو مگر احساس کہاں ہوتا ہے

رہی ہے کچھ دنوں تجھ سے بھی یاری
ٹھہر جا زندگی تو بھی ٹھہر جا
ملے گی عشق کی منزل ملے گی
گزر جا عقل کی حد سے گزر جا

یہ عمر کی ہنسی ہے نہ سمجھو اسے مذاق
غنچے جو ہنس پڑیں تو دعائیں دیا کرو

یہ غم نہیں کہ اندھیرا ہوا مگر دکھ ہے
کہ آفتاب نے صبحِ چمن کو لوٹ لیا

اٹھو کہ طوق و سلاسل کا ٹوٹ جائے بھرم
چلو کہ آئی گھڑی خود کو آزمانے کی

ادھار مانگ کے یوں لائی زندگی خوشیاں
کہ جیسے شاہدِ بازار مانگ بھر آئی
رہے اداس تو ہم مدتوں اداس رہے
ہنسی جو آئی تو پھر بات بات پر آئی

زندگی بحرِ مصائب میں بھی آرام سے ہے
کون کہتا ہے کہ طوفاں سے نکالو مجھ کو
یوں نہ آئے گا مرے خون کا بھرپور مزہ
قتل کا جشن ہے نیزوں پہ اچھالو مجھ کو

غم نہ کر غم جو ترے ساتھ رہا کرتا ہے
ناگ لپٹے گا تو صندل کی حفاظت ہوگی

اب اپنے زخم پہ اپنا ہی نیشتر رکھ دے
مسیحِ وقت کا اے دوست انتظار نہ کر

شہرت ملے سخن کو تو یہ مان لو نسیمؔ
یہ دین ہے خدا کی تمھارا ہنر کہاں

طوفانِ بحر سے کوئی شکوہ نہیں نسیمؔ
ہم کو تو اپنی ناؤ کے اندر بھنور ملے

جس پہ محفلوں کے سر جھکیں آ کر
جو کامل پیر ہوتا ہے وہاں میلا نہیں لگتا

تم نے کیسے غلط کو غلط کہہ دیا
وہی حقیر انھیں بے ہنر بناتا ہے

باغباں کون تھا یہ راز خدا ہی جانے
شہر کے نالے سے اک پھول اٹھایا میں نے

یہ صحیفہ کوئی نہیں پڑھتا
صفحۂ دل نہ کھولیے بابا

آپ کی راہ میں بچھے تھے گلاب
کیسے کانٹے چبھو لیے بابا

پوچھتا ہے پوتر گنگا جل
پاپ کیا سارے دھو لیے بابا

ہم برے ہیں ہمیں برا کہیے
خود کو لیکن ٹٹولیے بابا

تقدیر میں جو ہونا ہے ہو جائے گا نسیمؔ
روکے گا کون گردشِ لیل و نہار کو

بچ گئے تو امتحاں دیتے رہیں گے ہم نسیمؔ
مر گئے تو زندگی کا حق ادا ہو جائے گا

اس کو چاہا تو اس طرح چاہا
جیسے کارِ ثواب میرے لیے

اداس آنکھوں سے آنسو کہاں نکلتے ہیں
سفر کٹھن ہو تو راہی بھی تھم کے چلتے ہیں

دل شہنشاہِ زمانہ ہے اسے کیا کہیے
کس کو معلوم ہے کب اور کہاں دل آئے

کون سا عکس تھا اپنا جسے اپنا کہتے
آئینہ کون تھا جس نے ہمیں حیراں نہ کیا

کوئی دامن ہے نہ کوئی چشمِ تر میرے لیے
اجنبی ہونے لگا میرا ہی گھر میرے لیے

منتِ اہلِ گلستاں سے تو بہتر ہے یہی
چار تنکے اک چراغِ رہ گزر میرے لیے

میں بھی ہوں عاشق ترا اے گردشِ لیل و نہار
آ کے اس اجڑے نگر میں بن سنور میرے لیے

تھی تجھی سے گھر کی زینت اور جب تو ہی نہیں
ہو بھلا کیا حاجتِ دیوار و در میرے لیے

رات کالی ہے مگر اس پار ہی تو ہے نسیمؔ — منتظر اس پار ہے نور سحر میرے لیے

مری نگاہ مجھے دار پر چڑھا دے گی — کہ جو بھی جیسا ہے ویسا دکھائی دیتا ہے
وہ نیند ہے کہ جہاں رتجگا بھی شرمائے — وہ خواب ہے کہ تماشا دکھائی دیتا ہے

ممکن نہیں طوفاں سے بچا لینا حویلی — بنیاد ہلا دیتے ہیں نادار کے آنسو

کیوں تاج محل چھو کے گزر جاتی ہے جمنا — دریا تو نہیں ہو گئے معمار کے آنسو
یہ راز نسیمؔ آپ کو معلوم تو ہوگا — کیا حشر اٹھا دیتے ہیں فنکار کے آنسو

غم ہی ثابت رہا ازل تا ابد — اور دنیا کی ہر خوشی پنچھی
جو شکاری ہو فن کا غور کرے — اڑ گیا یا کہ اڑ گئی پنچھی
میں رنگ و نور ہوں جس طور جو بنا ہے مجھے — نہ دوستی ہوں کسی کی نہ دشمنی ہوں میں
کوئی فرشتہ کوئی دیوتا تو پیر کوئی — مگر غرور مجھے ہے کہ آدمی ہوں میں
اسے جو روکنا چاہوں تو میں نہ روک سکوں — کسی غریب کے آنسو کی بے بسی ہوں میں

وہ میری ضد تھی جو مجھے منزل پہ لے گئی — ورنہ مجھے گرانے کی سازش بہت ہوئی
شوکیس سے نظر جو گئی جیب کی طرف — دل کو امیر ہونے کی خواہش بہت ہوئی

نامرادی کی نشانی تو کوئی پاس رہے — کچھ نہ دے سنگِ ملامت کا ہی تحفہ دے دے

مغرور ہیں جو [illegible] کے چراغوں کو بجھا کر — وہ چاند ستاروں کو بجھا کیوں نہیں دیتے
عقدہ ہی نہیں کھلتا وجود اور عدم کا — مجھ کو مرے ہونے کا پتا کیوں نہیں دیتے

جھوٹ کے شہر میں سچ بول کے ہنستا ہوں نسیمؔ — میں ہوں مجرم مجھے سولی پہ چڑھاؤ یارو

دورِ حاضر میں وہ انسان جو ہنستا ہوگا — سوچیے کتنا بڑا اس کا کلیجا ہوگا

تشنہ تشنہ ہی رہا اس لوٹ کے بازار میں — اور جو سیراب تھا دریا اٹھا کر لے گیا
لے گیا چن چن کے سنگِ شہر اک جوہر شناس — لوگ ہنستے تھے کہ پاگل کیا اٹھا کر لے گیا
مغربی فیشن نہ تھا پاگل بگولہ تھا کوئی — گاؤں میں آیا تو گھر کا گھر اڑا کر لے گیا

عاشقی کے کھیل کا انجام ہے اتنا فہیمؔ
دے گیا جو خواب وہ نیندیں اڑا کر لے گیا

دیا ہے درس یہی اک چراغ نے مجھ کو
جو اہلِ غم ہیں ہنسی کا لبادہ رکھتے ہیں

انھیں کے نام ہے منسوب جشنِ تشنہ لبی
شراب لب پہ نظر میں جو بادہ رکھتے ہیں

فقط انھیں ہی نہیں نقدِ جسم و جاں کا دماغ
یہ جاں لٹانے کا ہم بھی ارادہ رکھتے ہیں

نہ جانے زندگی کس موڑ پر لے آئی ہے مجھ کو
سفر میں ہوں مگر زیرِ قدم رستا نہیں لگتا

وہ جب رکے تو زمانے کی چال بڑھ جائے
وہ جب چلے تو زمانہ رکا رکا سا لگے

جب دیکھتے نہ تھے تو نظارا تھا چار سو
اب دیکھنے لگے تو نظارا نہیں رہا

میں ہوں پتھر رہِ وفا کا فہیمؔ
جس کو ٹھوکر لگے ہٹا دے مجھے

کیا کہوں اپنی میں سیہ بختی
روشنی میں بھٹک رہا ہوں میں

یہ سچ ہے کہ ہم سا کوئی سیاح نہ گزرا
حالاں کہ بھٹکتے رہے ہم اپنے ہی گھر میں

دہلیزِ سیاست پہ جھکانے کے لیے سر
اے زیست ترے خواب نے مجبور کیا ہے

جوشِ انا پہ آنچ جو آنے لگی فہیمؔ
ہم نے اٹھا کے پھینک دیے بے خودی کے جال

تری نظر کے بدلنے کا یہ اثر تو نہیں
مجھے زمانہ ہی بدلا دکھائی دیتا ہے

فہیمؔ دل کے جلانے کا وقت آ پہنچا
چراغِ شام تو بجھتا دکھائی دیتا ہے

یاد اس کی آئی یوں خوشبو لیے
جیسے گھر میں آ گیا صندل بہت

آج ہی بچھڑے تھے کیا اس سے فہیمؔ
آج آنکھیں کیوں ہوئی جل تھل بہت

اگر تمھارے ستم کی یہ ابتدا بھی نہیں
ہمارے ضبطِ مسلسل کی انتہا بھی نہیں

ہمارا جذبۂ سجدہ سلامت
جہاں میں اور بت خانے بہت ہیں

دل کی وادی میں اترو تو معلوم ہو
کتنے زندہ ولی ہیں مزاروں میں بھی

ضبط کا بند ٹوٹا تو یہ حال تھا — بہہ رہی تھی ندی ریگ زاروں میں بھی

تو تو ابراہیم کی اولاد ہے — آگ سے لے لے حنائے زندگی

روٹی ملے گی تجھ کو نہ دیوان سے نسیم — فکرِ سخن کو چھوڑ دے فکرِ معاش کر

[نسیم جوگاپوری کے حالاتِ زندگی ان سے دو ذاتی ملاقاتوں (۲۵ر جنوری اور ۱۰ر فروری ۲۰۰۱ء) میں قلم بند کیے گئے۔ انتخابِ کلام ان کے شعری مجموعے (نویدِ سحر) اور ان کی ایک بیاض سے کیا گیا ہے۔ (ظ-ک)]

Ranipur, Barharia, Siwan (BIHAR)

دیوانِ موہن لال انیسؔ کا مخطوطہ

رام پور رضا لائبریری میں موہن لال انیسؔ لکھنوی شاگرد فاخر مکیں کے فارسی دیوان کا مخطوطہ ۳۷۸۷ نمبر کے تحت موجود ہے۔ اس نے 'انیس الاحبا' کے نام سے ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۳ء میں دو ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل اپنے استاد فاخر مکیں اور اُن کے شاگردوں کا تذکرہ لکھا تھا۔ اس کے خطی نسخے کتابخانۂ مجلس تہران، کتابخانۂ خدا بخش پٹنہ، برلن، بوہار، علی گڑھ، برٹش میوزیم لندن اور دانش گاہ بنارس میں ملتے ہیں۔ نسخۂ اول اودھ کے شاہی کتابخانے میں تھا (اشپر نگر)۔ پروفیسر انوار احمد (سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی) کی تدوین و تصحیح کے بعد یہ تذکرہ کتابخانۂ خدا بخش سے شائع ہو چکا ہے۔ قیامِ رام پور کے زمانے میں 'دیوان انیس' دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس پر کاتب کا نام اور سنہ کتابت موجود نہیں ہے۔ دیوان مرتب صورت میں ہے اور ردیف وار غزلیں ہیں۔ صفحہ ۲۵۱ پر ردیف یے کی غزل کے آخری دو مصرعوں پر خط کھینچ کر حاشیے میں اصلاح کی گئی ہے۔ اسی طرح ص ۲۵۹ و ۲۶۳ پر بھی اسی قسم کی اصلاح کی گئی ہے۔ ص ۲۶۹ پر ایک مثنوی کے چار شعر کاٹ دیے گئے ہیں۔ دیوان کے آخر میں چند قطعات تاریخی ہیں جن میں کچھ بناہائے تاریخی، مساجد، روضے، جواہر سنگھ کی شادی کی تاریخ، نواب مدار الدولہ کی وفات کی تاریخ، دانش علی کی مسجد کی تاریخ، کفایت اللہ کی وفات کی تاریخ اور فضل علی خاں کی مسجد کی تاریخیں بھی ہیں۔ دیوان کی پہلی غزل کا مطلع یہ ہے:

خداوندا چنا کن بی خبر در عشقِ خود ما را — کہ نشناسد دلِ ما تا ب ہرگز دین و دنیا را

خطبۂ صدارت

آل انڈیا مشاعرہ (گیا، ۱۹۲۲ء)

۲۴؍ دسمبر ۱۹۲۲ء کو گیا (بہار) میں منعقدہ آل انڈیا مشاعرہ کی صدارت حضرت سیماب اکبر آبادی نے کی تھی۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا۔ مصرعہ طرح تھا۔
"سر بکف پھرتے ہیں ہم لیکن کوئی قاتل نہیں"۔ حضرت سیماب اکبر آبادی نے اس مشاعرے میں جو خطبہ دیا تھا وہ رسالہ تاج (مدیر جگیشر پرشاد خلش گیاوی) میں جلد ۵، نمبر ۲و۳ بابت ماہ فروری و مارچ ۱۹۲۳ء صفحہ ۶۷ تا ۷۲ شائع ہوا تھا۔ یہ نایاب خطبہ قند مکرر کے طور پر اوراک کے صفحات پر شائع کیا جارہا ہے۔ حضرت سیماب اکبر آبادی نے شاعری اور شعرا کی بابت جو باتیں ۱۹۲۲ء میں کہی تھیں ان کی افادیت آج بھی باقی ہے، جیسی اس زمانے میں تھی۔ کرم خوردگی کے سبب جا بجا کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہیں ایسی جگہوں پر نقطے لگا دیے گئے ہیں۔ تاج کا یہ شمارہ پروفیسر نادم بلخی صاحب کی ملکیت ہے۔ خطبہ کے پہلے حضرت سیماب کی جوانی کی ایک تصویر بھی شائع کی گئی تھی۔ [مدیر]

جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہوگا "آل انڈیا قومی مشاعرہ" کی صدارت کا اعزاز سب سے پہلے جناب چکبست لکھنوی کو دیا گیا تھا۔ سوء اتفاق سے ان کی والدۂ ماجدہ کی طبیعت ناساز ہوگئی اور ان کی عدم شرکت کی اطلاع کے بعد اراکین مجلس انتظامیہ نے بارِ صدارت میرے کاندھوں پر رکھ دیا۔ جسے 'قلت وقت و وقت کار' کے خیال سے مجھے مجبوراً اٹھانا پڑا۔

...میں، میں جانشین قیس ہوں   گرمی محفل تو ہوں گو رونق محفل نہیں

احمد آباد...... کے بعد آل انڈیا قومی مشاعرہ کی یہ دوسری نشست ہے اور اہل گیا قابل صد گونہ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے بہترین انتظامات اور بیش از بیش اخراجات برداشت کر کے قوم کی شاعرانہ زندگی کی یادگار امسال بھی کشادہ روئی اور وسیع النظری کے ساتھ قائم کی۔

جناب چکبست اپنے خطبۂ صدارت میں خدا جانے کیا گلفشانیاں فرماتے؟! افسوس ہے کہ اُن کے ارشادات سے ہماری سماعت محروم رہی۔ میں اس مختصر زمانہ اطلاع میں اگر ایک مبسوط خطبۂ صدارت تیار نہ کر سکا تو قابل معافی ہوں تاہم بطور امتثال امر و رسم صدارت جو کچھ میرے امکان میں ہے، عرض کرتا ہوں ۔

حالِ دل (سن) لیجیے میری زبانِ عشق میں   کچھ تو ہوں کہنے کے قابل گو کسی قابل نہیں

یہ ظاہر ہے کہ مرورِ ایام نے ایشیائی شاعری کو انحطاط کے پست ترین قعرِ مذلت میں ڈھکیل دیا ہے تاہم رنگِ زمانہ صاف کہہ رہا ہے کہ شاعر ضروریاتِ زندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ حسیاتِ حاضرہ کی صحیح ترجمانی اور واقعاتِ ہائلہ پر حقیقی تبصرہ جس خوبصورتی اور دقتِ نظر کے ساتھ ایک شاعر کر سکتا ہے کوئی اور نہیں۔

نغمہ زارِ عشق میں طوطی بھی ہے بلبل بھی ہے   کوئی میری طرح لیکن ترجمانِ دل نہیں

ایشیائی شاعری کے اجزائے ترکیبی جب تک گل و بلبل، شمع و پروانہ، سرو و قمری اور شانہ و زلف (سے) وابستہ رہے، شاعری صرف تفریحِ خاطر کا ایک ذریعۂ سرور سمجھی گئی۔ لیکن قدرت نے پانی پت کے ایک قدیم الوضع شاعر کے دماغ کو انوارِ تجدید سے متجلی کر کے دنیائے سخن کی فضائے بسیط پر رشد و ہدایت کی بجلیاں چمکائیں۔ وہ ہندوستان میں سب سے پہلا قومی شاعر تھا جس کے رشحاتِ شاعری کو خدائے سخن نے ایک نئی قوت، ایک نیا اثر اور ایک نئی ترقی بخشی اور جس کے بعد قومی شاعری کا ایک خاص معیار قائم ہو گیا۔ میرا مطلب مولانا حالی مرحوم سے ہے۔

صاف مثلِ آئینہ ہے جادۂ علم و عمل   اب کسی کو احتیاجِ رہبرِ کامل نہیں

ڈاکٹر محمد اقبال ایم-اے، مولانا اکبر الہ آبادی مرحوم، پروفیسر طور مرحوم، میر نیرنگ بی-اے، نوح ناروی، حضرت محشر لکھنوی وغیرہ کے نام اور کام سے آج دنیا کا چپہ چپہ معمور اثر ہے۔ ان حضرات نے اپنے دردمند دلوں سے غم میں ڈوبے ہوئے نشتر نکالے اور لوگوں کی...... کہہ دیے۔ اگر ان کے جوشیلے نغمے کارفرما نہ ہوتے تو آج ہندوستان کی کوئی سیوا ایمیتی اور ہم وطن کی کوئی انجمن اس قدر جوش و خروش کے ساتھ خدمتِ ملک کے لئے کبھی وقف نہ ہوتی۔

ہے کوئی بھڑکانے والا شعلہ ہائے شوق کا   رنگِ محفل باعثِ ہنگامۂ محفل نہیں

بالمیک اور تلسی داس کے نام صفحاتِ تاریخ پر قیامت تک روشن رہیں گے جن کی منتظم اور قادر الکلام طبیعتوں نے مہابھارت کے مناظر سطحِ کاغذ پر ایسے دلکش کھینچے کہ ان کے حقیقی نقوش اپنی اصلیت سے کچھ زیادہ چمک اٹھے۔ کالی داس اور سرور جہان آبادی مر گئے اور حضرت نظر لکھنوی زندہ ہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کی قومیات نے ادب العالیہ کی توسیع میں کچھ کم حصہ لیا ہے۔

شاعری جس طرح جذباتِ قومی کے نشر و اعلان کے لئے ایک ذریعۂ مخصوص ہے اسی طرح مذہبت کے اثرات کو مقبولِ سماعت اور دل نشیں کرنے کا بھی ایک خاص وسیلہ ہے۔ نصیحتیں جو نثر میں کی جاتی ہیں وہ اصلاحی نظموں سے زیادہ اثر آفریں نہیں ہوتیں۔ نثری عبارتیں خواہ کیسی ہی خوش ترکیب کیوں نہ ہوں زبانوں سے نکل کر دلوں میں محفوظ نہیں رہتیں مگر ایک داد میں ڈوبا ہوا شعر مدتوں آغوشِ سماعت میں جھولا کرتا ہے اور اس کی موجیں فضائے شوق سے باہر نہیں نکلتیں۔

لاتری باتوں سے بھرلوں دامن زخم خیال　　　ان سے بہتر اور کوئی چارہ سازِ دل نہیں

پچھلے دنوں جب خدام وطن کی جماعتیں، سودائے حریت بہ سر اور رایتِ ملت بہ دست بہ غرض مظاہرہ نکلتی تھیں جن کے پیچھے پیچھے شیدایانِ وطن کا ایک محشر ہوتا تھا تو ان کی زبانیں کسی نہ کسی شاعر ہی کی ماتم خیز نظم سے آشنا ہوتی تھیں اور ان کے ہلالی رایت کے بلند پھریرے پر بخط جلی لکھا ہوا تھا کہ "ہندوستان کے ہم ہیں اور ہندوستان ہمارا"۔

قوم کے ناہموار اور غیر منتعلیق مذاق میں یہ شعریت پیدا کرنا اگر شاعروں کی دماغی..... تھا تو اور کیا تھا؟ رزم گاہ انگورہ کی خون بہ دامن وادیوں سے..... کے مناظر خاموش میں جس نے جزرومد کا ایک طوفان عظیم پیدا کر دیا وہ کون تھا؟ شاعر اور صرف شاعر!

یہ نصرتی کا فیضِ سخن تھا جس کی حوصلہ افزا رجز نے غازیانِ اسلام کے تیور بدلوائے۔ ان کے ٹھہرے ہوئے جوش اور سکون طلب جذبات کو حرکت میں لاکر ابھار دیا اور ان کے دلوں کو شوقِ شہادت و جذبۂ فدایت سے لبریز کر دیا۔ جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ آج انگورہ گو دارالخلافہ نہیں ہے تاہم دارالخلافہ کی مقدس شامیں اپنے آغوش میں لیے ہوئے عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں عقیدت گاہ بنا ہوا ہے۔

دامن صحرا کی کرتے ہیں پرستش اہل نجد　　　اب کسی کو احتیاج پردۂ محمل نہیں

موجودہ قوانین جنگ کے ماتحت ہر فوج اور ہر لشکر کا مقدمۃ الجیش ایک فوجی نغمہ ہوتا ہے جس کی لبریز جوش صدائے دلکش ایک نظم منضبط کا عکس ناطق ہوتی ہے۔ اس میں الفاظ نہیں ہوتے مگر صرف ایک لطیف موسیقی بغیر اس نغمہ کے کوئی فوج میدان جنگ میں معرکہ آرا نہیں ہو سکتی۔

جب نظموں کے عکس ناطق میں یہ اثر ہے تو پھر اصلی نظموں کے تاثر کا کیا ٹھکانہ ہے اور جب نظموں کا درجہ اس قدر بلند ہے تو پھر ناظموں کے مدارج کا کیا پوچھنا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجے کہ اگر آج ساری دنیا کا ایک لشکر عظیم تیار کیا جائے تو وہ شعرا بطور مقدمۃ الجیش اس کے آگے آگے ہوں گے اور اس کی فتحیابی اور کامرانی، چستی و روانی صرف شعرا کی اثر آفرینی اور معجز طرازی پر موقوف ہوگی۔

ہم نفس تیرے فسانے خضر راہِ شوق ہوں　　　پھر مجھے اندیشۂ تنہائی منزل نہیں

شاعری کی قسمت ہمیشہ ملک کی قسمت کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ جب ہندوستان کو عروج حاصل تھا تو شاعری کی عروج بھی نقطۂ کمال کی آخری حد..... اب ہندوستان زوال کے خطوط انتہائی پر آپہنچا ہے تو شاعری بھی اس کی نسبت سے انحطاط پذیر ہے۔ لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ جس وقت ہندوستان کا ستارہ چمکے گا اس وقت شاعری کا آفتاب بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ نورباری کرتا نظر آئے گا اور جہاں تک قرائن کی گنجائش ہے ہندوستان کی ترقی

اور عروج و کمال کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ ہی شاعری ہو گی جو اپنے طلسمی اثر سے درد مندان ملک و قوم کو ایک دن ضرور کامیاب مقاصد بنا دے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۔

ہو گیا اپنی حیات نو پہ مجھ کو اعتقاد   تم سلامت ہو تو جی اٹھنا مرا مشکل نہیں

یاد رکھئے! ایک شاعر اگر اُسے اپنے فرض کا احساس ہے اور وہ زمانہ کا نبض شناس ہے، ہزاروں جری اور نبرد آزما جوانوں سے بہتر ہے۔

جب شاعری اتنی ضروری چیز ہے اور شاعر کا دنیائے اسباب میں اتنا بلند مرتبہ ہے تو ہمیں شاعری کی تہذیب و ترقی کا ہر حالت میں خیال رکھنا لازم ہے۔ جہاں قوم و ملک پر شاعری کا تحفظ واجب و لازم ہے وہاں ایک حقیقی شاعر کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے خیالات میں بلندی، تخیل میں پاکیزگی، طبیعت میں لطافت، دماغ میں جودت اور دل میں درد پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اپنے کلام کو اس قابل بنائے کہ وہ قوم و ملک کی رہنمائی کے کام آئے اور اپنی شاعری کا معیار اس قدر بلند کرائے کہ اُس پر عمومیت و ابتذال کا الزام عائد نہ ہو سکے ۔

ان سے سب کچھ مانگ لیں ایسا تو ہو حسن طلب   اور وہ دل میں یہی سمجھیں کہ یہ سائل نہیں

اب میں صرف اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اپنے جذبات کے اظہار میں ہمیشہ متانت و سنجیدگی اور تہذیب سے کام لینا چاہئے تاکہ سننے والوں کی سماعت پر ہمارا کلام بار نہ ہو۔ مضحک۔۔۔۔۔۔ متانت سے گزرے ہوئے جذبات کا نظم کرنا نہ صرف لٹریچر کو گندہ کرنے کا ذریعہ ہے بلکہ ضرورت زمانہ بھی اس کی متقاضی نہیں ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنی صاف ستھری زبان اور پاکیزہ جذبات کو غیر مہذب الفاظ سے پراگندہ کر لیں ۔

ہو نہ جس کے نطق میں دل کی صفائی آشکار   ہے وہ کہنے کو زباں، لیکن زبان دل نہیں

شاعری کی ضرورت، شاعری کی عظمت اور شعرا کی لطافت کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا۔ اب میں اراکین مجلس انتظامیہ کا خصوصاً اور آپ تمام حضرات کا عموماً شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں کہ آپ اس آل انڈیا مشاعرے کی شرکت سے اس کی شان کے مطابق آخر وقت تک بے حد محظوظ ہوں گے اور نہایت سکون و سکوت کے ساتھ گیا کے اس یادگار جلسۂ لطیف کو کامیاب بنانے کی کوشش فرمائیں گے ۔

آنے والے کچھ نہ کچھ کانوں میں لے کر جائیں گے
بزمِ اہل درد، اہل جور کی محفل نہیں

(ابوالنجز سیماب صدیقی الوارثی اکبر آبادی عفی عنہ)

■■■

سید حسن عباس

چین میں اردو

(بیجنگ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد لیوشوشیونگ سے ملاقات اور بات چیت)

اگست ۱۹۹۱ء کے اوائل کی بات ہے جب میں تہران میں مقیم تھا۔ دوست عزیز جناب عارف نوشاہی نے مجھے فون پر بتایا کہ چین سے ایک وفد تہران آیا ہے جس کی قیادت بیجنگ یونیورسٹی کے مشرقی زبانوں کے شعبۂ اردو کے استاد جناب لیو اور فارسی کی استاد محترمہ وان کر رہی ہیں۔ اس وفد میں وہاں کے شعبۂ فارسی کے دس بارہ طالب علم شریک تھے۔ جب ہم جناب لیو سے ملاقات کے لئے ان کی رہائش گاہ پر گئے اور ہم سے جب انہوں نے اردو میں بات چیت شروع کی تو ہم خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انہوں نے بھی ہم لوگوں سے مل کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اپنے پاس سے اردو کی چند کتابیں بھی انہیں تحفتاً پیش کیں۔ پھر چین، ہندوستان، پاکستان اور ایران میں اردو کے سلسلے سے گفتگو شروع ہوئی اور یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ چین میں اردو میں ہونے والے کاموں کی بابت جناب لیو نے جو معلومات فراہم کی تھیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ یہی سوچ کر اس گفتگو کا خلاصہ اپنے قارئین کے لئے پیش کر رہا ہوں۔

جناب لیو کا پورا نام لیوشیونگ (Liu Shuxiong) ہے۔ وہ یکم اگست ۱۹۵۱ء کو صوبۂ ہونان میں پیدا ہوئے جو صدر ماؤ کا بھی مقام پیدائش ہے۔ ۱۹۷۰ء میں پیکنگ یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ۱۹۷۴ء میں اردو زبان و ادب میں بی-اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہ بتادوں کہ اُس وقت اس یونیورسٹی میں بی-اے تک ہی اردو کی تعلیم کا انتظام تھا، مگر ۱۹۸۰ء سے یہاں ایم-اے تک اردو کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ وہ بی-اے کرنے کے بعد پاکستان چلے گئے۔ پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ کام کی غرض سے۔ وہاں مشین سازی کے ایک کارخانے میں کچھ چینی ماہرین کام کر رہے تھے اور جناب لیو مترجم کے فرائض انجام دیتے تھے۔ دو سال بعد وہ چین واپس چلے گئے۔ وہاں شعبۂ اردو میں استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا تھا۔ اُس وقت وہاں صرف دو ہی اساتذہ تھے جن سے لیو نے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء تک وہ پھر دو سال کے لئے پاکستان چلے گئے۔ اس بار تعلیم کی غرض سے گئے تھے۔ وہاں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد میں داخلہ لیا اور دو سال تک اردو زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اردو ادب میں افسانہ، ناول، ڈراما اور شاعری نیز دیگر مضامین زیر مطالعہ رہے۔

مسٹر لیو نے بتایا کہ ہم خود بھی محنت سے پڑھتے تھے اور ہمارے اساتذہ بھی ہمیں محنت سے پڑھاتے تھے۔ ان کی نظر میں صرف اسکول یا کالج میں پڑھنا کافی نہیں تھا بلکہ ہم اہل زبان کے ساتھ گھل مل کر رہتے اور زبان کی نزاکتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جن ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ان میں میرزا ادیب، احمد ندیم قاسمی، فتح ملک، ممتاز مفتی اور مظہر الاسلام کے نام قابل ذکر ہیں۔ ادبی رسالوں میں نیرنگ خیال راولپنڈی اور فنون لاہور کے دفاتر میں بھی گئے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ چونکہ ہمارا انسٹی ٹیوٹ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے قریب تھا لہذا وہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا اور جب بھی کوئی نشست یا تقریب وغیرہ ہوتی تو ہم لوگوں کو بلایا بھی جاتا تھا۔ پروفیسر نظیر صدیقی سے اسی وقت ملاقات ہوئی تھی جو بعد میں ایک سال کے لئے ہماری یونیورسٹی (چین) میں ماہر اردو کی حیثیت سے تشریف لائے۔

جب میں نے مسٹر لیو سے دریافت کیا کہ آپ کو اردو سیکھنے کا شوق کب اور کیسے پیدا ہوا تو انہوں نے بتایا کہ اردو پڑھنے سے قبل اس کا نام تک نہیں سنا تھا اور نہ ہی یہ جانتا تھا کہ اردو کیا ہے؟ یونیورسٹی میں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ اردو بھی ایک زبان ہے۔ ہمارا شعبہ ایسا ہے جہاں مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہند و چین کے روابط قدیم ہیں اور اسی طرح پاکستان اور چین کے دوستانہ تعلقات کے پیش نظر ان ملکوں کی زبانوں سے ہماری واقفیت اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے۔ یہ عرض کر دوں کہ ہماری یونیورسٹی میں ہندی کا بھی شعبہ ہے۔ ہندو پاک اور چین کے روابط کو خوشگوار سے خوشگوار تر بنانے کے لئے ایک دوسرے کی تاریخ و ثقافت اور زبان و ادب سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ لہذا ہم نے اردو زبان سیکھی۔

میں نے جاننا چاہا کہ اردو سیکھنے کے دوران آپ کیسا محسوس کر رہے تھے تو انہوں نے بتایا کہ، ابتدا میں بہت مشکل پیش آئی تھی کیوں کہ ہماری زبان (چینی) سے اس کا رسم الخط بھی مختلف ہے۔ پھر اردو کے حرف تہجی بھی کچھ عجیب سے لگے لیکن بہت جلد ہم نے استاد کی مدد سے ان مشکلات پر قابو پا لیا اور دو سال کی مسلسل مشق نے ہمیں اس زبان اور اس کے ادب سے پوری طرح نہیں تو بیشتر واقف و آگاہ کرا دیا اور نصاب کی حد تک ہم لکھنے پڑھنے لگے۔ دو سال بعد جب پاکستان سے ایک استاد جناب آفتاب شمیم چین تشریف لائے تو پھر ہم نے ان کی مدد سے بہت کچھ سیکھا۔ ابتدا میں اردو میں ایک مقالہ 'اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری پر تبصرہ' لکھا۔ اس مقالے کا چینی میں ترجمہ ہوا اور یہ شائع بھی ہوا۔

میں نے پوچھا کہ آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ تو مسٹر لیو نے بتایا کہ استاد بننے کے بعد ایک طرف طالب علموں کو پڑھانا اور دوسری طرف کچھ لکھنے پڑھنے کا کام ہے۔ میرے کام کی نوعیت دو طرح کی ہیں۔ ایک: ترجمہ — اردو سے چینی میں اور برعکس؛ اور دوسرا: تخلیقی اور تحقیقی کام۔ میں نے جن اردو کتابوں کے چینی ترجموں میں حصہ لیا

ان کے نام یہ ہیں:-

(۱) باغ و بہار، میر امن۔ (۲) خدا کی بستی، شوکت صدیقی۔ (۳) دل کی وادیاں سو گئیں، کرشن چندر

(۴) چینی کے ایک افسانے کا اردو ترجمہ۔

'باغ و بہار' کا ترجمہ چار آدمیوں نے مل کر کیا۔ اسی طرح 'خدا کی بستی' کا ترجمہ دو آدمیوں نے کیا۔ اس کے ترجمے میں ہم نے بہت وقت سے کام لیا ہے۔ جہاں کہیں مشکلات در پیش ہوئیں انہیں ماہر اردو سے سمجھا ہے۔ ویسے بھی دوران تعلیم اس کتاب کے بعض حصے ہمارے نصاب میں شامل تھے۔ 'دل کی وادیاں سو گئیں' کے ترجمہ کے ساتھ اتفاق یہ ہوا کہ یہ ابھی تک شائع نہ ہو سکا۔ اگر چہ ۱۹۸۶ء میں ہی ہم نے ترجمہ کا کام پورا کر لیا تھا اور 'اشاعت گھر' کے حوالے کر دیا تھا۔ اشاعت گھر مختلف زبانوں میں کتابوں کے تراجم شائع کرتا ہے جن میں اردو بھی شامل ہے۔

چینی کے ایک افسانے کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو پاکستان میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ ۱۹۷۸ء سے چینی معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں تھا۔ اور بھی کچھ اردو افسانوں کا چینی میں ترجمہ کر چکا ہوں۔

<u>تخلیق و تحقیق</u> : میری تحقیق کا موضوع مجموعی طور پر اردو ادب ہے۔ میں نے تقریباً سات آٹھ مقالے اردو زبان و ادب کے بارے میں چینی میں لکھے ہیں جو سب کے سب شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں ''پریم چند اور لوشین کے افسانوں میں مماثلت''، ''بھارت میں ترقی پسند ادب''، ''اقبال اور اردو ادب''، ''خدا کی بستی — سماج کی ایک جیتی جاگتی تصویر'' وغیرہ۔

اردو شاعری کا کچھ ترجمہ ضرور کیا ہے البتہ شاعری نہیں کی۔ ہند و پاک کے کچھ شعرا کا کلام چینی میں منتقل کر کے ایک مجموعے کی شکل دی ہے۔ یہ شعرا تقسیم سے پہلے کے ہیں۔

❑❑❑

کسی شخص کا قول ہے کہ ہر قوم کو اُسی طور کی حکومت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ یہی بات تحقیق کے متعلق بھی کہی جاتی ہے۔ کسی ملک کے باشندوں کا معیارِ اخلاق پست ہو اور وہ کام سے جی چُراتے ہوں، تو وہاں بالعموم تحقیق کا درجہ پست ہو گا۔

قاضی عبد الودود

فضا ابن فیضی

غزل

مر بھی جاؤں، تو فراغت نہیں ملنے والی
زندگی سے کہیں فرصت نہیں ملنے والی

راہ روشن تو ہے کچھ، اپنا سفر طے کر لے
پھر یہ شمعِ شبِ ہجرت نہیں ملنے والی

سر چھپا لے، انھیں گرتی ہوئی دیواروں میں
اس خرابے میں کوئی چھت نہیں ملنے والی

تو بھی پتھر ہی سہی اپنی جگہ، تجھ کو مگر
میرے شیشے کی صلابت نہیں ملنے والی

سیکھ لے تو، اسی پسپائی پہ قانع ہونا
اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ملنے والی

ہے یہی حکمِ سزا، تیرے لیے اجرِ عظیم
اب کوئی اور بشارت نہیں ملنے والی

پھینک آؤ کہیں، اس مایۂ بے مایہ کو
خود کو بیچوں بھی تو قیمت نہیں ملنے والی

سر کے ان زخموں کو، خمیازۂ تہمت نہ کہو!
پھر یہ دستارِ فضیلت نہیں ملنے والی

اے فضاؔ! خود کو ان الفاظ کے رشتوں سے نکال
یوں تو معنی کی رفاقت نہیں ملنے والی

Jamalpura, Mau - 245 101, (U.P)

باقر مہدی

غزل

ایک فاتح کی شہادت کبھی پہلے تو نہ تھی
سرکشی کی یہ روایت کبھی پہلے تو نہ تھی

خامشی ساتھ لگی رہتی تھی ہر منزل پر
بول اٹھنے کی جسارت کبھی پہلے تو نہ تھی

دیکھ رہ رہ کے دھواں اٹھتا ہے شہروں شہروں
کوچے کوچے میں بغاوت کبھی پہلے تو نہ تھی

قتل ہونے پہ کمربستہ ہیں سارے بیکس
موت سے اتنی رفاقت کبھی پہلے تو نہ تھی

تلخ سے تلخ ہوئی جاتی ہیں تیری باتیں
سچ کہیں ایسی صداقت کبھی پہلے تو نہ تھی

زلزلے آتے تھے مر جاتے تھے لاکھوں لیکن
ساری دنیا میں قیامت کبھی پہلے تو نہ تھی

کیسے اشعار میں ڈھل جاتا ہے سارا لاوا
تجھ میں باقرؔ یہ مہارت کبھی پہلے تو نہ تھی

غزل

جو کام کارِ خیر ہے وہ کام کیجیے
خود کو بُرے عمل سے نہ بدنام کیجیے

صادق صفت بنایئے کاذب اگر ہے صبح
دے کر سیاہیاں نہ اُسے شام کیجیے

کہنا یہی ہے اہل حقیقت کو آپ سے
ہر گز نہیں پرستشِ اوہام کیجیے

کوڑی کے مول اثاثۂ اوصاف بیچ کر
سیرت کی پختگی کو نہیں خام کیجیے

گلشن کے باغبان اگر واقعی ہیں آپ
فصلِ خزاں میں بھی اُسے گلفام کیجیے

دل میں اگر ہے آپ کے ان کی وفا کا درد
جو ہیں پرند اسیر انہیں بے دام کیجیے

سن کر مذاق اڑائیں گے ہمدرد جو نہیں
ہر ایک سے نہ شکوۂ آلام کیجیے

دعوا اگر ہے آپ کو حاذق طبیب کا
کچھ تو علاجِ گردشِ ایام کیجیے

موصول مشورے ہوں تو لازم ہے آپ کو
پیشِ نظر خلوص کا پیغام کیجیے

آئینہ دیکھ لینا ضروری ہے آپ کا
نادم کسی کا عیب اگر عام کیجیے

Kund Mohalla, Daltonganj, Palamau (Jharkhand) - 822 101

ڈاکٹر ناظمؔ جعفری

غزلیں

بصد ملال ارادہ بدل کے بیٹھ گیا وہ آتا دیکھ کے مجھ کو سنبھل کے بیٹھ گیا
کبھی کا عزم سفر ایک سا نہیں ہوتا ہمارے ساتھ وہ کچھ دور چل کے بیٹھ گیا
یہ شوخیاں ابھی باقی ہیں دیکھیے انداز چھڑا کے ہاتھ زمیں پر مچل کے بیٹھ گیا
ہماری سعیٔ مسلسل میں تھی تپش ایسی ارادہ آہنی اس کا تھا گل کے بیٹھ گیا
حسن کی آگ سے ظلمت کدہ ہوا روشن جو شعلہ بھڑکا اندھیروں میں جل کے بیٹھ گیا
کوئی ملے تو بہل جاوں دو گھڑی کے لیے گھٹن ہے ایسی کہ گھر سے نکل کے بیٹھ گیا

غریب شہر سمجھتے ہیں لوگ ناظمؔ کو
ذرا سی دیر جو باہر محل کے بیٹھ گیا

○

بجھی بجھی سی ہیں افسردہ بدحواس آنکھیں
کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں مری اداس آنکھیں
تراش لیتی ہیں اپنے خیال کے پیکر
برہنہ ذہن کے ہمراہ بے لباس آنکھیں
کوئی بتائے بصیرت ہے کیا بصارت کیا
میں دیکھنے کے لیے یوں تو سب کے پاس آنکھیں
بڑے عجیب مناظر نظر سے گزرے ہیں
وہ بدنصیب ہوں جس کو نہ آئیں راس آنکھیں
میں اس کے پاس سے گزروں گا بار بار مگر
نہ دیکھ پائیں گی مجھ کو وہ ناشناس آنکھیں
سرور و کیف میں ڈوبا ہوا تھا ہر لمحہ
گلے میں شاخ بدن محو التماس آنکھیں
نظر کے سامنے آئینہ رکھ دیا ناظمؔ
مرے وقار کا کرتی رہیں قیاس آنکھیں

غزلیں

رستے کی ٹھوکروں سے شناسا اگر نہ ہو
اے گردشِ حیات میری ہم سفر نہ ہو

جو چاک ہی نہیں وہ گریبان ہی نہیں
دامن نہیں جو اشکِ ندامت سے تر نہ ہو

ہر سال یہ ہی خیر مناتا ہے پاسبان
راہِ بہار میں کہیں زنداں کا در نہ ہو

بائی خوش نصیبئی صحرا وہی تو ہے
وہ آدمی کہ جس کے مقدر میں گھر نہ ہو

اُس رات کا ہمیں تو ازل سے ہے انتظار
وہ رات جس کے بعد "نوعِ سحر نہ ہو

میرے سوائے کچھ بھی دکھاتا نہیں مجھے
یہ آئینہ بھی میری طرح کم نظر نہ ہو

ساقی کی جس پہ کوئی توجہ نہیں مجاؔز
لکھا ہمارا نام اُسی جام پر نہ ہو

Dr. Prakash Srivastava Majaz
92/81, Patel Marg, Mansarover
Jaipur-302 020 (Rajasthan)

نہ گلستاں کے رہے ہم نہ دشتِ وحشت کے
عجیب ہی تھے مراحل رہِ محبت کے

نقیب صبح سے کہہ دو کہ پھر کبھی دستک
کہ منتظر ہیں ابھی ہم کسی قیامت کے

گناہ و جرم و خطا و قصور و نادانی
کئی ہیں اُس کی عدالت میں نام غربت کے

کسی نے حکم تو جاری کیا پرستش کا
عطا کئے نہ سلیقے مگر عبادت کے

ہمیں قبول ہے یاروں کی بے رخی لیکن
تعلقات گوارہ نہیں رقابت کے

یہ کہہ کے اُس نے کیا ہے جلا وطن مجھ کو
تیرے وجود سے کھلتے ہیں راز جنت کے

بفیضِ گردشِ دوراں کچھ ایسی آن پڑی علاج
کوئی نہیں تھا سوائے ہجرت کے

نہ میرے غم سے معطر ہے اُس کی تنہائی
نہ اُس کی بزم میں چرچے ہیں میری خلوت کے

مجاؔز آپ ہی غیر از قبیل تھے یعنی
شکار ہو کے رہے شہر کی سیاست کے

سرسوتی سرن کیفؔ

غزل

کچھ ایسے مرحلے بھی آئے ہیں زندگی میں — غم ہو گیا یکایک تبدیل جب خوشی میں

مسکن بنا لیا ہے جب دل میں تیرگی نے — آنکھوں سے دے دکھائی کیا خاک روشنی میں

ہونٹوں پہ کچھ تبسم ابرو پہ کچھ شکن سی — کیا کیا نکھار آئے انداز دل کشی میں

زاہد کو بندگی میں جو ہے سکون و راحت — کچھ اس سے بیشتر ہے شیدا کو عاشقی میں

یہ وہم بھی ہے اب تو جینے کا اک سہارا — کچھ شائبہ کرم کا ہے ان کی بے رخی میں

روز ازل سے ہم کو بختِ سیہ ملا تھا — باقی جو تھا وہ پایا اب ان کی دوستی میں

اس کو امید جنت اس کو امید لذت — کیا فرق رہ گیا پھر رند اور متقی میں

بار حیا سے اب تک آنکھیں جھکی ہوئی ہیں — کچھ کہہ دیا تھا ان سے شاید کہ بے خودی میں

گو کیفؔ لطف زا ہے اب بھی کسک پرانی
پر بات اور ہی تھی زخموں کی تازگی میں

Meenakshi Hospital
E5/3Q Area Colony, Bhopal (M.P) 462 016

غزلیں

مجھ سے کب ترکِ انا ممکن ہوا
میرے قبضے میں کہاں یہ جن ہوا

منکشف دریا کا جب باطن ہوا
ساحلوں پر آسماں ساکن ہوا

شہر میں رقصاں ہوئی بے چارگی
درد کی دولت کا میں خازن ہوا

آسماں نے کر دیا تبدیل سب
دشمنِ جاں ہی مرا محسن ہوا

نیند میں جلتا رہا اک مرغزار
ایک دشتِ بیکراں سا دن ہوا

تہمتیں ساری مجھے منظور ہیں
تجھ سے کب پاسِ وفا ممکن ہوا

میری جان و مال کا طالب رئیس
کیوں عدالت میں مرا ضامن ہوا

رہے گا رنگِ شفق محوِ گفتگو تجھ سے
زمین پائے گی میرے لہو نمو تجھ سے

غبارِ اشک مری چشمِ بے خطا سے نکل
مرے غنیم کریں گے یہاں وضو تجھ سے

نہ ضربِ سنگ تجھے میں نے خیر باد کہا
شرابِ درد نہ خالی ہوئے سبو تجھ سے

بنائے رکھنا سدا صبر کو سپر اپنی
شکست پائیں گے اک روز جنگجو تجھ سے

حصارِ زعمِ انا سے نکل کے سوچ ذرا
ہے بدگمان مرا آج کیوں لہو تجھ سے

ثبوتِ فتح رئیس اور کیا ملے تجھ کو
پناہ مانگ رہا ہے ترا عدو تجھ سے

●

Delhi Gate, Aligarh - 202 001

کمالؔ جعفری

غزل

دل مرا حرص میں صیاد نہیں ہو سکتا
ہے یقیں مجھ کو یہ برباد نہیں ہو سکتا

جس سے ماں باپ ہوں ناراض یہ کہہ دو اس سے
زندگی میں وہ کبھی شاد نہیں ہو سکتا

قتل انساں کا جو کرتے ہیں وہ انسان نہیں
ابنِ آدم ہوں میں جلاد نہیں ہو سکتا

وہ جو پڑھتا ہے پڑھاتا بھی ہے نفرت کا سبق
سچ ہے انساں کی وہ اولاد نہیں ہو سکتا

مجھ پہ ہر لمحہ تو کر ظلم و ستم اے ظالم!
میں کبھی مائل فریاد نہیں ہو سکتا

اس کو میں پھول کہوں یہ نہیں ہوگا مجھ سے
جو گلستاں میں بھی آباد نہیں ہو سکتا

یہ حقیقت ہے جو ہوتا ہے غزل کا شاعر
زلفِ محبوب سے آزاد نہیں ہو سکتا

کوہکن یوں تو زمانے میں ہزاروں ہیں کمالؔ
ہر کوئی عشق میں فرہاد نہیں ہو سکتا

Programme Executive, All India Radio
KOLKATA (W.B.)

دیپک قمر

غزل

کچھ نہ کہتی ہوئی مسکراہٹ عجب
چھپتی چھپتی سی ان کی دکھاوٹ عجب
رسیا بھنوروں کی ہے بھنبھناہٹ عجب
ہر کلی میں بھرے کپکپاہٹ عجب
پیار ہی پیار ہے کوئی خواہش نہیں
تن کے رشتے بنا یہ لگاوٹ عجب
چھو لیا آ کے کس نے بدن خواب میں
آج اعضا میں ہے سنسناہٹ عجب
دل کے تاروں کو چھیڑا ترے عشق نے
ساز دینے لگا جھنجھناہٹ عجب
یاد نے تیری کیسا ہے جادو کیا
خامشی میں بھی ہے تھرتھراہٹ عجب
ہم اندھیروں کے سکھ کو ترسنے لگے
جگمگاہٹ نے کی جھلملاہٹ عجب
جانے وہ خواب تھا کہ حقیقت تھی وہ
رات رہ رہ کے ہوتی تھی آہٹ عجب
سادگی میں وہ لپٹی تھی معصومیت
بار شنگار کے بن سجاوٹ عجب
اس نئے دور کی بات ہم کیا کریں
روپ اُس کا انوکھا بناوٹ عجب

HIG – B/52 Panday Nagar, Meerut - 250 001 (U.P)

ایوب جوہر

غزلیں

نہیں جانتا ہے وہ بے خبر مرے دل میں جس کا قیام ہے
ہے مگر یہ شور گلی گلی مرے دل کا کام تمام ہے

میں نے جان و دل بھی لٹا دیا جو تھا آشیاں وہ جلا دیا
کوئی جا کے اُس سے یہ پوچھ لے ابھی اور کیا کوئی کام ہے

میں ہوں اک نظارۂ دلکشا مجھے زخمِ دل کا پتا ہی کیا
یہی گلستاں ہے وہ دلنشیں جو تمہارے حُسن کے نام ہے

بڑے شوق سے پیو مرحبا، نہ کُھلے گی اس پہ زباں مری
یہ لہو نہیں ہے شراب ہے سرِ بزمِ گردشِ جام ہے

کوئی یہ بتائے مجھے ذرا بھلا کیا ہوا مجھے ان دنوں
نہیں لگتا ہے مرا دل کہیں، وہی صبح ہے وہی شام ہے

مری آنکھوں میں ترے جلوے ہیں مجھے نیند سے نہیں واسطہ
مگر یہ سُنا ہے کیا ان دنوں تری نیند بھی تو حرام ہے

ہم ترے شہر میں یوں گزار آئے ہیں
جیسے لگتا ہے خود کو سنوار آئے ہیں

وہ چلیں تو کِھلیں پھول برسیں شفق
ہم چلے ہیں تو گرد و غبار آئے ہیں

پُرسشِ غم تھی اور ہم تھے محوِ فغاں
پھر یہ کیسے کہیں سوگوار آئے ہیں

ہم کو نام و نشاں کی ضرورت نہیں
صبح نو تیری زلفیں سنوار آئے ہیں

رقص کرتے ہیں تارے، زمیں آسماں
آج گھر میرے پروردگار آئے ہیں

وقت کی تیز جلتی ہوئی دھوپ میں
کچھ دکھوں کو ہم اپنے پیار آئے ہیں

غزلیں

کڑی منزل ہے اے دستِ ہنر آگے سمندر ہے
سفینے پھر ذرا تیار کر آگے سمندر ہے

نئی دنیا کو ہجرت کا ارادہ خوب ہے لیکن
رہے یہ بات بھی پیشِ نظر آگے سمندر ہے

یہی ہے منزلِ امکان گویا اس سے آگے پھر
کوئی منزل نہ کوئی رہ گزر آگے سمندر ہے

ہمیں بھی رات دن بے چین رکھتی ہے یہی الجھن
اسی الجھن میں ہیں یہ بام و در آگے سمندر ہے

کیا تھا ایسی منزل کا جنھوں نے انتخاب آخر
نہ جانے تھے وہ کیسے راہبر آگے سمندر ہے

سناؤ مت ہمیں ہجرت کے سارے خوشنما قصے
سنو ہم سے یہ قصہ مختصر آگے سمندر ہے

اب تو جینا ہے ہمیں اس کی رفاقت کے بغیر
کیسے کٹتی ہے ذرا دیکھیں محبت کے بغیر

دل عجب طفل ہے میں اس سے بہت عاجز ہوں
دل عجب طفل ہے میں اس سے بہت عاجز ہوں

بے غرض کوئی کسی سے نہیں ملتا پھر بھی
بے غرض کوئی کسی سے نہیں ملتا پھر بھی

ہم نے غنچوں کی زباں سے یہ سنا ہے اکثر
ہم نے غنچوں کی زباں سے یہ سنا ہے اکثر

اپنا کوفہ بھی عجب ہے کہ یہاں لوگوں کو
اپنا کوفہ بھی عجب ہے کہ یہاں لوگوں کو

اثر فریدی

غزلیں

کسی میں خوبیاں گر ہیں تو اچھا کہہ نہیں سکتے
اثر ہم کیوں اجالے کو اجالا کہہ نہیں سکتے

دکھائی جب نہیں دیتا تو چہرا کہہ نہیں سکتے
کہو یہ تم کہو ہم تو سویرا کہہ نہیں سکتے

ہمارے دل میں ہے اب بھی، وہ رشتے یاد آتے ہیں
کہیں ہم یہ کہ ہے مخلص ہمارا کہہ نہیں سکتے

نہ جانے کون سے منصب کی خاطر لوگ زندہ ہیں
اندھیرا سامنے ہے اور اندھیرا کہہ نہیں سکتے

وسائل سب میسّر ہیں مگر تشنہ ہوں میں اب بھی
سفر ذہنوں کا جاری ہے کنارا کہہ نہیں سکتے

ہمارے دل کا ہے اب بھی وہی عالم جو پہلے تھا
اثر ہرگز اسے گزرا زمانہ کہہ نہیں سکتے

فرشتہ بن کے کوئی میرے گھر میں رہتا ہے
مگر کہیں نہ کہیں یہ بشر میں رہتا ہے

کسی کی بات کسی سے تو ہم نہیں کہتے
مگر وہ چہرا ہماری نظر میں رہتا ہے

جو چاہتے ہو سمجھنا تم اپنے پرکھوں کو
تمہارے پرکھوں کا قصہ کھنڈر میں رہتا ہے

کوئی بھی بات کریں بھی تو کس طرح تم سے
تمہارا ذہن ہمیشہ سفر میں رہتا ہے

ہمارے پاس وہ آئے تو سر جھکائے ہوئے
ابھی کسی نہ کسی کے اثر میں رہتا ہے

Shabina Opticals, Adalat Gate,
Patna - 800 004

غزل

تراشا تھا جو بُت گرنے وہ پتھر کا صنم ٹوٹا
خدا جانے کہ شانِ بت گری پر کیا ستم ٹوٹا

حریفوں کی طرفداری سے اپنا پن کا دم ٹوٹا
بڑھی کچھ اور جب دوری تو قربت کا بھرم ٹوٹا

نہ یونہی بزمِ ہستی میں صدائے درد پھر گونجی
کسی نے تار چھیڑا تو سکوتِ سازِ غم ٹوٹا

سمجھ رکھا تھا پتھر کے صنم ہی کو خدا اُس نے
صنم ٹوٹا تو آزر کی پرستش کا بھرم ٹوٹا

فقط اک رات کی بخشی گئی تھی زندگی اس کو
نمودِ صبح ہوتے ہی چراغِ شب کا دم ٹوٹا

بھلا اُس حادثے کو وقت کی تاریخ بھولے گی
اِدھر لاکھوں کے دم ٹوٹے اُدھر جس دم حرم ٹوٹا

جو لکھنا تھا اسے جس دور میں وہ لکھ گیا کوثر
بھلا کب ضربِ دوراں سے سخنور کا قلم ٹوٹا

اختر شاہجہاں پوری

مدہوش بلگرامی

غزلیں

اگر چراغ کہیں ہم جلا کے رکھتے ہیں
یقین کیجئے رُخ پر ہوا کے رکھتے ہیں

نکال لائے بھنور سے شکستہ کشتی بھی
کہ ہم تو حوصلے یارو بلا کے رکھتے ہیں

وہ ایک اسم جو مشکل کشا ہے صدیوں سے
اُسی کو طاقِ یقیں پر سجا کے رکھتے ہیں

ہمارے چہرے کی شادابیوں پہ مت جانا
کہ دل میں زخم نئے کربلا کے رکھتے ہیں

ہنرورانِ سخن میں شمار ہے اپنا
ہوا کے دوش پہ جگنو صدا کے رکھتے ہیں

ترس نہ کھائیں رفیقانِ چارہ جو اختر
ہم اپنے زخموں کو یوں بھی چھپا کے رکھتے ہیں

●

Rangeen Chaupal, Shahjahanpur

(U.P) 242 001

ہر مصلحت شعار رفاقت بُری لگی
یوں دوستوں کی آج محبت بری لگی

شیریں بیانیوں کا زمانہ وہ آگیا
ہر شخص کو جو تلخ حقیقت بُری لگی

اکثر جو چوم چوم کے پڑھتا تھا حرف حرف
اس کو بھی آج میری عبارت بری لگی

محنت کی ہی کمائی کو رکھا عزیزِ جاں
جو بھیک میں ملی تھی وہ دولت بری لگی

کس درجہ بے ثباتیِ عالم کا ہوں شکار
مجھکو نگاہِ لطف و عنایت بری لگی

شاخوں سے آج نوچ کے گل کیوں مسل دئے
کیوں آپ کو ہماری یہ چاہت بری لگی

مدہوش اپنی چھوٹی سی کٹیا کے سامنے
بے مثل پتھروں کی عمارت بری لگی

اصغر بہرائچی

غزلیں

عہدِ گُل کام نہ آیا نہ گلستاں میرے
کام آئے تو وہی خارِ مُغیلاں میرے

جب سے پیچھے ہی پڑی گردشِ دوراں میرے
کون ایسے میں کرے درد کا درماں میرے

دیکھنے والا کوئی ہو تو دکھائیں بھی اُسے
کتنے غم آج بھی سینے میں ہیں پنہاں میرے

یوں تو گلشن میں فراوانیٔ گل آج بھی ہے
کیا کروں تنگ ہی جب ہو گئے داماں میرے

ماہ و خورشید بھی چاہوں تو کہاں سے پاؤں
ساتھ رہتی ہے سدا شامِ غریباں میرے

جیسے آکاش کے آنگن میں ستاروں کا سماں
ایسے لگتے ہیں یہ آنسو سرِ مژگاں میرے

ڈورے آنکھوں میں لئے پھرتی ہے جو موجِ بہار
ہوں نہ ہوں ہیں یہ وہی تارِ گریباں میرے

اُن سے پوچھا نہ گیا مجھ سے بتایا نہ گیا
دل کے دل ہی میں رہے حسرت و ارماں میرے

بھیک اُجالوں کی نہ مانگوں گا کبھی اے اصغرؔ
روشنی دیتے ہیں خود زخم درخشاں میرے

اخلاص و محبت کی طریقت نہیں دیکھی
اِس دور کے انساں میں محبت نہیں دیکھی

جس گھر میں نہیں ہوتی ہے مہمان کی عزت
اُس گھر میں کسی نے کبھی برکت نہیں دیکھی

کیا وہ بھی نگاہوں میں تری مجھ سے برا ہے
برسوں ترے آئینہ نے صورت نہیں دیکھی

میں مردِ مجاہد ہوں مرا ہاتھ ہے تلوار
کیا آپ نے اب تک مری ہمت نہیں دیکھی

وہ چاہے تو گھر کو ترے جنت بھی بنا دے
تم نے ابھی اللہ کی قدرت نہیں دیکھی

میں نے تو بھی دیکھے ہیں مدینہ کے شب و روز
تم کیسے یہ کہتے ہو کہ جنت نہیں دیکھی

رشتہ ہے میرا حیدرِ کرّار سے اصغرؔ
غم دیکھے ہیں لیکن کبھی ذلت نہیں دیکھی

فاروق جائسی

غزل

(نذر بیکس سیوانی)

جب وہ رشکِ ماہ مجھ پر مہرباں ہونے لگا
میں زبان رکھتے ہوئے بھی بے زباں ہونے لگا

اس پہ جب ہمدرد ہونے کا گماں ہونے لگا
اشک میری خشک آنکھوں سے رواں ہونے لگا

مجھ کو محرومِ ستم بھی کس خطا پر کر دیا
"بے تعلق کیوں زمیں سے آسماں ہونے لگا"

میرا ضبطِ غم تھا سدِّ راہِ جوشِ اضطراب
آنسوؤں کا قافلہ کیسے رواں ہونے لگا

رفتہ رفتہ آنکھ کی بینائی کم ہوتی گئی
صاف تحریروں پہ دھبّے کا گماں ہونے لگا

کس کی یادوں کے قدم صحرائے دل کو چھو گئے
دل کا ریگستان بھی رشکِ جناں ہونے لگا

غیر پر فاروق صاحب کیوں بھروسہ کیجیے
مائلِ افشائے راز اب رازداں ہونے لگا

●

Flat No. 406- Sangeta Apartments,
14/59, Civil Lines, Kanpur - 208 001

غزلیں

خیال و فکر کی پرکیف تازگی بھر دے
نئے مزاج کے موسم میں دلکشی بھر دے

وہ اپنے روپ میں اک اور روپ دیکھ سکے
ہر آدمی میں کوئی اور آدمی بھر دے

لہو سے سینچنا بیکار ہے سیاست کا
یہ پیڑ وہ نہیں جو چھانو زندگی بھر دے

نہ جانے کیسا سمندر ہے دل کی دنیا میں
ابل پڑے تو وہ آنکھوں کی ہر ندی بھر دے

نمودِ صبح کا منظر بھی دیکھنا ہے اسے
چراغِ شام کی آنکھوں میں روشنی بھر دے

غریب ماں کے دوپٹے میں چاند ہے لیکن
"بہت اداس ہے کچھ اس میں روشنی بھر دے"

خمارِ عشق تو رہتا ہے عمر بھر فاروقؔ
یہ وہ شراب نہیں جو نشہ گھڑی بھر دے

کسی مجبور ماں سے پوچھ کیا کیا ٹوٹ جاتا ہے
تڑپ کر بھوک سے جب اس کا بچّا ٹوٹ جاتا ہے

جوانی ٹوٹ جاتی ہے بڑھاپا ٹوٹ جاتا ہے
اچانک جب کسی سے دل کا رشتا ٹوٹ جاتا ہے

بہت کچھ کر گزرتا ہے انا کے جوش میں لیکن
سمندر سامنے آئے تو دریا ٹوٹ جاتا ہے

اٹھایا تھا ابھی ہیرا اگر پتھر ہے ہاتھوں میں
یہی ہوتا ہے جب مفلس کا سپنا ٹوٹ جاتا ہے

بزرگوں کی نشانی نوکِ خنجر پر تڑپتی ہے
کسی بھائی سے جب بھائی کا رشتا ٹوٹ جاتا ہے

بہت شیریں تکلم ہے مگر جب بولتے ہو تم
مرے معصوم دل میں چبھ کے کانٹا ٹوٹ جاتا ہے

کبھی فاروقؔ پڑتا ہے جو پالا قومِ آہن سے
ترقی یافتہ ملکوں کا تیشا ٹوٹ جاتا ہے

عباس رضا نیرؔ

غزل

ہر اک طرف سے مجھے کاٹنے کو گھر آئے
دعا کرو کہ کوئی ساعتِ سفر آئے

بچھا دیے مری راہوں میں دھوپ کے پتھر
بلانے جب بھی مجھے بادلوں کے پر آئے

چٹخ کے ٹوٹ بھی سکتا ہے چپ کا یہ پربت
بس اس طرف سے کوئی اک صدا ابھر آئے

مجھے چراغ کیا ہے تو سخت جان بھی کر
وہیں ہوا ہو جہاں میری لَو نظر آئے

تمازتوں میں مرا رنگ اور کھلتا ہے
میں پھول ہوں مرے حصے میں دوپہر آئے

ہمارے رقص پہ طوفان رشک کرتا ہے
ہمارے پانو میں گھنگھرو نہیں، بھنور آئے

خوشا نصیب جواں لال قتل گاہ میں ہے
یہ میری ماں سے کوئی کہہ دے طاق بھر آئے

ہوائیں پوچھتی ہیں کیفؔ کیا ہوئے نیرؔ
کہاں ہے وہ مرا مانجھی کوئی خبر آئے

Head of the Deptt. of Urdu
M.H.P.G. College, Muradabad - 244 001 (U.P)

رضا حیدر رضوی

غزل

کیا سناؤں میں لوگو! مجھ کو سب گوارا ہے
غم مرا مقدر ہے دُکھ مرا سہارا ہے

بے کسی مری مجھ کو چھوڑ کر نہیں جانا
تو ہی سب سہاروں میں معتبر سہارا ہے

خود کشی بری شئے ہے جانتا ہوں میں لیکن
زندگی سے تنگ آکر موت کو پکارا ہے

شہر شہر بکھری ہیں سب ہماری تہذیبیں
یہ زمیں ہماری ہے آسماں ہمارا ہے

راستے کے چہرے پر سازشیں عبارت ہیں
کارواں کے لٹنے میں آپ کا اشارا ہے

آج میں اکیلا ہوں کیا ہوا رضا حیدر
آج آسماں پر بھی چاند ہے نہ تارا ہے

●

Fatmi Imambara, Dahiyawan - Chapra (BIHAR)

مختار احمد عاصی

غزلیں

روحِ خیال جانِ تمنا کہاں ہے تو ویران ہو رہا ہے مرا شہر آرزو
گلشن ہے باغباں کی سیاست سے زرد رو پھر فصلِ گل پکار رہی ہے لہو لہو
ساقی کے فیض عام کو کس کی نظر لگی ویران میکدہ ہے تو خالی ہر اک سبو
جو وار بھی کیا مرے دشمن نے پشت سے یہ حوصلہ کہاں جو کرے آ کے رو برو
آبادیوں میں زہر سیاست کا گھل گیا ہر آدمی کو لگنے لگا آدمی عدو
انسانیت کا دہر میں دامن ہے تار تار عالم یہ ہو گیا کہ نہیں لائقِ رفو

عاصیؔ ہوائے وقت یہ دیتی ہے مشورہ
گلشن میں جا ضرور مگر پھول کو نہ چھو

●

ناشادؔ اورنگ آبادی

سانپ سے دوستی کا صلہ مل گیا ڈس لیا جب بھی موقع ذرا مل گیا
آپ نے جو دیا شکریہ شکریہ جتنا سوچا تھا اُس سے سوا مل گیا
کل لپٹ کر میں سائے سے روتا رہا دھوپ میں دوست اک گمشدہ مل گیا
سر اٹھا کر چلا جب بھی کوئی اُسے راہ میں اک نہ اک حادثہ مل گیا
وہ فرشتہ نہیں ایک انسان تھا نیل میں بھی جسے راستہ مل گیا
بھول جائیں گے وہ غم بہت دیر تک جن کو ناشادؔ سا دلرُبا مل گیا

غزلیں

قدم قدم پہ زمانہ نیا نیا سا لگے
مگر یہ آدمی ہر پل ڈرا ڈرا سا لگے

چراغ ہو کہ کسی آدمی کا ہو چہرہ
یہ وہ نگر ہے جہاں سب بجھا بجھا سا لگے

کہیں پہ آنکھ کہیں لب کہیں دماغ رہے
سبھی کا عضوِ بدن اب جدا جدا سا لگے

وہ کون ہے کہ جہاں مجمع دو عالم ہے
کہ جس کے آگے زمانہ جھکا جھکا سا لگے

اللہ اللہ کے گھٹائیں برس نہیں پاتیں
کسی کی آنکھ کا ساون رکا رکا سا لگے

تمام لفظِ تنفر چمک رہے ہیں یہاں
بس ایک لفظِ محبت مٹا مٹا سا لگے

تمہارے پیار کی خوشبو وہاں تلک ہے شررؔ
یہ آسمان جہاں تک جھکا جھکا سا لگے

دیکھے جو آنکھ اس پہ یقین کیوں کیا نہ جائے
ہوتا ہے غم جو سچ کو اگر سچ کہا نہ جائے

فرصت میں بیٹھ کر کبھی اپنے مکان میں
دیوار و در کا حال بھی کیوں سن لیا نہ جائے

الھڑ شباب و قلقلِ مینا کے درمیاں
ہم کیا رشی منی سے تحمل کیا نہ جائے

ایک عمر کاٹ لیتے ہیں کچھ لوگ کس طرح
اِک پَل دیارِ غیر میں ہم سے رہا نہ جائے

فصلیں ہیں زرد زرد زمیں بھی اداس ہے
ان غم زدوں کو پھر کہیں ساون رلا نہ جائے

جب تم چلو تو راستہ خود رہبری کرے
اور میں چلوں تو ساتھ کوئی راستہ نہ جائے

جب تک سمجھ نہ آئے شررؔ شہر کا مزاج
دل کھول کر کسی سے بھی ہرگز ملا نہ جائے

عفت شہاب

غزلیں

مزاج وقت ہے برہم نہ پوچھو
یہ کیسا شور ہے پیہم نہ پوچھو

فضائے بیکراں جب سے چھٹی ہے
قفس میں گھٹ رہا ہے دم نہ پوچھو

رباب آب و گل بج تو اٹھا ہے
چھڑا ہے کون سا سرگم نہ پوچھو

ابھی تو ماورائے چشم بینا
ہیں کتنے آتشیں عالم نہ پوچھو

طلب کی پیاس بجھتی ہی نہیں ہے
کرے گا کیا بنِ آدم نہ پوچھو

●

کیف احمد کیفی

راستے دشوار تب سے ہو گئے
برسرِ پیکار جب سے ہو گئے

زندگی کی جنگ آساں ہو گئی
صاحبِ کردار جب سے ہو گئے

خود کئے کی ہم سزا پاتے رہے
بے وجہ بیزار رب سے ہو گئے

پہلے تو وہ حامی ظلمات تھے
طالب انوار کب سے ہو گئے

کھل گیا ہم پر شبِ رفتہ کا حال
مائلِ گفتار جب سے ہو گئے

غزل

ہر کوئی شہر میں بے نام و نشاں رہتا ہے
کس کو معلوم ہے یہ کون کہاں رہتا ہے

مجھ کو تو یاد نہیں اس کو کبھی دیکھا ہو
کس کا یہ نام ہے جو وردِ زباں رہتا ہے

ہر عروج اس کا گزرتا ہوا موسم ٹھہرا
دلِ انساں میں یہ احساس کہاں رہتا ہے

دیر و کعبہ میں تلاش اس کی سراسر بے سود
وہ تو ہر لحظہ قریبِ رگِ جاں رہتا ہے

حادثوں کو نہیں توفیق اسے روک سکیں
دل کے جذبات کا دریا ہے رواں رہتا ہے

اور باتوں کی شکایت بھی کریں تو کیونکر
اپنا وعدہ بھی اُسے یاد کہاں رہتا ہے

اس حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے
وہ نہاں ہو کے بھی دنیا میں عیاں رہتا ہے

سرد مہری ہو کہ انداز تغافل اُس کا
واقعہ کوئی بھی ہو دل پہ گراں رہتا ہے

دل میں اک ترکِ تعلق پہ بھی ہے یاد اُس کی
زخم مٹ جائے مگر اس کا نشاں رہتا ہے

حال کس درجہ بھی خوش رنگ ہو لیکن اے عرشؔ
اس میں شامل غمِ ماضی کا دھواں رہتا ہے

53-Reshamghar, Colony, Jammu - 180 001

پروفیسر علیم اللہ حالی

غزل

شہرِ دعا میں خاک بسر ہے مری نوا
محرومِ عرش و گنبد و در ہے مری نوا

تم ہو کہ میں سب اپنی طرف داریوں میں ہیں
دکھ میرے ہیں تو دیدۂ تر ہے مری نوا

بے برگ و بار خطۂ ویراں میں نوحہ خواں
سوکھی ہوئی سی شاخِ شجر ہے مری نوا

ہے طورِ روزگار عیاں شعر شعر میں
ہوشیار باش حرفِ خبر ہے مری نوا

اس خاکداں میں تودۂ خاشاک کی طرح
میں ڈھیر راکھ کا ہوں شرر ہے مری نوا

ٹکرا کے بام و در سے پلٹ آئی بار بار
یعنی بس ایک عکسِ نہر ہے مری نوا

پگھلے نہ پگھلے برفِ تعلق مگر علیم
راہِ وفا پہ گرمِ سفر ہے مری نوا

White House Compund, Gaya - 823 001

ڈاکٹر مجیب الرحمٰن بزمی

غزل

تھا مشتِ خاک اڑا لے گئی ہوا لوگو
وہی ہوا جو مقدر میں تھا لکھا لوگو

یہ کس خطا کی مجھے دیتے ہو سزا لوگو
ہنسا ہنسا کے رُلاتے ہو بارہا لوگو

مزاجِ سنگ سے واقف ہوں عہدِ طفلی سے
رئیسِ شہر سے کیا واسطہ مرا لوگو

حکایتِ شبِ ہجراں کسے سناؤں میں
کوئی رفیق، نہ مونس، نہ ہمنوا لوگو

اُڑا کے لے گئی سارے نقوش کمرے کے
کچھ اتنی تیز تھی وہ سرپھری ہوا لوگو

گواہی دے گا مرے بام و در کا سناٹا
سوائے غم مجھے دُنیا نے کیا دیا لوگو

گلا نہ گھونٹنا تم اپنی آرزوؤں کا
شجر اُمید کا رکھنا ہرا بھرا لوگو

ہوائے صحنِ چمن پھر ہوئی ہے زہریلی
لگی ہے داؤ پہ مفلس کی پھر ردا لوگو

کسی کی راہ میں حائل نہیں کبھی بزمیؔ
سمجھ رہے ہو جو پتھر تو دو ہٹا لوگو

Homeo Clinic, Rahmat Colony, Dorunda, Ranchi - 834 002

مقبول منظؔر

غزلیں

جس کی بندش ہو استوار بہت
کام کرتا ہے وہ حصار بہت

اُن سے رشتہ ہے جانے کیا میرا
جو ہیں ملنے کو بے قرار بہت

کب یہ ڈوبے گا رنج کا سورج
شام کرتی ہے انتظار بہت

ایک دن اُن کا زعم ٹوٹے گا
ہے انا کا جنہیں خمار بہت

سر سے پا تک تپش نے گھیرا ہے
دھوپ کرتی ہے بے قرار بہت

رہگذر میں ہے کارواں کوئی
اُٹھ رہا ہے اُدھر غبار بہت

پھول چُننے کو میں گیا لیکن
لے کے دامن میں آیا خار بہت

کاش! ثابت ہوں باوفا منظؔر
یوں تو کہنے کو تیرے یار بہت

مرہم کے دستِ فیض سے جو دُور ہو گئے
سارے پرانے زخم وہ ناسور ہو گئے

جب تک قریب تھے تو تھے ہم دل کے بھی قریب
کچھ دور کیا ہوئے کہ بہت دُور ہو گئے

کس کس کو سوکھے ہونٹ دکھاتا میں دوستو!
پی کر ہم اپنی پیاس ہی مسرور ہو گئے

جن کی جفاشعاری نے اوڑھی نقاب مکر
بن کر وفا پرست وہ مشہور ہو گئے

میں نے تو خواب ہی میں بنایا تھا اک مکاں
سپنوں کے یہ مکاں بھی مگر چور ہو گئے

منظؔر رُکے جو راہ میں سائے کو دیکھ کر
آگے قدم بڑھانے سے مجبور ہو گئے

❁

Omex Battery, G.I.D.C. Naka Sachin, Surat - 394230 (Gujrat)

غزلیں

جب کسی باپ کا فرزند جواں ہوتا ہے
اُس کی آنکھوں میں مسرّت کا جہاں ہوتا ہے

ہے جہاں دولتِ دُنیا کی پرستش جائز
وہاں سرمایۂ الطاف کہاں ہوتا ہے

بے گناہوں کو نہ پھانسی کی سزا دی جائے
ایسا انصاف زمانے میں کہاں ہوتا ہے

حاکم شہر کے ہر ظلم کا آتا ہے خیال
جب بھی کاغذ پہ قلم میرا رواں ہوتا ہے

ہر بُرائی کو چُھپا لیتا ہے اپنے اندر
اب تو ہر گاؤں میں وہ اندھا کنواں ہوتا ہے

گھر کی اناؤں کا لیتا ہے اثر جو بچّہ
خانوادے میں وہی چرب زباں ہوتا ہے

کوئی افسردہ نظر آتا ہے کوئی شاداں
عید کے دن بھی کہاں ایک سماں ہوتا ہے

جس کو ہے عظمتِ اجداد سے رشتہ گوہرؔ
بس وہی شیریں سخن، شیریں بیاں ہوتا ہے

تمہیں ہو جیت مبارک چلو میں ہار گیا
مگر یہ ایک ہی غم زندگی سنوار گیا

تمہاری بزم میں آکر میں بے قرار گیا
جو اختیار تھا دل پر وہ اختیار گیا

جسے سمجھتا رہا اپنا ایک بازو میں
وہی تو سینے میں خنجر مرے اتار گیا

چلو یہ ٹھیک ہوا میرے ایک مرنے سے
کسی کی آس تو ٹوٹی کوئی تو ہار گیا

وہ خوش نصیب تھا بے شک جہاں میں اے سیفیؔ
جو ہنستے ہنستے یہاں زندگی گزار گیا

P.O. Box -2092 Banaras Cantt, 221 002 (U.P)

غـــــزل

نئے دور کا ہے یہ انصاف بھائی
خطا کس نے کی تھی سزا کس نے پائی

وہ مظلوم ہو کر ہے قیدِ قفس میں
خطا کار کو مل گئی ہے رہائی

بھٹکتے رہے عشق میں عشق والے
کسی نے مگر دل کی منزل نہ پائی

زمانے نے کچھ ایسے پتھر سے مارا
کہ دل ٹوٹنے کی صدا بھی نہ آئی

سناؤں کسے التفاتؔ اپنی باتیں
سنی ان سنی کی جسے بھی سنائی

(تبصرے کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

کتاب : تلوک چند محروم ایک مطالعہ

مصنف : کامل بہزادی

ناشر : محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی

دوسرا ایڈیشن : ۱۹۹۹ء مطبع : ثمر آفسٹ پرنٹرز۔ نئی دہلی

صفحات : ۱۲۶ قیمت : ۹۰روپے

ملنے کا پتا : انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راوز ایونیو۔ نئی دہلی - ۱

تلوک چند محروم کا شمار اردو کے صاحب طرز اور ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ کئی مجموعوں کے شاعر محروم نے غزل، نظم اور رباعی میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ انہوں نے وطنی اور قومی شاعری کے ساتھ بچوں کے لئے بھی شاعری کی ہے۔ زیر نظر کتاب 'تلوک چند محروم- ایک مطالعہ' میں مصنف نے محروم کی شاعری کا جائزہ لے کر ان کا ادبی مقام متعین کیا ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۔ محروم اور ان کا عہد ۲۔ محروم کی نظم نگاری ۳۔ محروم کی غزل گوئی ۴۔ محروم کی رباعیاں اور دیگر کلام ۵۔ محروم کی ادبی خدمات اور مرتبہ اور ضمیمہ کا عنوان دے کر محروم کی کچھ غیر مطبوعہ تخلیقات شامل کی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں لطیف احمد سبحانی (ناگپور) کا اس کتاب پر لکھا ایک تجزیاتی مقالہ بھی شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ سبحانی نے اپنے مقالے کا آغاز ایلیٹ کے اس قول "شاعر کی سچی تنقید شاعر ہی لکھ سکتا ہے" سے کیا ہے۔ چونکہ کامل بہزادی ایک اچھے شاعر بھی ہیں لہٰذا انہوں نے محروم کے کلام کو پڑھ اور سمجھ کر اس کا تجزیہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ 'محروم کے فکر و فن کا کوئی خاص پہلو تشنہ نہ رہ جائے'۔ وہ جانتے ہیں کہ کسی بھی شاعر کا کلام عیوب سے خالی نہیں ہے اس طرح محروم بھی اس سے مبرا نہیں کہے جا سکتے۔ وہ کہتے ہیں:

خوشی کی بات ہے کہ محروم کے لائق فرزند پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی کوششوں سے محروم کے مجموعوں کی اشاعت اور ان پر علمی کاموں کا عمل جاری ہے، لیکن ان کے یہاں ہنر اتنے زیادہ ہیں کہ عیوب کو نمایاں کرنا مجھ جیسے طفل مکتب کے لئے ایک ناروا جسارت ہوتی، اس لئے میں نے زیادہ تر ان کی شاعری کے روشن پہلوؤں ہی کو اُجاگر کیا ہے"۔ محروم اور

ان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ کتاب بہت صاف ستھری چھپی ہے۔ گٹ آپ سادہ مگر جاذب ہے۔ اندرونی فلیپ بشیر بدر اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی آراء سے مزین ہے۔

سید حسن عباس

کتاب : **تاریخ سعادت**		تالیف	: منشی امام بخش بیدار
تدوین و ترجمہ : ڈاکٹر سید احسن الظفر		ناشر	: امیر الدولہ پبلک لائبریری، لکھنو
مطبع : ڈائمنڈ پرنٹرز نئی دہلی۔		سال اشاعت	: ۲۰۰۰ء
صفحات : ۹۷		قیمت	: ۲۵۰ روپے

امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنو کی ایک قدیم لائبریری ہے۔ یہاں مطبوعات و مخطوطات کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ اب اس لائبریری نے اپنا اشاعتی سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے اور مخطوطات کی فہرست کی ایک جلد کے ساتھ چند کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ زیر نظر کتاب 'تاریخ سعادت' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ سعادت علی خاں (۱۸۱۴-۱۷۹۸ء) کے عہد کی ایک تاریخ ہے جس کا مخطوطہ مذکورہ لائبریری میں موجود تھا۔ کتاب فارسی نظم میں تھی جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سید احسن الظفر نے کیا ہے۔ مترجم فارسی کے ایک اچھے استاد اور قلمکار ہیں۔ ان کے کئی شاہکار منظر عام پر آچکے ہیں۔ تاریخ سعادت کا مصنف لکھنو کا باشندہ اور منشی، امین اور فوجدار کے عہدوں پر کام کرتا رہا تھا۔ سعادت علی خاں کے عہد کی یہ منظوم تاریخ اس اعتبار سے لائق مطالعہ ہے کہ مصنف نے جو کچھ بہ چشم خود دیکھا اسے ہی نظم کے پیرائے میں قلم بند کیا ہے۔ اُس عہد کے لکھنو کا یہ مرقع نواب سعادت علی خاں کی تخت نشینی، اس کی سیاسی، انتظامی اور تعمیری سرگرمیوں کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ کتاب میں 'عرض ناشر' کے عنوان سے نصرت ناہید لائبریرین رسکریٹری امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنو نے لائبریری کی مختصر تاریخ اور مستقبل کے منصوبوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مترجم نے اپنے مقدمہ میں مخطوطہ کا تعارف، مصنف کا تعارف، کتاب کا موضوع، انداز بیان اور تدوین ترجمہ کے عناوین کے تحت اپنے موضوع سے متعلق تمام معلومات فراہم کرانے کی کوشش کی ہے۔ مخطوطے کے دو صفحات کا رنگین عکس بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ کتاب میں صرف اردو ترجمہ ہی دیا گیا ہے جبکہ مثنوی کا اصل فارسی متن بھی دے دیا جاتا تو بڑا کارآمد ہوتا۔ کتاب بہت عمدہ چھپی ہے۔ گٹ اپ بھی بہت خوبصورت ہے۔ اس کے لئے نصرت ناہید سکریٹری رلائبریرین کا شکر گزار ہونا چاہئے اور یہ امید رکھنی چاہئے کہ وہ لائبریری کے ذخیرۂ مخطوطات سے نادر اور بیش قیمت متون کی اشاعت میں یوں ہی دلچسپی دکھائیں گی۔

سید حسن عباس

کتاب : **نعتِ رسولِ خداؐ**

شاعر : ڈاکٹر محمد علی اثر

ناشر : نشاط پبلشرز، محبوب چوک حیدرآباد

سال اشاعت: ۲۰۰۰ء/۱۴۲۱ھ   مطبع : او-ایس-گرافکس حیدرآباد

ڈاکٹر محمد علی اثر دکنی ادب کے ماہر کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ وہ ایک شاعر، محقق، مرتب اور استاد کی حیثیت سے بھی اردو دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں نعت رسول خداؐ بھی ایک ہے۔ ۱۹۲ اشعار کی اس نعت رسول خداؐ سے اس کی تاریخ تصنیف ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء برآمد ہوتی ہے۔ حضورؐ کے اسم گرامی محمدؐ کے ۹۲ اعداد کی مناسبت سے اس میں ۹۲/اشعار ہیں اور یہ ایک طویل نعت ہے۔ جس میں شاعر نے حضور اکرمؐ کے تقریباً سو ناموں کو اشعار کی لڑیوں میں پرو دیا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے :

تمہیں ہو ہر اک جہاں کے سرور، درود تم پر سلام تم پر

تمہیں ہو آقا شفیع محشر، درود تم پر سلام تم پر

اثر نے مذکورہ نعت نہایت عقیدت میں ڈوب کر لکھی ہے۔ بحر بھی بہت مترنم ہے۔ پوری نعت کے مطالعے سے بخوبی واضح ہے کہ شاعر کے دل میں عشق رسولؐ کا بحر بیکراں موجزن ہے۔ کتاب صوری اور معنوی خوبیوں سے مزین ہے۔ اس کا ہدیہ صرف شاعر کے حق میں دعائے خیر ہے۔

سید حسن عباس

کتاب : لندن یاترا (سفر نامہ)   مصنف : ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

سن اشاعت: ۲۰۰۱ء   ناشر : نرالی دنیا پبلی کیشنز-نئی دہلی

مطبع : ایم-آر-آفسیٹ پرنٹرز-نئی دہلی   صفحات : ۱۱۲، قیمت : سو روپے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے لندن کے سفر کی تفصیلات 'لندن یاترا' میں شائع ہوئی ہیں۔ ہرگانوی صاحب کی شخصیت اور کارناموں سے شاید ہی کوئی ادب کا قاری ناواقفیت کا اظہار کر سکے۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب، صحافی، ناقد، محقق، مبصر، اور معلم ہیں۔ پھر ایسے معلم اور مبصر ہیں جو ہر وقت اردو دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تجربات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ خود بھی تجربے کرتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی تجربوں کے لئے اکساتے رہتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ساٹھ سے زائد کتابیں ان کے تیز گام قلم کی مرہون منت ہیں۔ 'لندن یاترا' لندن کے ان کے حالیہ سفر کی داستان ہے جو لندن میں منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس 'بیسویں صدی اور اردو زبان میں نئے امکانات' میں شرکت کی غرض سے انجام پایا۔ یہ سفر نامہ جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی خوبصورت طبع بھی ہوا ہے۔ ہرگانوی صاحب نے نہ صرف اس کانفرنس میں شرکت کی بلکہ اپنا پر مغز مقالہ بھی پڑھا۔ بین الاقوامی مشاعرے میں لندن کے شعرا و ادبا سے ملاقاتیں اور تبادلۂ خیال بھی کیا۔ ہرگانوی کا مقالہ کتاب میں صفحہ ۳۱ تا ۴۰ شامل ہے۔ قرۃ العین حیدر جیسی قد آور شخصیت کے ہاتھوں مولانا حالی ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ اس کانفرنس میں ہندوستان سے ان کے علاوہ جناب کالی داس گپتا

رضا بھی مدعو تھے۔ ہرگانوی نے اردو کے حوالے سے شرکا کے خیالات بھی قلمبند کیے ہیں۔ لندن سیر کے دوران وہاں کی قابل دید عمارتوں اور تاریخی مقامات کی منظر کشی بھی خوب کی ہے۔ کتاب میں تیرہ تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ البتہ جوتے والے قضیہ کو میرے خیال میں تفصیل سے پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ اس کی تفصیلات اس سے قبل مختلف اخبارات میں چھپ چکی تھیں ممکن ہے تفصیلات درج کرنے کے پیچھے ایک مقصد یہ کارفرما ہو کہ اس طرح اس اتفاقیہ واقعے کو محفوظ رکھا جائے۔ اسی طرح لندن یاترا کے صفحہ ۴۲ پر انہوں نے جو شعر لکھا ہے مجھے کچھ عجیب سا لگا کہ اتنا شایستہ آدمی ایسا شعر کیسے لکھ گیا؟ 'لندن یاترا' کا اسلوب نگارش بہت شگفتہ، رواں اور سادہ ہے۔ مصنف نے اردو سفرناموں کے ذخیرے میں ایک اور کتاب کا اضافہ کیا ہے اس کے لئے اسے مبارکباد دی جانی چاہیے۔

سید حسن عباس

کتاب : **انور شیخ بہ حیثیت افسانہ نگار**

مرتب : ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، سال اشاعت: ۲۰۰۰ء

ناشر : نرالی دنیا پبلی کیشنز، دریا گنج۔ نئی دہلی

مطبع : ایم۔آر۔آفسیٹ پرنٹرز۔ نئی دہلی، صفحات : ۱۳۶، قیمت : ایک سو پچاس روپے

مذکورہ کتاب انور شیخ کی افسانہ نگاری کے مختلف گوشوں اور خصوصیات کے جائزے پر مشتمل ہے جس میں درج ذیل مختلف عنوانات کے تحت مختلف اہل قلم کے سولہ مضامین شامل ہیں۔ انور شیخ کا افسانہ نواز اور بے نظیر/ پروفیسر عبدالواسع، انور شیخ کے افسانے: نفسیاتی جائزہ/ عشرت رومانی، انور شیخ کے افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی/ ڈاکٹر نسیم اختر، انور شیخ کے افسانوں میں خود کشید نئی شراب/ عطیہ خان، انور شیخ کے افسانے کی انفرادیت/ ڈاکٹر ابراہیم خلیل، انور شیخ کا افسانوی طریق کار/ ڈاکٹر مظفر حسن عالی، انور شیخ کا چمتکار ان کے افسانوں میں/ ڈاکٹر لطیف احمد سبحانی، انور شیخ کے افسانوں میں طنزیہ و مزاحیہ عناصر/ ڈاکٹر اسلم سیف، انور شیخ کا طنز و مزاح ان کے افسانوں میں/ ف۔س۔اعجاز، انور شیخ: افسانہ نگار کی حیثیت سے/ ساحر شیوی، انور شیخ کی افسانہ نگاری میں بیساختگی کا نور/ انور شمیم انور، انور شیخ کی افسانہ نگاری/ ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد، انور شیخ کے افسانوں کی فکری اساس/ ڈاکٹر محمد فاروق اعظم، انور شیخ کے افسانوں کا منظر نامہ/ ڈاکٹر عبدالغفار عزم، انور شیخ کے افسانوں میں زور بیان/ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی اور انور شیخ: ممتاز افسانہ نگار/ سیدہ نسرین نقاش۔

ان مضامین سے قبل 'حرف اول' کے عنوان سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے انور شیخ سے لیا ان کا انٹرویو درج کیا ہے۔ اس انٹرویو میں انور شیخ نے اپنی افسانہ نگاری سے متعلق باتیں کرتے ہوئے بڑے کام کی بات کہی ہے وہ فن کو مقصد کے تابع قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں "ممکن ہے کہ میرے افکار، قومی بھلائی کا سبب بن سکیں، یہی وہ مقصد ہے جس

نے مجھے شاعری اور افسانہ نگاری پر راغب کیا"۔ مجھے ان کی یہ بات پسند آئی۔ کیوں کہ میرے نزدیک ادب اور فن میں مقصدیت ضروری ہے۔

پروفیسر عبدالواسع کا مضمون 'انور شیخ کا افسانہ نواز اور بے نظیر' کتاب کا پہلا مضمون ہے جس میں پروفیسر واسع نے انور شیخ کے مذکورہ افسانے کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ پروفیسر واسع نے اپنے مضمون میں درج ذیل خوبصورت جملے بھی لکھے ہیں جن کا مطالعہ ادبی انبساط عطا کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو :

> "آج سیاست ہر جگہ دوڑ رہی ہے اور شعر و ادب کسی اکیڈمی، کسی یونیورسٹی کسی رسالے کے دفتر کے بوسیدہ اور سیلن زدہ کمروں میں امداد کی امید میں سانسیں لے رہا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ امداد کی امیدوں کی شعاعیں بھی سیاستدانوں کے چہرۂ پُرنور سے ہو کر آتی ہیں"۔

انور شیخ کا یہ افسانہ پاکستان میں شریف اور بے نظیر کے طرز حکومت پر کڑی تنقید ہے۔ جس طرح یہ حقیقت ہے کہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اسی طرح یہ بات بھی اہم ہے کہ انور شیخ کے افسانے سماجی مسائل کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے بے ساختہ جملوں میں جو شگفتگی اور شیفتگی ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ ان کا قلم بے باک ہے، ان کی سوچ مثبت ہے۔ وہ افسانوں کے وسیلے سے معاشرے کو گندگیوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی زبان بھی بہت سلجھی ہوئی ہے جس میں بلا کی کاٹ موجود ہے۔

مجموعی طور پر انور شیخ بہ حیثیت افسانہ نگار، میں برطانیہ اور ہند و پاک کے اہلِ قلم نے جس انداز سے انور شیخ کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا ہے وہ ایک مثبت انداز کہا جا سکتا ہے۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔ سرورق پر انور شیخ کی تصویر بھی ہے۔

سید حسن عباس

کتاب : **تکونیاں**، مرتب : ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ناشر : نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی، سال اشاعت: ۲۰۰۰ء

مطبع : ایم۔ آر۔ آفسیٹ۔ نئی دہلی، صفحات : ۱۱۲ قیمت : ایک سو روپے

یہ ۱۹ شعرا کی تکونیوں کے انتخاب کا اردو میں پہلا مجموعہ ہے۔ جس کے مرتب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ہیں۔

جن شعرا کی تکونیاں اور مختصر کوائف مع تصاویر اس کتاب میں شامل ہیں ان کے نام یہ ہیں ۔
انور شیخ۔ شارق جمال۔ صابر عظیم آبادی۔ ساحر شیوی۔ یونس احمر۔ عثمان قیصر۔ نذیر فتح پوری۔ رؤوف خیر۔ منزل لوہا کھیری۔ انور شمیم انور۔ ڈاکٹر نسیم اختر۔ عبداللہ ساگر۔ مشتاق شبنم۔ اشعر اورینوی۔ امان اللہ امان۔ شمس افتخاری۔ اشراق

حمزہ پوری۔ محسن باعثن حسرت اور خود کتاب کے مرتب ڈاکٹر ہرگانوی۔ ڈاکٹر ہرگانوی نے ''کچھ تکونی کے بارے میں'' کے عنوان سے اس صنف سخن کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس صنف سخن کے موجد انور شیخ ہیں۔ دیگر اصناف سخن کی طرح یہ صنف بھی انسانی جذبات کی ترجمان ہے۔ اس میں زمان ومکان کی کوئی قید نہیں۔ ہر طرح کے موضوعات اس کے وسیلے سے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اس کا محور تعمیر ہے۔ اس میں مدعی، مدعا علیہ اور منصف کا کردار ہوتا ہے۔ کسی مخصوص بحر کی کوئی پابندی نہیں۔ یہ تین بندوں کی نظم ہوتی ہے جس کے ہر بند کو چار شعروں تک محدود رکھا جاتا ہے یعنی مجموعی طور پر ۱۲ اشعار ہوتے ہیں۔ یہ ڈرامائی انداز کی حامل ہوتی ہے اسی سبب سے اسے ہندی الاصل سمجھا گیا ہے۔ اس صنف سخن کی اساس منطق اور سنجیدگی پر ہے۔ اس میں تاثیر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ باتوں میں سے کسی ایک سے بھی صرف نظر کیا گیا تو وہ تخلیق تکونی کے دائرے سے خارج سمجھی جائے گی۔ ایک مثال :

مٹی اور ریت

<u>مٹی (ریت سے)</u>

کرم، بخشش، عنایت، مہربانی
کی میں زندہ و تاباں داستاں ہوں
مری جود و سخا ہے جانِ عالم
جہاں میں جو بھی زندہ اس کی ماں ہوں
تو ویرانی و بدبختی کا مظہر
میں زرخیزی روحِ گلستاں ہوں
میں بے منت دوں ہر اک کو جو چاہے
مگر تیرا وظیفہ ''ہائے ہائے''

<u>ریت (مٹی سے)</u>

ہے تو مٹی تجھے سب ہی لتاڑیں
رہے جو زیرِ پا وہ آستاں ہے
تری چھاتی پہ ہر اک دندنائے
مرا سینہ چلن کا امتحاں
تجسس ہن نندوں میں کچھ کسی کو
سمجھتی ہوں یہ عظمت کا نشاں ہے
مرا دل چیر کر دیکھے زمانہ
کہ سونے تیل کا ہے یہ خزانہ

<u>مبصر</u>

ہے زرخیزی اگر چہ ایک نعمت
مگر اس میں نہاں رمز گدائی
جوان مردی کا لیکن یہ تقاضا
ہو جیون ایک انداز خدائی

ملے جو بن مشقت ایک احساں
مگر اس میں کہاں ہے پارسائی
بڑی لذت ہے اس کھیتی کے پھل میں
ہے جس کا راز پنہاں تیرے بل میں

بہر کیف اس صنف سخن سے بہت سے تعمیری کام لئے جا سکتے ہیں۔ شعرا کس حد تک اس صنف سے مانوس ہو پاتے ہیں یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ یہ کتاب نرالی دنیا پبلی کیشنز نے بہت عمدہ طریقے سے شائع کی ہے جو اس کا امتیاز بنتا جارہا ہے۔ سید حسن عباس

کتاب : **ماضی کے دھندلکے** (افسانوی مجموعہ)

مصنف : ایس۔شمس الحسن گیاوی، سال اشاعت: ۲۰۰۰ء

مطبع : لیبل آرٹ پریس پٹنہ، صفحات : ۶۴ قیمت : ۱۵/روپے

ایس۔شمس الحسن گیاوی کے ۱۳ افسانوں کا مجموعہ 'ماضی کے دھندلکے' سے قبل، 'سپنے بکھر گئے'، (ناولٹ) ۱۹۹۱ء میں اور 'غم لامحدود' (افسانوی مجموعہ) ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آچکے تھے۔ انہیں کہانی لکھنے کا بے حد شوق ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے موضوعات پر جو ہمارے ہی سماج کے ہیں، بڑی اچھی اچھی کہانیاں لکھتے رہے ہیں۔ سماج میں ہر طرح کے لوگ رہتے ہیں، شمس الحسن گیاوی نے ان لوگوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور آئے دن رونما ہونے والے ناخوشگوار واقعات پر اپنی کہانیوں کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ سیدھے سادے اور رواں اسلوب میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ ان کے کردار بھی ہمارے ہی سماج کے لوگ ہیں جن میں اچھے اور برے ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ وہ سماج کے مکروہ چہرے کو دکھانے میں اپنے ذہن وفکر سے خوب کام لینا جانتے ہیں۔ 'ماضی کے دھندلکے' کی کہانیاں بھی ایسی ہی ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے سماج میں کس قسم کے لوگ بستے ہیں۔ کتاب وطباعت بھی مناسب ہے۔ 'کچھ یادیں کچھ باتیں' کے عنوان سے سید عبدالاحد آزاد نے مصنف کے بارے میں اپنے تاثرات رقم کئے ہیں خود مصنف نے بھی دیباچہ میں بتایا ہے کہ یہ ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ امید ہے وہ اسی طرح اپنے سماج کے مسائل پر قلم اٹھاتے رہیں گے۔ سید حسن عباس

ماہنامہ : **زاویہ (ZAVIA)** جلد ۱ شمارہ ۱ (مارچ ۲۰۰۲ء)

مدیر : زبیر وارثی صفحات : ۱۶

پتا : KALLAREKROKEN 25, 22642 LUND, SWEDEN

زبیر وارثی کی ادارت میں سویڈن سے ایک نیا ماہنامہ جاری ہوا ہے۔ اس رسالے میں نثر اور شعری تخلیقات

کافی ہیں۔ جن میں کم وبیش تمام ادبی اصناف سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں۔ یہ رسالہ وہاں کی اردو اکیڈمی کے ترجمان کی حیثیت رکھتا ہے جس کی مجلس عاملہ میں زبیر وارثی، احمد فقیہ، مشتاق احمد، نصر ملک، رفیق خاں اور عبد الرؤوف صاحبان شامل ہیں۔ اس اکیڈمی کے اغراض ومقاصد درج ذیل ہیں۔

۱۔ اردو زبان میں بنیادی، ثانوی اور ایڈوانس کورس کا اہتمام

۲۔ اردو زبان میں تصنیف وتالیف کی نشر واشاعت کا اہتمام

۳۔ دوسری غیر ملکی زبانوں سے اردو دانوں کو روشناس کرانا

۴۔ جرائد واخبارات کا اجرا

۵۔ اردو لائبریری کا قیام اور

۶۔ علمی وادبی کانفرنس کا انعقاد

اداریہ سے پتا چلتا ہے کہ اراکین ادارہ بیرونی ممالک میں اردو کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں۔ اس شمارے کے مشمولات کی فہرست یہ ہے۔

نثری حصہ :

۱۔	بذلہ سنجی	ڈاکٹر سید حسن احمد زاہدی
۲۔	مردانگی	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
۳۔	نمبر	رضیہ حسن

شعری حصہ : ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر عبد القوی ضیا، ڈاکٹر حنیف ترین، انور شیخ، جمشید مسرور، سہیل احمد صدیقی، محمود عالم، اوم کرشن راحت، ڈاکٹر پنہاں، شاہد نعیم، ارشد اقبال آرش، سعید روشن، عتیق احمد عتیق، حیدر قریشی، ناصر نظامی، طاہر گلشن آبادی، شاہد جمیل، فراز حامدی، جوگندر پال، ایم۔ اے حق، ڈاکٹر نوشاد عالم کی تخلیقات پر مشتمل ہے۔

تخلیقات میں جدید شعری اصناف سے تعلق رکھنے والی چیزیں زیادہ ہیں۔ مثلاً ہائیکو، کہہ مکرنیاں، آزاد غزل، دوہے، ماہیے، شخصی ماہیے، دوہا غزل، کہہ من وغیرہ۔ شعری حصہ زیادہ وقیع ہے۔ رسالہ کی طباعت اور گٹ اپ دیدہ زیب ہے۔

پورے رسالے کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان وادب برصغیر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی کافی مقبول ہے اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ واقعی ایک نیک شگون ہے۔ خود ہمارے ملک میں ادبی رسائل کا اجرا ایک مسئلہ بنا ہوا ہے جبکہ بیرونی ممالک میں اردو کے بہی خواہوں کی جانب سے اردو کے اچھے اور معیاری رسائل وجرائد شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو بیرونی ممالک میں کتنی مقبول ہے۔ امید ہے اس ماہنامے کی پذیرائی خاطر خواہ ہوگی۔

نادم بلخی

کتاب : منتخبات رباعیات رضا

شاعر : سید جلال الدین محمد مقصود عالم شاہی رضوی متخلص بہ رضاؔ

مرتب : پروفیسر نثار احمد انصاری، سال اشاعت : اگست ۱۹۹۹ء

مطبع : شیوکرپا آفسیٹ، احمد آباد صفحات : ۱۰۹

گجرات زمانۂ قدیم سے ہی علما و فضلا اور شعرا و ادبا کا مسکن رہا ہے۔ اس سرزمین نے علم و ادب کی جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان کے ذکرے سے تواریخ و تذکرے کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ سید جلال کے والد سید محمد مقبول عالم متخلص بہ جلالی (م ۱۰۴۵ھ) ایک عظیم المرتبت عالم و زاہد اور فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کا دیوان، 'دیوان جلالی' کے نام سے درگاہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اور ریسرچ سنٹر احمد آباد سے ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی صاحب کے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ جہانگیر نے احمد آباد کے سفر کے دوران سید محمد مقبول عالم سے ملاقات اور ان سے قرآن کریم کا سلیس فارسی ترجمہ کرنے کی درخواست کی تھی۔ انھوں نے یہ کام انجام بھی دیا تھا جسے جہانگیر نے بہت پسند کیا تھا۔ ان کے بیٹے سید جلال بھی جہانگیر سے ملے تھے۔ وہ ان دونوں بزرگوں کی بڑی قدر کرتا تھا۔ سید جلال بھی اپنے والد ہی کی طرح عالم و فاضل اور قابل احترام شخصیت تھے۔ وہ شاہجہاں کے عہد میں شش ہزاری منصب دار اور صدر الصدور کے عظیم مرتبے پر فائز تھے۔ وہ بھی والد کی طرح صاحب دیوان تھے اور رضاؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کے دیوان کے ایک عمدہ نسخے مخزونہ سالار جنگ حیدر آباد کا تعارف پروفیسر نذیر احمد صاحب نے کرایا ہے۔ یہ نسخہ قصائد، مقطعات، غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے لکھا ہے کہ 'رضا کے دیوان کا معتد بہ حصہ رباعیات کے لئے مخصوص ہے......اور تقریباً ایک ہزار رباعیاں ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رباعی گو شعرا میں وہ مخصوص مقام کے مالک ہیں۔ اس صنف میں ان کے افکار کی بلندی و ندرت، دلکش انداز بیان، برجستہ تشبیہات و استعارات پوری طرح نمایاں ہیں...... میرے نزدیک ان کی غزلوں پر ان کی رباعیات کو تفوق حاصل ہے'، (صدر الصدور سید جلال بخاری رضوی عہد شاہ جہانی کے صاحب دیوان منصب دار)۔

زیر تبصرہ کتاب 'رباعیات رضا' میں ۱۱۱ رباعیاں ہیں جنھیں پروفیسر نثار احمد انصاری نے اپنے سلیقے سے انتخاب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ رباعیات اخلاقی تعلیمات کے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں جو رضاؔ کے مزاج و طبیعت کی غماز ہونے کے ساتھ انسان کو اعلیٰ اخلاقی صفات سے مزین کرنے کی تعلیمات دیتی ہیں۔ ان میں رز اعرفان و اخلاق ہی نہیں بلکہ شعری انبساط اور دلکشی بھی پائی جاتی ہے۔

کتاب بہت صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔ اگر ان رباعیوں کے ساتھ ان کا اردو ترجمہ بھی شائع کر دیا جاتا تو اس کی افادیت عام ہو سکتی تھی۔ مرتب نے اپنے مقدمہ میں بہت تفصیل سے شاعر کے حالات اور کمالات پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ رضا کی فارسی رباعیات کو گجرات کے درسی نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ یہی ضرورت اس کی اشاعت کا سبب بنی ہے۔

سید حسن عباس

رسالہ : سہ ماہی **لوح و قلم**، پھلواری شریف

مدیر : محمد منہاج الدین مجیبی

مقام اشاعت : دار العلوم مجیبیہ خانقاہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔ ۸۰۱۵۰۵

قیمت فی شمارہ : ۸/روپے صفحات : ۳۲، زر سالانہ : ۳۰/روپے

دار العلوم مجیبیہ پھلواری شریف سے 'لوح و قلم' کے نام سے ایک نیا سہ ماہی مجلہ نکلنا شروع ہوا ہے۔ یہ اس کا پہلا شمارہ ہے جو جنوری۔ مارچ ۲۰۰۲ء کا شمارہ ہے۔ ادارۂ تحریر میں محمد آیت اللہ قادری، مولانا خواجہ عبد الباری اور محمد مقصود عالم راہی کے نام شامل ہیں۔ یہ ایک دینی، علمی، ادبی اور اصلاحی مجلہ ہے۔ اس کے اجرا کا مقصد علمی و اصلاحی ذوق پیدا کرنا اور صالح لٹریچر کی فراہمی ہے۔ واضح رہے کہ پھلواری شریف سے سب سے پہلا رسالہ 'معارف' نوے سال قبل نکلا تھا۔ معارف اعظم گڑھ اس کے بعد کا رسالہ ہے۔ پھر 'المجیب' کے نام سے ایک علمی ادبی اور دینی ماہنامہ نکلنا شروع ہوا۔ المجیب میں طویل عرصے تک علم و ادب اور اسلامی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ بد قسمتی سے وہ بھی نامساعد حالات کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔ اب اس کی تجدید 'لوح و قلم' سے کی جا رہی ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ دراز رہے۔

زیر نظر شمارے میں اسلامی موضوعات پر مضامین کے ساتھ شعر و ادب کو بھی جگہ دی گئی ہے اور درج ذیل مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

۱۔ اخلاص نیت / حضرت امان المستجیر قدس سرہ ۲۔ حضرت سلطان المشائخ اور ان کی تعلیمات / مولانا شاہ محمد آیت اللہ قادری ۳۔ فریضۂ حج وحدت امت کا داعی و مظہر / مولانا شاہ بلال احمد قادری ۴۔ پھلواری میں عہد غالب کی اردو نثر / مولانا شاہ محمد آیت اللہ قادری۔

ادبیات کے تحت تخمیس بر نعت قدسی / ڈاکٹر شاہ فتح اللہ قادری اور نعت شریف از مہر درخشاں امیمہ۔ علاوہ ازیں کوائف و حالات کے تحت مقامی خبریں درج کی گئی ہیں۔

رسالہ بہت صاف ستھرا اور واقعی صالح لٹریچر کا حامل ہے۔ امید ہے اہل ذوق و ادب اس کی پذیرائی میں کوتاہی نہ کریں گے۔

سید حسن عباس

کتاب : **توضیحات کلیات ادویہ**

مصنف : ڈاکٹر عبداللطیف

ناشر : ابن سینا اکاڈمی آف میڈیول میڈیسن اینڈ سائنسز۔ تجارہ ہاؤس۔ دودھ پور۔ علی گڑھ

سال اشاعت: ۲۰۰۲، صفحات : ۳۰۰، قیمت : ۱۷۵روپے

علم طب کا شمار قدیم علوم وفنون میں ہوتا ہے۔ جس طرح انسانی زندگی کے لئے غذا اہمیت رکھتی ہے اسی طرح صحت کامل کے لئے دواؤں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بدقسمتی سے ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کے عمل دخل نے جہاں ہماری کئی قدیم میراثوں کی بنیادیں کھوکھلی کرڈالیں وہیں اس علم وفن (یعنی طب قدیم) کی جگہ ایلوپیتھی کو دے دی گئی۔ علم طب کے موضوع پر فارسی اور عربی زبانوں میں بے شمار اہم کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ مذکورہ زبانوں کا رواج کم ہونے پر بیشتر کتابوں کے اردو تراجم بھی کئے جانے لگے اس طرح ان کا دائرہ کار بڑھا۔ بیسویں صدی میں ہندوستان میں حکیم عبد الحمید صاحب اور پاکستان میں ان کے بھائی حکیم محمد سعید صاحب نے اپنی مساعی سے طب قدیم کو نئی زندگی عطا کی ہے۔

توضیحات کلیات ادویہ، ڈاکٹر عبداللطیف (سینئر لکچرر حکیم اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ) کی یہ تازہ کاوش بی-یو-ایم-ایس اور ایم-ڈی کے علم الادویہ کے طلبا کے لئے معرض وجود میں آئی ہے جو سی-آئی-ایم کے مجوزہ نصاب کے مطابق ہے۔ یہ کتاب ۱۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کا مقدمہ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان نے لکھا ہے۔ وہ کتاب کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''اس کی بعض خصوصیات باعث امتیاز اور جاذب نظر ہیں۔ کلیات ادویہ کی کتابوں میں عام طور پر غذا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بالمادہ اثر کرتی ہے، لیکن غذائی مواد کے بارے میں تفصیلات نہیں پیش کی جاتی ہے۔ پیش نظر کتاب میں غذائی مادوں سے بحث کرتے ہوئے لحمیات، تحمیات، نشاستہ، معدنی نمکیات اور حیاتین پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوا و غذا کی تعریف پر مفصل گفتگو کی گئی ہے...... یہ ایک نیا اسلوب ہے اس سے طلبا کو منظم شکل میں دواؤں کے مطالعہ میں مدد ملے گی''۔

مجموعی طور پر کتاب بہت خوبصورت اور صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔ امید ہے کہ مصنف کی یہ کوشش علم الادویہ کے طلبا اور اساتذہ دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

سید حسن عباس

کتاب : **ہندوستان کا جدید تعلیمی انقلاب اور مسلم اقلیت** (تعلیمی مضامین کا مجموعہ)

مصنف : پروفیسر احمد سجاد، ناشر : مرکز ادب وسائنس رانچی

سال اشاعت : ۲۰۰۰ء،   صفحات : ۹۰،   قیمت : ۶۵/روپے

ملنے کا پتا : مرکز ادب وسائنس، طارق منزل، بریاتو ہاؤسنگ کالونی، رانچی-۹

پروفیسر احمد سجاد کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ آپ اردو کے استاد اور کئی کتابوں کے مصنف ومولف ہیں۔ آپ کے بیش قیمت مقالے ملک اور بیرون ملک کے علمی ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مرکز ادب وسائنس کے ذریعے قوم کے نوجوانوں کو غیر معمولی ترقیات کی راہوں پر گامزن کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ فکر دراصل پروفیسر احمد سجاد کی ہی تھی جو عملی طور پر اپنی کارکردگی سے نئی نسل میں ذوق ادب پیدا کرنے کے ساتھ انہیں فنی تربیت دینے کا کام بھی کیا جارہا ہے۔ زیر نظر کتاب میں درج ذیل مضامین شامل کئے گئے ہیں :

۱۔ ہندوستان کا جدید تعلیمی انقلاب اور مسلم اقلیت۔ ۲۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی کا لائحہ عمل

۳۔ اردو ذریعہ تعلیم: صورت حال، چیلنجز اور ترقیاتی نشانے۔ ۴۔ ملت کو درپیش چیلنجز

۵۔ مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی صورت حال۔ چند اصلاحی پہلو۔

۶۔ مسلمانان بہار کے تعلیمی مسائل اور ان کا حل

۷۔ مسلم معاشرت کی تعمیر میں ٹکنوکریٹ کا رول۔

۸۔ اردو دنیا کے لئے اکیسویں صدی کے تقاضے اور مطالبات

۹۔ اردو میں کمپیوٹر اور انٹرنٹ کے درسی ونصابی مسائل پر ورک شاپ سیمینار کی ایک اہم تجویز

۱۰۔ مرکز ادب وسائنس ایک تعارف

مذکورہ مضامین مختلف مواقع پر لکھے گئے ہیں اس سلسلے میں پروفیسر احمد سجاد پیش گفتار میں لکھتے ہیں: ''راقم الحروف نے مختلف تعلیمی اداروں اور سیمناروں نیز مدیران رسائل کی فرمائش پر ادھر چند برسوں میں جن تعلیمی موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے، ان میں سے بعض مضامین کو 'ہندوستان کا جدید تعلیمی انقلاب اور مسلم اقلیت' کے زیر عنوان جمع کر دیا گیا ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ موجودہ ملکی وعالمی تناظر میں ہندوستان کی مسلم اقلیت کو جن تعلیمی چیلنجز کا سامنا ہے ان کی روشنی میں عملی حقائق کو پیش کیا جائے۔ اطلاعاتی ٹکنالوجی اور اکیسویں صدی کے تقاضوں پر اظہار خیال کے علاوہ بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لئے بعض تجاویز کو بھی پیش کیا گیا ہے''۔

کتاب صاف ستھری چھپی ہے۔ اس کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مسلم اقلیت کو جن مسائل کا سامنا ہے ان سے واقفیت کے بغیر اس کا سدباب ممکن نہیں ہے۔

سید حسن عباس

کتاب : تعلیم اور روزگار کے نئے مواقع (کیریر گائیڈنس پر مشتمل مضامین کا مجموعہ)
تصنیف : طارق سجاد
ناشر : مرکز ادب و سائنس، رانچی
سال اشاعت : نومبر ۲۰۰۰ء
صفحات : ۱۰۹ قیمت : ۱۲۵؍روپے
ملنے کا پتا : مرکز ادب و سائنس۔ طارق منزل، بریاتو ہاؤسنگ کالونی، رانچی-۹

طارق سجاد صاحب انجینئر ہیں لیکن ان کے دل میں قوم و ملت کا درد ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان زندگی کے مسابقات میں دوسروں سے پیچھے رہنے کے بجائے پڑھ لکھ کر ایسا کچھ کریں جس سے انہیں خوشحال زندگی حاصل ہو سکے۔ اسی مقصد کے تحت وہ نوجوانوں کی راہنمائی کے لئے خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں اور مختلف موضوعات پر نہایت معلوماتی تحریریں شائع کرتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں درج ذیل مضامین ہیں جن کے مطالعے سے ہمارے نوجوان تعلیم اور روزگار کے میدانوں میں ان کی اہمیت اور مواقع سے باخبر ہو سکتے ہیں۔

۱۔ جدید تعلیم اور روزگار کے نئے مواقع۔ ۲۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی اور اس کا منجمنٹ کورس
۳۔ نیشنل ٹیلنٹ سرچ امتحان اور اس کی اہمیت۔ ۴۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنس کورس کی اہمیت
۵۔ اسکالسٹک ایٹی چیوٹ ٹسٹ۔ ۶۔ ٹافل ٹسٹ کیا ہے۔ ۷۔ کمپنی سکریٹریٹ کورس، اہمیت اور افادیت
۸۔ حوصلہ مند نوجوانوں کے لئے ایک پرکشش چیلنج محکمہ طیرانیات۔
۹۔ سول سروسز کی تیاری کیسے کریں؟ ۱۰۔ انجینئرنگ کیریر طلبا کے لئے ایک چیلنج
۱۱۔ کمپیوٹر وسیلۂ روزگار یا استحصال۔ ۱۲۔ میڈیکل کالجوں کے مسابقتی امتحانات
۱۳۔ فوٹ ویر ٹکنالوجی میں کیریر۔ ۱۴۔ پلاسٹک ٹکنالوجی میں کیریر۔
۱۵۔ برآمدی (EXPORT) میں کیریر۔ ۱۶۔ صحافت اور ابلاغ عامہ کے میدان میں کیریر
۱۷۔ کیٹ (CAT) کی تیاری کیسے کریں؟

پروفیسر سید حامد صاحب نے اس مجموعہ کا پیش لفظ لکھا ہے اور طارق سجاد صاحب کی کوششوں کو کھل کر سراہا ہے۔ مضامین کا اسلوب سادہ اور رواں ہے عموماً اس قسم کے مضامین میں غیر مانوس اصطلاحات کا استعمال ہوتا ہے جس سے قاری الجھ کر رہ جاتا ہے۔ واقعی طارق صاحب لائق مبارکباد ہیں جنہوں نے ملک کے نوجوانوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا اور پیشہ ورانہ درسیات کے ساتھ مختلف میدانوں میں موجود امکانات پر بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کا مطالعہ نوجوانوں کے لئے مفید ہوگا۔

سید حسن عباس

کتاب : مختار نامہ (پروفیسر مختار الدین احمد کے مقالات وتصانیف کا موضوعاتی ووضاحتی اشاریہ)

مرتبین : ڈاکٹر عطا خورشید، مہر الٰہی ندیم (علیگ)

ناشر : علی گڑھ ہیریٹیج پبلی کیشنز، علی گڑھ اشاعت : ۲۰۰۲ء

مطبع : بابا پرنٹرس، علی گڑھ صفحات : ۱۹۲

پروفیسر مختار الدین احمد اپنی علمی خدمات کے سبب دنیائے اُردو میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ وہ نصف صدی سے زائد سے علم وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے علمی کارناموں کی فہرست پر مشتمل ہے جسے ڈاکٹر عطا خورشید اور مہر الٰہی ندیم نے نہایت عرق ریزی سے ترتیب دیا ہے۔ ''حرفے چند'' کے عنوان سے پروفیسر نذیر احمد نے کتاب کا مقدمہ لکھا ہے۔ مرتبین نے مختار صاحب کی سوانح پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں ان کی یادداشتوں سے بھی خوب استفادہ کیا ہے۔

اشاریہ کے بارے میں مرتبین نے وضاحت کی ہے کہ: ''اشاریے کے مقالات دو ترتیب پر مشتمل ہیں۔ اول موضوعاتی، دوم انضباطی۔ موضوعاتی ترتیب میں پہلا موضوع خود مختار الدین احمد صاحب کی ذات ہے جس میں ان کی خود نوشت کے علاوہ ان کے سفرنامے، روزنامچے اور مکتوبات بھی شامل ہیں۔ اس موضوع کے تحت وہ مضامین بھی آتے ہیں جن میں انھوں نے اپنے احباب کا ذکر کیا ہے۔ مکتوبات کے ذیل میں وہ مکتوبات بھی شامل ہیں جن میں کسی رسالے اور اس کے مضامین پر تنقید کی گئی ہے۔ دوسرا موضوع ''شخصیات'' ہے۔ اس ذیل میں وہ مضامین رکھے گئے ہیں جو مختار صاحب نے اپنے ہم عصروں پر تحریر کئے ہیں۔ ان کے علاوہ کتابوں پر کیے گئے تبصرے، کتابوں پر تعارف (تقریظ)، مشاہیر کے خطوط، مختار صاحب کے وہ خطوط بھی جس میں کسی مشاہیر کا ذکر ہے، شامل کیے گئے ہیں''۔ اس کتاب کے مطالعے سے ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے علمی اور تحقیقی کارناموں سے پوری واقفیت ہوتی ہے۔ مرتبین نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔

سید حسن عباس

تسلیمات

(مکتوب نگاروں کے خیال سے ادارہ 'ادراک' گوپال پور کا اتفاق یا اختلاف محفوظ ہے)

☆ پروفیسر نذیر احمد۔ علی گڑھ

ادراک کا دوسرا شمارہ مل گیا۔ اس کے سارے مضامین پڑھ لئے۔ پہلے شمارے سے بہت بہتر ہے۔ ملک کو اس طرح کے رسالے کی سخت ضرورت ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپ اپنے کام میں لگیں، رسالہ نکالنے کا خیال ترک کر دیں لیکن اس شمارے کو دیکھنے کے بعد میں نے اپنا خیال بدل دیا۔ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے رسالہ نکالنا شروع کیا۔ ملک میں تحقیقی رسالے کی بڑی کمی ہے۔ انشاء اللہ آپ کے رسالے سے یہ کمی کسی حد تک پوری ہو سکے گی۔ ضرورت ہے اہل علم حضرات اس طرف متوجہ ہوں۔ میں بھی اس مجلّے کے لئے لکھوں گا اور اپنے دوستوں کو بھی متوجہ کروں گا۔ اگر چہ سچ بات یہ ہے کہ اب علم کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹتی جا رہی ہے اور اچھے خاصے لوگ علمی و تحقیقی مقالات لکھنے سے گھبراتے ہیں۔

عارف نوشاہی صاحب کا مقالہ 'مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف' نظر سے گزرا۔ یہ فارسی میں بھی چھپ چکا ہے جو عارف صاحب کے توسط سے مجھے مل گیا تھا۔ اس کو غور سے پڑھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ نسخہ حاصل ہو گیا لیکن اس سے کہیں اچھا نسخہ برٹش میوزیم کا ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں ہماری یونیورسٹی میں اس کا عکس موجود ہے اور اس سے میں نے کافی استفادہ کیا ہے۔ عارف صاحب کا جب مضمون پڑھا تو میں نے ایک مقالہ اردو میں لکھ کر شائع کیا لیکن یاد نہیں آتا کہ وہ کہاں شائع ہوا۔ لیکن مجموعۂ لطایف کے اس مقالے کے ساتھ میری یادداشت کو بھی پڑھنا مفید ہوگا مگر مجھے یاد نہیں کہ وہ کہاں شائع ہوا۔ حافظہ ساتھ نہیں دے رہا ہے۔

پروفیسر مختار الدین صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ادراک کے بارے میں دریافت کر رہے تھے مگر اس وقت مجلّہ شائع نہیں ہوا تھا۔ اب مل گیا ہے۔ مجلّے کی تعریف کر رہے تھے۔ ایران سے مکاتیب سنائی کا نسخہ آ گیا ہے۔ مزید جلدوں کا انتظار ہے۔

آپ میرے خطوط (بنام ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی) کے چھاپنے کا ارادہ کر رہے ہیں بہتر ہوگا کہ آپ پہلے ڈاکٹر ڈیسائی کے خط چھاپیں۔ میں کچھ خط رجسٹرڈ ڈاک سے روانہ کر رہا ہوں۔

☆ پروفیسر مختار الدین احمد۔ علی گڑھ

رسالہ ۸ر مارچ کو مل گیا تھا۔ اس دن نہیں تو دوسرے دن رسید بھیجی ہوگی۔ ظاہراً خط ڈاک میں ضائع ہوا۔ یہ شمارہ آپ نے بہت اچھا مرتب کیا ہے اور پہلے شمارے سے کہیں بہتر ہے۔ توقع ہے کہ ہر شمارہ اسی طرح ترقی کرتا رہے گا۔

متعدد مضامین قابل مطالعہ ہیں: اثاثۂ دلگیر (کالی داس گپتا)، فضل حسین مظفر پوری (شاہد اقبال)، مجموعۂ لطائف (عارف نوشاہی)، کتب خانہ مجیبیہ پھلواری شریف (بلال احمد قادری)، وزیر علی عبرتی (سید حسن عباس)، واسوخت عشقی بھی دیکھا۔ نسبت کا کوئی اور مستند حوالہ مل جائے تو خوب ہو۔ مختصر طور پر لکھ سکتا ہوں کہ شمارۂ دوم نے ترقی کی ہے۔ آپ نے تبصرے بہت اچھے لکھے ہیں، خاص کر پہلا تبصرہ مجھے پسند آیا جو آپ نے محنت اور توجہ سے لکھا ہے۔

☆ پروفیسر وارث کرمانی — دیوا شریف

رسالہ آپ نے خوب نکالا ہے۔ شاعری اور تحقیق دونوں کا معیار اچھا ہے۔ فارسی زبان وادب کی طرف آپ کی توجہ خاص طور سے قابل تعریف اور ہم تشنگان بادۂ شیراز کے لیے تقویت اور توانائی کا سامان۔ خدا کرے یہ رسالہ دیر تک قائم رہے جبھی کچھ بات بنتی ہے۔ میں تعاون کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔

☆ پروفیسر عبدالقوی دسنوی۔ بھوپال

بلاشبہ رسالہ اچھا ہے۔ اسے اور زیادہ اچھا اور مفید بنانے کی کوشش کریں۔

☆ پروفیسر نیّر مسعود۔ لکھنو

اوراک ۲ مل گیا۔ یہ شمارہ پہلے سے بھی بہتر ہے۔ فردوسی عظیم آبادی کے مرثیے پر اظہار خیال شاید پھر کبھی کر سکوں۔ مرثیہ اچھا ہے اور رباعی کی بحر کو اس میں خوب نبھایا گیا ہے۔

☆ فضا ابن فیضی۔ مونا تھ بھنجن

اوراک دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ صوری ومعنوی ہر دو اعتبار سے خوبصورت، دل نشیں، متنوع اور بھرپور۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے۔

☆ پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ جموں

اوراک کا شمارہ نمبر ۲ موصول ہوا ابھی ایک نظر ہی ڈالی ہے۔ پانو کی ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس وقت لکھنے پڑھنے کا شغل بند ہے جب تک پانو سے گھٹنے تک پھیلا ہوا پلاستر اتر نہ جائے۔ سر دست تو ڈاکٹروں نے پانچ ہفتے تک Bed Rest کا حکم دیا ہے۔ لیکن یہ پانچ ہفتے ختم ہونے ہی میں نہیں آرہے ہیں۔ پڑھنے کا کام تو بستر پر بھی جاری رہ سکتا ہے لیکن لکھنے کے لئے اٹھ کر اپنے ڈیسک پر آنا ضروری ہے۔ آرام کرسی پر یا بستر پر بیٹھ کر لکھنے کی عادت ہی نہیں ہے۔

آزاد بلگرامی اور عشقی عظیم آبادی کا فارسی کلام پڑھا۔ جی خوش ہوگیا۔ محض اس لئے نہیں کہ کلام بہت عمدہ اور معیاری ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اردو کے ایک جریدے میں فارسی کلام اور وہ بھی چار صفحات پر مشتمل ایک مدت کے بعد دیکھا ہے۔ اب تو پاکستان کے اردو جرائد میں بھی فارسی کلام نظر نہیں آتا۔ جب میں طالب علم تھا، یونیورسٹی اور کالج سے پہلے اسکول میں تو ہم طلبہ کے دل ودماغ میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ فارسی سے بیگانہ رہوگے تو اردو نہیں سیکھ سکوگے۔ لیکن اب زمانہ بدل

گیا ہے۔ بہر طور ادراک نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ :

ہنوز آن ابر رحمت دُر فشان است

خُم وخمخانہ بامُہر ونشان است

پروفیسر ولی الحق انصاری کی 'دعوت انبہ' بھی خوب ہے، بہت خوب اور ظفر کمالی کا مسدس 'متشاعر' بھی ماورائے تعریف ہے۔

☆ پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ دہلی

ادراک شمارہ ۲ ملا۔ اس سے پہلے مجھے کوئی شمارہ نہیں ملا۔ ولی (گجراتی) کے مزار کے مسمار کئے جانے کا سنا ہوگا، سخت دکھ ہوا۔ انڈین اکسپریس اور جن ستا میں میرا ردِ عمل نظر سے گزرا ہوگا۔ گجرات کے حالات ہمارے قومی دیوالیہ پن کا ثبوت ہیں۔ نصف صدی کے بعد بھی انسان کا خون اسی طرح ارزاں ہے جیسے بٹوارے کے وقت تھا۔ افسوس ہے کہ کھائی بڑھتی جا رہی ہے۔ خدا کرے ولی کے مزار کو بحال کرنے کی سرکار کو عقل آئے۔ کیا اب ہم شاعر کو بھی اپنے پاگل پن کا نشانہ بنائیں گے۔ رسالہ کو جاری رکھئے اور اس کی علمی شان بڑھاتے رہیے۔

☆ باقر مہدی۔ ممبئی

اس بار آپ کا پرچہ غور سے پڑھا۔ ادراک کے لئے شکریہ۔ اب اردو میں ایسے پرچے نہیں نکلتے ہیں۔ اردو زبان وادب زوال کی آخری منزل میں ہے۔ آپ نے بہار کے گمنام شعرا کا کلام شائع کر کے بڑی ہمت سے کام لیا ہے۔ یہ پرچہ عام قاری کے لئے نہیں ہے۔

کون فارسی کی غزلیں پڑھے گا؟ بیکس پر مضمون غنیمت ہے۔ میں اپنی ایک غزل، ایک نظم اور ایک نوحہ بھیج رہا ہوں۔ یہ نوحہ میں نے ۸ سال پہلے کہا تھا۔ پروفیسر نیر مسعود کی (فرمائش پر)، مدت سے قومی آواز میں شائع کرانا چاہتا تھا مگر نہ شائع ہو سکا۔ آج تک یہ نوحہ کسی پرچہ میں شائع نہیں ہوا۔ پتا نہیں آپ بھی شائع کرتے ہیں یا نہیں؟

☆ پروفیسر شریف حسین قاسمی۔ دہلی

ادراک کا دوسرا شمارہ ملا۔ پہلے سے محروم رہا؟ آپ نے جن دو مضامین کا ذکر کیا تھا وہ میں نے پڑھ لئے۔ عارف نوشاہی صاحب کا مضمون بہت معلوماتی ہے۔ یہ بیاض میں نے دیکھی ہے۔ بڑی اہم ہے۔ آپ نے بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ عبرتی پر آپ کا مضمون اہم ہے۔

رسالہ نکالنا اور اسے جاری رکھنا بہت جان جوکھوں کا کام ہے اور اگر رسالہ خالص ادبی نوعیت کا ہو تو کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسرے شمارے کے تمام مضامین اہم ہیں۔ آپ نے جس سلیقے سے انہیں مرتب کیا ہے وہ قابل تحسین

ہے۔ جو عنوانات آپ نے دیئے ہیں وہ بھی بالکل نئے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ اپنی کوششوں سے یہ رسالہ جاری رکھیں گے۔ ہندوستان سے اردو میں وقیع رسالوں میں آپ کا رسالہ اضافہ ہے۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

☆ ڈاکٹر نور السعید اختر۔ ممبئی

اچانک تمہاری یادوں کا بیش بہا تحفہ 'ادراک' کی شکل میں باصرہ نواز ہوا۔ بھائی شکریہ اور مزید شکریہ۔ ادراک پہلی ہی نظر میں دل میں اتر گیا۔ حسن ترتیب اور طباعت قابلِ تعریف ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ اس کا پہلا شمارہ ضرور بھیج دیں تاکہ زرِ سالانہ ارسال کرسکوں۔ مکمل رسالہ پڑھنے کے بعد اپنی حقیر تفصیلی رائے سے آگاہ کروں گا۔ چوتھے شمارے میں میرے مقالے کے لئے گنجائش رکھنا۔ ایک نئی چیز لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔

☆ پروفیسر احمد سجاد۔ رانچی

ادراک کا دوسرا شمارہ ۲ ملا۔ آپ کی محنت، تحقیقی و تخلیقی کاوش نظر اور توازن فکری نے اس شمارے کو بھی خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ ان دنوں لایعنی تجریدی بحثوں اور برساتی مینڈک کی طرح من مانی صنفوں کی بھرمار کے ماحول میں آپ نے مخطوطات، کتب خانہ مجیبیہ، احمد جمال پاشا، واسوخت اور منظوم و منثور تخلیقات میں سید حیات حسین وفا طباطبائی، باقر مہدی، نادم بلخی، م۔ق خان، فاروق راہب اور مبین الدین قریشی کی تخلیقات کے علاوہ چھیڑ خوباں سے، ہمعصر قلمکار اور پیمانے کے ذریعے جو نگار خانہ ادب سجایا ہے اس کی معنویت اور خیال انگیزی قابلِ رشک ہے۔ دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ توقع ہے کہ آپ اس معیار کو برقرار ہی نہیں بلکہ فزوں تر کرتے رہیں گے۔

☆ مجتبیٰ حسین۔ دہلی

ادراک کے دو شمارے ملے۔ اس عنایت کے لئے ممنون ہوں۔ رسالہ بہت اچھا اور معیاری ہے۔ اچھے اور معیاری رسائل کو دیکھ کر ڈر ہوتا ہے کہ کہیں یہ بند نہ ہو جائیں۔ احمد جمال پاشا کے بارے میں ظفر کمالی اور مہدی افادی کے بارے میں امام مرتضیٰ نقوی کے مضامین بہت پسند آئے۔ افسانے اور شعری نگارشات بھی بہت اچھی ہیں۔

رضا نقوی واہی کے گذر جانے کا بے حد افسوس ہے۔ وہ میرے کرم فرما تھے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ 'ادراک' ان کے بارے میں ایک وقیع اور جامع نمبر شائع کرے۔

☆ بھگوان داس اعجاز۔ دہلی

ادراک جیسا ضخیم پرچہ نکال کر آپ نے بھی دوستوں کو چونکا دیا۔ بہار جیسی سنگلاخ زمین سے اردو کی آبیاری اور اس مہنگائی کے دور میں بڑی حوصلہ مندی کا کام ہے جس کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ پرچہ کی ورق گردانی کی۔ جی خوش ہو

گیا۔ دوست احباب کی غزلیات کے چند اشعار بہتر لگے۔ نظمیں سبھی اچھی ہیں۔ طویل نظموں نے بھی بور نہیں ہونے دیا۔ خاص کر ولی الحق انصاری کی 'دعوت انبؑ' ظفر کمالی کی 'تشاعر' سید حیات حسین وفا کی 'بیتر بات' اور 'خانہ بدوش' کے علاوہ فردوسی عظیم آبادی کا بحر رباعی میں مرثیہ قابل تعریف ہے۔ مضامین معلوماتی ہیں۔ ابھی سبھی نہیں پڑھے۔ ڈاکٹر عبرت بہرائچی کی 'جگر مراد آبادی سے ملاقات' بھی دل چسپ و معلومات افزا ہے۔ دیگر مشمولات بھی لائق مطالعہ ہیں۔

☆ شاہد کلیم۔ آرہ

ادراک کا شمارہ ۲ موصول ہوا۔ پچھلے ایک ماہ سے بیمار ہوں۔ اس لئے لکھنے پڑھنے کا کام نہیں ہو رہا ہے۔ ویسے ادراک الٹ پلٹ کر جستہ جستہ دیکھا۔ اسے دیکھنے کے بعد اسلوب احمد انصاری کا رسالہ 'نقد و نظر' یاد آ گیا۔ آپ نے تمام رسالوں سے مختلف کرنے کی کوشش کی ہے خاص طور پر مضامین کا حصہ دوسرے رسالوں سے الگ۔ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ رسالہ بے حد معاون ثابت ہوگا۔

☆ سید لطیف حسین ادیب۔ بریلی

ادراک کا شمارہ ۲ موصول ہوا تھا جملہ مضامین و منظومات ادبی وزن و وقار کے حامل ہیں۔ میں نے مقالہ 'مہدی افادی صاحب طرز نثر نگار' از ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی امروہوی کو دلچسپی سے پڑھا۔ اس موضوع پر مزید کام کی گنجائش باقی ہے۔ لوگ مہدی افادی کو بھولنے لگے ہیں۔

☆ ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی۔ امروہہ

ادراک کا شمارہ ۲ ملا۔ اپنا مضمون بھی دیکھا۔ مشمولات سب معیاری ہیں اور آپ کی تلاش و جستجو اور حسن انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ پورا رسالہ ابھی نہیں پڑھ سکا۔ پڑھنے میں وقت لگے گا۔

☆ ڈاکٹر سید شاہد اقبال۔ گیا

ادراک کا شمارہ ۲ موصول ہوا۔ اس بار آپ نے بہت محنت کی ہے۔ آپ کی محنت، آپ کا جذبہ اور حسنِ کارکردگی دیکھ کر رشک آتا ہے۔ خدا آپکو نظر بد سے بچائے۔ آمین

☆ فردوسی عظیم آبادی۔ پٹنہ سیٹی

رسالہ ادراک ملا اور میں پڑھنے کے بعد جناب کی محنت کی تعریف کرنے سے قاصر نہ رہ سکا۔ اتنا معیاری رسالہ اور اتنا خوبصورت کہ اسے ہاتھوں میں رعشہ ہونے کے باوجود میں تعریف کرنے سے قاصر نہ رہ سکا۔ بہر حال اس محنت کے لئے جناب یقیناً لائق تحسین ہیں۔

☆ کمال جعفری، آل انڈیا ریڈیو۔ کولکاتہ

آپ کا علمی و تحقیقی رسالہ 'ادراک' موصول ہوا رسالہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی مجلس مشاورت میں ڈاکٹر مختار الدین احمد

کا نام دیکھ کر میری خوشی میں اور اضافہ ہوا۔ اس شمارے میں شعری ونثری تخلیقات بہت معیاری ہیں آپ نے مختلف ذیلی عنوان کے تحت رسالے میں جو تخلیقات شائع کی ہیں وہ بہت خوب ہیں۔ میں اس کامیاب رسالہ کی اشاعت پر دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔

☆ عالم خورشید۔ پٹنہ

برادرم فیض علی فیضی کے توسط سے ادراک کا تازہ شمارہ موصول ہوا ممنون ہوں۔ اس سے قبل پہلا شمارہ بھی مطالعہ سے گزرا تھا۔

آپ جس سنجیدگی، وقار اور ذمہ داری کے ساتھ ادراک شائع کر رہے ہیں وہ یقینا قابل تحسین ہے۔ یہ آپ کی علمیت اور شخصیت کا ہی کرشمہ ہے کہ آپ کو اچھے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ تحقیقی نوعیت کے مضامین ادراک کی منفرد شناخت قائم کرتے ہیں اور مجھ جیسے کم علم کے لئے کافی جانکاریاں فراہم کرتے ہیں۔

مشمولات کا انتخاب، کمپوزنگ، طباعت یعنی ہر اعتبار سے رسالہ خوب ہے۔ اس کا حلقہ وسیع تر کیجئے اور تمام اچھے تخلیق کاروں سے رابطہ قائم کیجیے۔ ادبی گروپ ازم سے آپ الگ تھلگ ہیں اس لئے آپ کو ہر حلقے کا تعاون ملے گا۔ اس سفر میں مجھے بھی اپنے ساتھ سمجھیں۔ جلد ہی ادراک کے لئے اپنی تخلیقات بھجواؤں گا۔

☆ ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس۔ حیدرآباد

ادراک ۲ موصول ہوا۔ پرچہ آپ کی محنت، سلیقے اور حسن ترتیب کا آئینہ دار ہے۔ سارے ہی مضامین و مقالات معیاری و منتخب ہیں۔ شخصی طور پر مجھے 'کتب خانہ و کتاب شناسی' کا گوشہ بہت پسند آیا۔ اس حصے کے محتویات تحقیقی اور معلوماتی ہیں۔ شعری حصہ بھی نہایت وقیع ہے بالخصوص 'مرثیہ در بحر رباعی' معرکہ کی چیز ہے۔ غلام علی آزاد بلگرامی کے تبرکات بھی خوب و نادر ہیں۔ 'پیش نامہ' حسب حال ہے۔ رسالے کی اشاعت کے سلسلے میں آپ کی جگر کاوی کا اندازہ کر کے دل سے دعا نکلتی ہے۔ یونیورسٹی کی لائبریری کے لئے میں نے رسالے کی تجویز پیش کی ہے۔ امید ہے کہ منظور کی جائے گی۔ رسالے کا ٹائٹل مزید توجہ کا طالب ہے۔ رنگ اگر ہلکا گلابی اور نیلگوں ہو تو شاید دلکشی اور بڑھ جائے۔

☆ م۔ق۔خان۔ گیا

سب سے پہلے ادراک کے دوسرے شمارے، آپ کے خط، کہانی 'بے جواب سوال' کی اشاعت اور 'تیشۂ صدا' پر بھگوان داس اعجاز کے تبصرے کی اشاعت کے لئے ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔ ادراک ۲ کے مقالات نہ صرف طلبا اور طالبات کے لئے اہم ہیں بلکہ دوسرے قارئین بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح 'کتب خانہ اور کتاب شناسی' میں شامل تخلیقات بھی اہم ہیں۔ 'قند پارسی'، 'کاسے کاسے' میں شامل نگارشات بھی ہمارے علم و واقفیت میں اضافہ کرتی ہیں۔

'چھیڑ خوباں سے' میں دو تحریریں نہایت دلچسپ ہیں۔ افسانوں میں 'راہگذر ہی راہگذر' (مبین الدین قریشی) نہایت متاثر کن ہے اور خاص کر اس کا اختتامیہ.......''شکورا اور بدھوا مرے نہیں ہیں، شکورا اور بدھوا کبھی مرتے نہیں ہیں، تباہ ہوتے رہتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں کہ پارٹی والے، مالک لوگ اور سرکار تینوں میں فرق کیا ہے؟''

مبین الدین قریشی صاحب مبارکباد کے حقدار ہیں کہ انہوں نے ہر شہر اور قصبے میں روزانہ ظہور پذیر ہونے والے سانحات کو نہایت سلیقے اور تاثر سے پیش کیا ہے۔

☆ مشتاق احمد نوری۔ پٹنہ

ادراک ۲ اچانک یوں سامنے آیا جیسے کالے بادل سے چاند نکل آیا ہو۔ بے حد خوبصورت اور جامع۔ آپ نے بہتر مضامین کا انتخاب کیا ہے۔ دراصل جب لگن ہو تو دیر سویر کاوش رنگ لاتی ہی ہے۔ آپ بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مبین الدین قریشی کی کہانی بھی پڑھی۔ اچھی کوشش ہے۔ اس بات کا بھی اطمینان ہوا کہ وہ اس طبقے کے کرداروں کو لے رہے ہیں جسے عام لوگ دیکھ کر ان دیکھا کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں امکان ہے۔ نئے لوگوں کی پذیرائی ہونی چاہیے۔ آخر تو ہر پرانا لکھنے والا کبھی نیا بھی رہا ہوگا۔ اگر اُسے بریک نہ دیا جائے تو پھر وہ آگے کیسے بڑھے گا۔

تبصرے کا کالم بھی جاندار ہے۔ مجموعی طور پر ادراک ایک اچھی کوشش ہے اور اس سے بہتر توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ خدا کرے آپ کا سفر آسان ہو۔

☆ ہلال احمد قادری۔ پھلواری شریف

ادراک ملا۔ پسند آیا بلکہ توقع سے زیادہ بہتر ثابت ہوا۔ ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

ماشاء اللہ کتابت وطباعت بھی عمدہ ہے اور تحریریں بھی معیاری ہیں۔ میں ادب کے میدان کا آدمی نہیں، اپنی رائے کا اعتبار ہی کیا۔ لیکن ایک عرصے تک ہمارے یہاں سے 'المجیب' نکلتا رہا ہے اور اب نوجوانوں نے ہمت کر کے 'لوح وقلم' سہ ماہی کا اجرا کیا ہے۔ اس لئے شروع سے پرچے کے متعلق اپنا یہ مزاج رہا ہے کہ پرچے کو مسلکی تعصبات اور خلافیات سے پاک، سنجیدہ تحریروں سے مزین اور زبان وادب میں بلند معیار کا حامل ہونا چاہیے۔ خوشی ہوئی کہ یہ سب خوبیاں ادراک میں نظر آرہی ہیں۔ آپ کی وسعت نظری اور فکر صائب سے آئندہ بھی اسی کی توقع ہے۔

☆ ڈاکٹر شعائر اللہ خاں۔ رام پور

اس شمارہ ۲ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کا زرسالانہ ارسال خدمت ہے۔

☆ سید محمود نقوی، مدیر پندرہ روزہ حدیث دل۔ دہلی

ادراک کافی گراں قدر محسوس ہوا۔ اچھا ادبی اور تحقیقی مواد موجود ہے۔ خدا کرے اسی آہنگ ومعیار کے ساتھ شائع

ہوتا ہے۔

☆ رئیس الدین رئیسؔ۔ علی گڑھ

اوراک کا شمارہ ۲ موصول ہوا۔ شکر گزار ہوں۔ ماشاء اللہ بہت خوبصورت رسالہ آپ نے نکالا ہے۔ تمام مندرجات اہم اور خاصے کی چیز ہیں۔ جستہ جستہ پڑھ کر کچھ لکھنے کے قابل ہو سکوں گا۔ تمام قلمکار اہم و معتبر ہیں۔ تخلیقات بھی معرکہ کی ہوں گی۔ میری طرف سے دلی مبارکباد۔

☆ طالب زیدی۔ میرٹھ

آپ نے جس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے بہ خوبی نباہ رہے ہیں۔ خدا آپ کی ہمت کو اسی طرح جوان رکھے۔ آمین۔

اوراک ۲ کے تمام تر مشمولات وقیع، سنجیدہ اور منتخب ہیں۔ گزشتہ شمارے میں احمد جمال پاشا کا تحریر کردہ مضمون تھا تو اس شمارے میں ان کے خاندانی پس منظر پر ظفر کمالی صاحب کا مضمون، آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا عکاس ہے۔

☆ ناوک حمزہ پوری، شیر گھاٹی۔ گیا

آپ کا رسالہ صاف ستھرا، پاکیزہ اور خاصے کی چیز ہے۔ مضامین جو تحقیقی و تنقیدی مزاج رکھتے ہیں، بہت وقیع ہیں۔ ان سے آپ کی بالغ نظری اور حسن ترتیب کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور **اللھم زد فزد** کی دعائیں زبان پر آتی ہیں۔ پڑھے لکھے حلقے میں رسالہ یقیناً مقبول ہوگا اور عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ لیکن خالص علمی و ادبی رسالے کے پڑھنے والوں کا جو بچا کھچا حلقہ رہ گیا ہے وہ رسالہ خریدنے کا عادی نہیں ہے اور گھر جلا کر تا دیر تماشا دیکھنا سب کے بس کی بات نہیں۔ خدا کرے کہ آپ کو کوئی دستِ غیب حاصل ہو یا حاصل ہو جائے تا کہ رسالہ تا دیر زندہ رہ سکے۔ اب آپ سے لوگ جو اردو کے ساتھ فارسی ادبیات سے بھی قابل ستائش وابستگی رکھتے ہیں خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ زیادہ تر ناوک (NAVIK) ہی بولنے لکھنے والے ہیں۔

☆ اندر سنگھ ورما۔ گڑ گانو

اوراک کا شمارہ ۲ بھیجنے کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں اس کے جملہ مشمولات کا مطالعہ تو نہیں کر پایا ہوں لیکن ایک بات جو نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ مضامین اعلا معیار کے ہیں اور ادبی حیثیت کے حامل ہیں۔ شارق عدیل کی نظم کا عنوان برداشت تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا نظم کے مفہوم سے کسی طرح کا تعلق ہو، لگتا نہیں ہے۔ نادم بلخی اپنی نظم کا عنوان 'مین ایٹر' کے بجائے 'آدم خور' لکھ دیتے تو کیا فرق پڑتا؟

آپ نے گجرات کے مسلم کش فسادات کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے مجھے معلوم نہیں۔ لیکن وہ مجھ معلوم بی

دانشوروں کے لئے لمحات فکر ضرور فراہم کر گئے ہیں۔ پہلے تو سرمایہ دارانہ نظام اور سامراج کے خلاف انجمن ترقی پسند مصنفین کے ذریعے عوام کو بیدار کیا جاتا رہا تھا لیکن آج تو جمہوریت اور سیکولرزم کے تحفظ کے لئے مصنفین کی کوئی انجمن ہی نہیں ہے جبکہ فسطائی طاقتوں نے مذہبی اقلیتوں کے ساتھ ساتھ سیکولر ذہن رکھنے والوں پر جارحانہ حملے شروع کر دیے ہیں۔

☆ پروفیسر صدیق مجیبی۔ رانچی

کئی دنوں پہلے ادراک کا دوسرا شمارہ موصول ہوا تھا۔ نقش اول میں کیا تھا کیسا تھا، زیر نظر شمارے نے تجسس بڑھا دیا۔ پرچے میں فہرست کے ذیل میں جن موضوعات پر تخلیقات شامل ہیں وہ رسالے کو یقیناً دوسرے ادبی رسالوں سے الگ اور منفرد بناتی ہیں بیشتر مقالات تحقیقی نوعیت کے ہیں اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔

کتب خانے، کتاب شناسی اور ایسے مخطوطات جو مختلف خانقاہوں میں دست بُردِ زمانہ سے ہنوز محفوظ رہ گئے ہیں ان سے متعلق مضامین اور ان کی اشاعت کی کوشش وقت کی اہم ضرورت ہے جس کی طرف آپ نے بروقت دھیان دیا اور دلوایا ہے۔ فارسی اگرچہ اکثر یونیورسیٹوں کے نصاب میں شامل ہے مگر عوام وخواص میں اس کی حیثیت سنسکرت سے زیادہ بے توجہی کی شکار ہے لیکن 'قندِ پارسی' کے پرستار اب بھی نایاب نہیں۔

مکتوبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے کم وبیش تمام اہل قلم اور اہل نظر کی توجہ آپ نے اپنی طرف مبذول کرلی ہے جو پرچے کے مستقبل کی ضامن ہی کہی جاسکتی ہے۔

کلاسیکی ادب کی بازیافت اور لائق مطالعہ گمنام ادیب وشاعر کی تخلیقات کو منظر عام پر لانے کا پرخطر اور حوصلہ مند ذوق، بڑے دل گردے کا کام ہے اور اس کے لئے یقیناً لائق ستائش ہیں۔

رسالہ ہنوز زیر مطالعہ ہے مشمولات سے متعلق جلد اپنی رائے سے مطلع کروں گا مجھے یقین ہے کہ ادراک قدرے دیر سے ہی اہل ذوق ونظر کا ایک وسیع حلقہ بنانے میں یقیناً کامیاب ہوگا۔

☆ ظہیر غازی پوری۔ ہزاری باغ

آپ کے خط کے ہمراہ ادراک شمارہ نمبر ۲ دستیاب ہوا۔ شکریہ۔ سرورق تا آخری صفحہ رسالہ دیدہ زیب اور تبحر علمی کے غماز ہیں، معلوماتی ہیں اور کسی نہ کسی لحاظ سے افادی اور توجہ طلب ہیں۔ سچ پوچھیے تو ادراک کی اپنی ایک دنیا ہے اور پروقار شناخت ہے اس کی دستاویزی حیثیت سے شاید ہی کوئی سنجیدہ تخلیق کار انکار کر سکے۔ آپ کے تحریر کردہ تبصروں نے بطور خاص متاثر کیا۔ میری دعا ہے کہ رسالہ شان سے نکلے، زندہ رہے اور ادب وزبان کی گراں قدر خدمات انجام دے۔

☆ ڈاکٹر پریتم سینی۔ سنگرور

ادراک کا دوسرا شمارہ ملا اور آپ کا خط بھی ایسے جریدے کی اردو ادب کے سنجیدہ قارئین کے لئے اشد ضرورت تھی۔ آپ نے اس ضرورت کو بروقت پورا کیا ہے۔ شمارہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ مبارکباد قبول فرمایئے۔ عربی و فارسی ادب اور اسلامیات کے بارے میں لکھنے والوں کے لئے بھی آپ نے ادراک کے در کھول دیے ہیں یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی ہے اس لئے آپ کو داد دیتا ہوں۔

☆ ڈاکٹر سید شمیم احمد یاروی۔ دربھنگا

ماشاء اللہ ادراک ۲ خوبصورت اور معیاری ہے۔ عنوانات و پیشکش منفرد ہے۔ مقالے انتہائی معلوماتی ہیں۔ سید حیات حسین کی دونوں نظمیں متاثر کر گئیں۔ مبین الدین قریشی کا افسانہ 'راہگذر ہی راہگذر' حالات حاضرہ کا عکس جمیل ہے۔ غزلوں کا انتخاب بہت عمدہ ہے۔ طباعت بھی اعلا ہے۔ سرورق کی سادگی متاثر کرتی ہے۔

بہر حال ایک عمدہ اور معیاری پرچہ کی اشاعت پر پُر خلوص مبارکباد قبول فرمایئے۔ اللہ کرے ادراک طویل عمری تک پہنچے۔

☆ ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی۔ علی گڑھ

ادراک کا دوسرا شمارہ جستہ جستہ پڑھا۔ پہلا شمارہ بھی خوب تھا اور ماشاء اللہ دوسرا شمارہ بے شبہ خوب تر کی مثال ہے جو آپ کے مدیرانہ سلیقے پر ایک موثق دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے کہ تادیر علمی و ادبی اور تحقیقی خدمات میں مشغول رہ کر علمی دنیا کے ذخائر میں اضافہ کرتے رہیں۔ آمین

☆ ڈاکٹر رضوان اللہ آروی۔ موتی ہاری

ادراک ۲ دیکھا تو قاضی عبدالودود کی یاد تازہ ہو گئی۔ کاش! قاضی صاحب حیات ہوتے تو وہ آپ کی اس محققانہ کاوش کی داد ضرور دیتے۔ داد نہ بھی دیتے تو کم از کم انہیں یہ اطمینان ضرور ہوتا کہ انھوں نے بہار میں جس تحقیقی روایت کی داغ بیل ڈالی ہے وہ 'ادراک' کی شکل میں محفوظ اور زندہ رہے گی۔ دورِ حاضر میں 'شاعری و افسانہ' سے باہر نکل کر اور ایک سنجیدہ اور خالص تحقیقی پرچے کی بنیاد رکھ کر آپ نے — دیوانگی کی حد تک — جراتمندی کا ثبوت دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ اس نوعیت کے ایک پرچے کی کمی تھی جسے آپ نے پورا کیا ہے تاہم آپ کا یہ عمل ایک بنجر اور پُر شور زمین میں شجر لگانے کے مترادف ہے لیکن مایوسی کفر ہے۔ لہٰذا یہ دعا ضرور کروں گا کہ خدا کرے یہ برگ و بار لائے۔

رسالے کے مشمولات سے اندازہ ہوا کہ آپ کا انتخاب معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ سخت بھی ہے خاص طور پر مقالات کا حصہ، جس سے پرچہ کے مزاج و منہاج کا تعین ہوتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ظفر کمالی جیسے شاعر سے بھی آپ نے تحقیقی

مزاج ہی کا مضمون لکھوالیا*۔ 'احمد جمال پاشا کا خاندانی پس منظر' اور 'بیکس سیوانی' پر ظفر کمالی کے مقالات First hand information ہونے کے سبب بے حد اہمیت کے حامل ہیں خاص کر بیکس اور پاشا پر ریسرچ کرنے والوں کے لئے کمالی کے یہ مقالات، مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔ مقالات کے علاوہ کمالی نے اپنی نظم 'مشاعرہ' میں آج کی زوال پذیر ادبی صورت حال پر جو شدید طنز کیا ہے، وہ بھی قابل توجہ ہے۔ کالی داس گپتا رضا نے اپنی تلاش وجستجو سے 'دلگیریات' میں اضافہ کر دیا ہے۔ امام مرتضی نقوی نے 'مہدی افادی' پر بھر پور مقالہ سپرد قلم کیا ہے جو اُن کی عبقری شخصیت کے عین مطابق ہے۔ ڈاکٹر سید شاہد اقبال نئی نسل کے نمائندہ محققوں میں ہیں۔ مولانا فضل حسین مظفر پوری پر ان کا مقالہ معلومات افزا ہے۔ 'کتب خانہ اور کتاب شناسی' کے تحت جناب ہلال احمد قادری نے کتب خانہ مجیبیہ بدریہ پھلواری شریف کے چند اہم نوادرات کا تعارف کرایا ہے۔ مجھے اس کتب خانے کی زیارت کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس کی وسعت اور جامعیت کو دیکھتے ہوئے یہ مقالہ تشنہ لگتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ایک مختصر مقالے میں اس کتب خانے کا تفصیلی تعارف ممکن بھی نہیں۔ سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے۔

پروفیسر سید امیر حسن عابدی ہمیشہ دفینوں کی بازیافت کرتے رہتے ہیں۔ 'خیال فلاح' کا تعارف اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ برسوں قبل 'بہار میں گلدستہ نگاری' پر میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں کنور سکھ راج بہادر رحمتی کے ہاں منعقد ہونے والے طرحی مشاعروں اور گلدستوں کا ذکر کیا گیا تھا لیکن مجھے پتا بھی نہیں تھا کہ مدرسہ سلیمانیہ میں اس کا اتنا اہم نسخہ موجود ہے حالانکہ میں ۱۲ برسوں تک پٹنہ میں رہ چکا ہوں۔ حیف میری لاعلمی پر۔ اور یہ عبدالحق انجم کون ہیں؟ انجم کے بارے میں مزید چھان بین کرنے کی ضرورت ہے۔

ادبی موضوعات میں 'جگر صاحب سے ملاقات' ایک دلچسپ مضمون ہے جس سے جگر کے مزاج کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ افسانوی حصہ بھی قابل توجہ ہے خاص طور پر 'بے' ۔'اب سوال' شکستہ قدروں کا افسوسناک اعلامیہ ہے البتہ فاروق راہب کا 'شکستیدہ' رمزیت اور اشاریت کے خاردار تاروں میں الجھا ہوا افسانہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب تک وہ ''شب خونی'' اثر سے باہر نہیں نکل پائے ہیں۔ شعری حصے پر مزید توجہ کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ اس میں نئی نسل کی نمائندگی ذرا کم نظر آئی۔ ایک تجویز:

قند پارسی کے تحت آپ جس شاعر کا کلام شائع کریں اس کا ایک مختصر تعارف بھی دے دیں تو شاید اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگا۔

☆ نقی احمد ارشاد۔ پٹنہ

جناب سید حسن عباس صاحب رسالہ کے مدیر کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ نہایت سلیقہ سے ایسا اچھا پرچہ انھوں

نے سرزمین بہار سے شائع کیا ہے کہ ادبی رسالہ کے بدلے یہ تحقیقی کتاب معلوم ہوتا ہے۔

☆ پروفیسر فاروق احمد صدیقی۔ مظفرپور

ادراک کا تازہ شمارہ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے توسط سے ملا۔ اس کے تمام مضامین و مشتملات قابل مطالعہ اور معلومات افزا ہیں۔ ڈاکٹر ظفر کمالی نے بیکس سیوانی جیسے قلندر صفت شاعر کو روشناس خلق کر کے قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ موصوف کی نظم 'متشاعر' سے بھی بے حد محظوظ ہوا کہ اس میں اپنے بعض قریبی احباب کی تصویریں نظر آئیں جو مانگے کے اجالے کی بدولت صاحب مجموعہ بن گئے ہیں اور بہ حیثیت شاعر، مشاعروں اور ریڈیو پروگراموں سے اچھی خاصی آمدنی کر لیتے ہیں۔ تازہ شمارہ میں غزلوں کا انتخاب بھی اچھا ہے۔

---

* ڈاکٹر ظفر کمالی کی حیثیت 'ہمہ داں' کی ہے اور یہ خوبی بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ ہمہ دانی ان کی زبردست محنت اور ذوق مطالعہ کی دین ہے۔ وہ نوجوان محققین میں سرفہرست شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔ وہ شاعر بھی بہت اچھے ہیں خاص کر رواتی مرحوم کے بعد طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کو اس نوجوان شاعر نے جس طرح سنبھالا دیا ہے اس سے بھی ان کی فکری صلابت اور جودت طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ (ادراک)

□

درج ذیل مضامین ادراک۱۲ میں ملاحظہ فرمایئے

- ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی کے خطوط پروفیسر نذیر احمد کے نام
- آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ کا تاج شاہی — ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی
- جھارکھنڈ کے چیرو قبائل — پروفیسر نادم بلخی
- انشائیہ کا فن — احمد جمال پاشا
- احوال پاشا (احمد جمال پاشا کی سوانح) — ڈاکٹر ظفر کمالی
- فرہنگ قواس۔ ترتیب و تصحیح کا اعلیٰ نمونہ — پروفیسر شریف حسین قاسمی
- فارسی و اردو ادب پھلواری شریف میں — ہلال احمد قادری
- علامہ اقبال کی ایک نظم نما غزل — ظہیر غازی پوری
- آ گیا بزم عزا میں مدح خوان کربلا (قمر سہرامی کا تذکرہ) — تمنا مظفر پوری
- جواب آں غزل (آنجہانی کالیداس گپتا رضا کے غالب پر ایک مضمون کا جواب) — محمد عالم مختار حق
- ڈاکٹر ذاکر حسین کی مکتوب نگاری — ڈاکٹر محمد ذاکر حسین
- زبدۃ الاخیار فی سوانح الاسفار [محیط ثالث] کا نادر مخطوطہ — سید حسن عباس
- کوثر سیوانی۔ احوال و انتخاب کلام — ڈاکٹر ظفر کمالی
- مجتبیٰ حسین کی مزاحیہ خاکہ نگاری — حسن مثنیٰ
- حیات مبارک عظیم آبادی — ابوالخیر تجیر رحمانی

ان کے علاوہ "چھیڑ خوباں سے" کے تحت ظفر کمالی کی طویل طنزیہ مزاحیہ نظم "عرب کی کمائی" بھی شامل اشاعت ہوگی۔

GOPALPUR

An Urdu Journal of Literary & Research Value

GOPALPUR, BAKARGANJ, SIWAN - 841286

BIHAR (INDIA)

Editor: S. H. Abbas

احمد جمال پاشا نمبر

اردو طنز و مزاح کے
صاحب طرز فنکار احمد جمال پاشا
مرحوم پر ادراک گوپال پور کی ایک
مثالی پیش کش عنقریب منظر عام پر آنے والی
ہے۔ اہلِ قلم حضرات پاشا صاحب مرحوم سے متعلق
اپنی یادداشتیں اور مضامین ارسال کر کے
اس خاص اشاعت کو مثالی اور یادگار بنانے
میں ہمارے ساتھ تعاون
فرمائیں۔

رابطہ : مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور، باقر گنج، سیوان ـ ۸۴۱۲۸۶، بہار (ہند)